اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ

علمی، دینی، اصلاحی اور معلوماتی

اللطیف

ویلور

دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللطیف ویلور

سالنامہ ۱۴۲۳ھ 2002ء

۴۱ واں شمارہ

بیادگار

شیخ المشائخ اعلیحضرت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری

رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین، مکانِ حضرت قطبؒ، ویلور

مولانا مولوی ابو صالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر قادری المعروف میراں پاشاہ

رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مؤسس

حضرت اقدس مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اجراء: ۱۰ر شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ مطابق 17 اکتوبر 2002ء بروز جمعرات

★ زیرِ نگرانی :

مولانا مولوی ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ محمد عثمان قادری ایم اے، پی ایچ ڈی، بی کام (عثمانیہ)
ادیب فاضل (مدراس) ناظم دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری شطاری ادیب فاضل (مدراس) نائب ناظم
دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

★ زیرِ ادارت :

مولانا مولوی پی محمد ابوبکر ملیباری لطیفی قادری۔ مدرس۔ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

مولانا مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی ایم اے، مدرس دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

★ نمائندگانِ طلباء

۱	سید خلیل احمد قادری	جنرل مانیٹر	کرناٹک
۲	ایم۔ اے۔ محمد حنیف	سکریٹری	ویلور
۳	مولوی حافظ عبد السلام		ویلور
۴	مولوی سید مشتاق پیر قادری		میسور
۵	مولوی ایم محمد خالد		ویلور
۶	حافظ نور خان		ترناٹک
۷	محمد رفیع سرواری		کرناٹک
۸	مولوی کے۔ زبیر		کیرلہ
۹	مولوی سی مصطفےٰ ملیباری		ملاپرم کیرلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین سالنامۂ اللطیف ویلور سنہ ۱۴۲۳ھ م سنہ 2002ء

رُباعیات

حضرت امجد حیدرآبادی

قرآنِ کریم میں کرامت دیکھی
ہر جزو کے ساتھ کُل کی شرکت دیکھی
ہر منزل کو اُسی کی منزل پایا
ہر سورۃ میں خدا کی صورت دیکھی

اب جلوۂ غیر حق ہے ہر پہلو پر
ہے دار و مدارِ زندگی میں تو پر
کہہ لیجئے آغاز میں میں ہوں تو ہے
ہے خاتمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہو پر

شمشیرِ محبت پہ گلا رہنے دے
ہاں جان کے ساتھ یہ بلا رہنے دے
امجدؔ شبِ ہجر میں نہ کر بند آنکھیں
وہ آئے گا۔ دروازہ کھلا رہنے دے

ہر رات مرا ماہِ جبین آتا ہے
گھر میں مرے وہ عرش نشین آتا ہے
وہ راحت جان اگرچہ میری خاطر
آتا ہے۔ گرفت میں نہیں آتا ہے

رُباعیات

حضرت سرمد شہید علیہ الرحمۃ

در بادیہ تجربہ، یارب ہمہ جا
افتاد سروکار بہ زشت و زیبا
غیر از تو کسے نہ گشت فریاد رسم
دیدم ہمہ را و آزمودم ہمہ را

میدان میں تجربہ کے اے بارِ خدا
ہر اچھے بُرے سے کام اپنا اٹکا
کب تیرے سوا سُنی کسی نے فریاد
ہر ایک کو میں نے خوب دیکھا بھالا

اے جلوہ گر نہاں عیاں شو بد را
در فکر بجستیم کہ ہستی تو کجا
خواہم کہ در آغوش کنارت گیرم
تا چند تو در پردہ نمائی خود را

اے پردہ نشیں جلوہ دکھا سامنے آ
ہے فکر یہی ملے کہاں تیرا پتا
جی میں ہے کہ سینے سے لگاؤں تجھ کو
پردہ میں یہ خود نمائیاں تا بکجا



مناجاتِ قربی

قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین شیخ المشائخ حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ ابوالحسن قربیؔ قادری علیہ الرحمہ

الٰہی بھکاری ہوں تجھ دار کا
گھر آیا ترے در پو بے بار کا

محمدؐ کا صدقہ مجے کر عطا
نہ محروم کر مجھ کرم سوں اتا

کریماں منگے بن دلاتے ہیں بھیک
طلب سوں زیادہ لجاتے ہیں بھیک

ہیں تیرے کرم کے اُپر دھر نظر
محمدؐ کا صدقہ منگیا عرض کر

کرم پر تیرے بھیک لازم کیا
میری بھیک توں بیگ بھی کر دیا

نبیؐ کی محبت سوں تن میں رکھیا
ہیں صدقہ ترے پاس اس کا منگیا

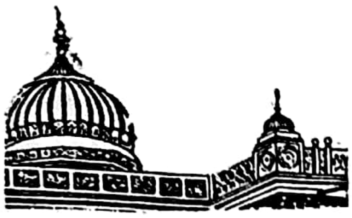
منگیا ہوں ہیں صدقہ ترے دوست کا
یو منگنے پو میرے ہوا ہے سکا

یہاں میرے اوپر مقرر ہوا
کہ تیرا عطا مجھ میسر ہوا

محبّت کی شمشیر دے دھات میں
سپر معرفت کا دے اس سات میں

بھی سنّت کی جمدھر کمر میں لگا
کہ اس دشمناں کو کروں میں فنا

پیشکش: حضرت مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری شطاری المعروف بہ ہلال پاشاہ؛ نائب ناظم دار العلوم لطیفیہ



افتتاحیہ

ادارہ

اسلام اور مسلمانوں کو تاریخ کے ہر دور میں مختلف و متعدد اور نت نئے فتنوں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور آج بھی ایسے ایسے فتنوں سے سابقہ ہے کہ ان کی گہرائی و گیرائی تک پہنچنا ایک مشکل ترین مرحلہ ہے۔ کیوں کہ یہ فتنے کبھی علم و فن اور تحقیق و تدقیق کے جلو میں رونما ہو رہے ہیں تو کبھی حق و انصاف، قانون و انسانیت اور امن کے نام پر ابل رہے ہیں اور اسلام دشمن عناصر بڑی ہوشیاری اور عیاری کے ساتھ مغالطہ آمیز پیرایہ میں آیاتِ قرآنی ہی کے ذریعہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اسلام اپنے متبعین کو غیر مسلموں سے جنگ و جدال کی ترغیب و تحریص دلاتا ہے۔ اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ ربط و ضبط اور دوستی رکھنے سے منع کرتا ہے اور غیر مسلموں کو دشمن اور تشدد کو جائز قرار دیتا ہے اس طرح سے یہ فتنہ انگیز مہم اور ہلاکت خیز تحریک جدید ترین ذرائع ابلاغ کے ذریعہ چلائی جا رہی ہے۔ حال ہی میں لندن کے ایک اخبار "ٹائمس" نے اسلام سے متعلق اپنے مضمون کا عنوان یہ قائم کیا ہے: "A RELIGION THAT SANCTIONS VIOLENCE" اور ہمارے جمہوری اور غیر مذہبی آئین والے ملک ہندوستان میں بھی پریس اور میڈیا کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق عجیب و غریب خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مثلاً قرآن کریم کے بعض اصطلاحات کا مفہوم بدل دینا ہوگا۔ جن سے امن میں خلل اور تشدد کو فروغ مل سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ خیالات اسلام اور مسلمانوں کے حق میں انتہائی خطرناک ہیں۔ اگر ان کا ازالہ علمی سطح اور اخلاقی حیثیت سے نہ کیا گیا تو حالات میں بڑا بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر قرآنِ کریم کی چند آیات سے متعلق اظہارِ خیال فائدے سے خالی نہیں ہے۔ جن کو جنگ و جدال اور فتنہ و فساد اور غیر مسلموں کے ساتھ دشمنی کے جواز اور ثبوت میں بطور سند پیش کیا جا رہا ہے۔ مثلاً

قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم و یخزھم ۵ (التوبہ)

ان سے تم جنگ کرو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں عذاب دے گا۔ انھیں ذلیل و رسوا کرے گا۔

یاایھا الذین اٰمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ ۵ (التوبہ)

اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہیے۔

ان الکافرین کانوا لکم عدوا مبینا ۵ (النساء)

کفار تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

اینما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتیلا۔ (الاحزاب)

جہاں بھی مل جائیں پکڑے جائیں اور ٹکڑے کر دیے جائیں۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ ہ (المائدہ)

اے ایمان والو! تم یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

مذکورہ تمام آیات کا ایک مستقل سیاق وسباق ہے اوران کے نزول کے مخصوص اسباب ہیں اوران کا خاص پس منظر ہے جن کو سامنے رکھے بغیر مطالعہ کیا جائے تو اسلام سے ناآشنا شخص کے ذہن میں اسلام کی ایک دوسری تصویر ہی اُبھرے گی جو اسلام کی اصلی تصویر سے مختلف اور متضاد ہوگی۔ لہٰذا ان آیات کی معانی اور مطالب کو کماحقہٗ سمجھنے سے پہلے چند باتیں ذہن نشین کرلینی چاہیے۔ وہ یہ ہیں؛ کہ قرآنِ کریم کسی انسان کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ بلکہ وہ انسانوں کے خالق ومالک کی نازل کردہ کتاب ہے۔ جس میں انسان کی فلاح وبہبودی اور نجات کا پورا پورا سامان موجود ہے۔ بھلے سے انسان اس کے احکام وہدایات کو قبول نہ کرے۔ اوراس کتاب کا تعلق کسی ایک مخصوص علاقہ اور کسی ایک مخصوص زمانہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ہر زمانہ اور ہر علاقہ کی رعایت، ضرورت، مصلحت اور افادیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تاکہ رہتی دنیا تک مختلف حالات میں انسان روشنی حاصل کرسکتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے حالات میں برابری وہمواری اور یکسانیت ہمیشہ نہیں رہتی۔ حالات کی تبدیلی اوران کی رعایت وضرورت کے ساتھ احکام کی تبدیلی بھی ایک ناگزیر صورت ہوا کرتی ہے۔ مسیح علیہ السلام جیسے فرشتۂ امن کو بھی حالات کے پیشِ نظر جنگ کی بات کرنی پڑی تھی I do not Come to bring Peace but a Sword (New Testment) اگر کوئی شخص مسیح علیہ السلام کی سیرت اوران کے قول کے پس منظر کو سامنے رکھے بغیر یہ کہہ دے کہ بائبل امن مخالف کتاب ہے تو اس کے اس تجزیہ اور نظریہ کو صحیح قرار دیا جاسکتا ہے۔

قرآن کریم کی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ ۶۶۶۶ آیتیں مکۃ المکرمہ اور مدینہ منورہ کے تیئیس ۲۳ سالہ دور میں اتریں۔ ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ کے حالات اور مدینۂ منورہ کے حالات جداگانہ تھے اور ہر جگہ کی ضروریات وتقاضے، مسائل ووسائل بطور مصالح وحِکَم بھی الگ الگ تھے۔ اسی لیے ان آیات کے اندر امن وصلح اور دوستی کا پہلو بھی ہے اور جنگ وجدال اور دشمنی وترک تعلق کی بات ہے اور یہ فطری معاملہ ہے کہ جنگ وجدال، دشمنی وعداوت اور غداری ومعاہدہ شکنی کی فضا میں دوستی کا تصوّر مشکل ہے اور امن وسلامتی اور بھائی چارگی کی فضا میں دشمنی کی بات مشکل ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ جنگ وجدال کا موقف تو ایک وقتی اور عارضی ہوا کرتا ہے اوراس کو بادل ناخواستہ ناگزیر حالات اور وجوہات کی بناء پر اختیار کیا جاتا ہے۔ امن کی حالت دائمی بھی ہوتی ہے اور وہ مطلوب بھی رہتی ہے۔ اسی لیے اس کو ہر صورت میں بادلِ خواستہ برقرار رکھنے کی جدوجہد کی جاتی ہے۔

مکّی دَور میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر محض اسلام کی وجہ سے ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے گئے۔ لیکن آپ نے ہر حال میں جنگ سے پہلو تہی کیا اور جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو مسلمانوں کو ترکِ وطن کا حکم دیا۔ چناں چہ ۵ سنہ نبوت میں مہاجرین کا قافلہ حبشہ کی جانب روانہ ہو گیا جس میں رسول کریم کی صاحب زادی سیّدہ رقیہ رضی اللہ عنہا اور آپ کے داماد حضرت عثمان بن عفانؓ بھی تھے۔

مسلمانوں کے تعاقب میں مکّہ کے لوگ حبش بھی پہنچ گئے اور وہاں کے حکمران نجاشی کی خدمت میں بیش قیمت تحفے تحائف پیش کیا اور عرض کیا کہ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دیجئے جو ہمارے ملک سے بھاگ کر آپ کے پاس آگئے ہیں۔

اس موقعہ پر حضرت جعفر نے ایوانِ حکومت میں یہ تقریر کی :

"اے بادشاہ! ہم جہالت میں مبتلا تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ بے ہودہ بکا کرتے تھے۔ ہم میں انسانیت کا نشان نہ تھا۔ ہمسایہ کی رعایت نہ تھی۔ کوئی قاعدہ و قانون نہ تھا۔ ایسی حالت میں خدا نے ہم میں سے ایک بزرگ کو مبعوث کیا۔ جس کے حسب و نسب، سچائی و دیانت داری اور تقویٰ و پاکیزگی سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہم کو توحید کی دعوت دی۔ اس نے فرمایا کہ ہم سچ بولا کریں۔ وعدہ پورا کریں۔ رحم و کرم کریں۔ برائیوں سے بچیں۔ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، صدقہ دیں۔ ہماری قوم ہم سے ان باتوں پر بگڑ بیٹھی ہے۔ قوم نے جہاں تک ہو سکا ہم کو ستایا کہ ایک خدا کی عبادت کرنا چھوڑ دیں اور پتھر کی مورتوں کی پوجا کرنے لگ جائیں۔ ہم نے ان کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں اور اب آپ کے ملک میں پناہ لینے کے لیے آئے ہیں۔

تقریر کے بعد نجاشی کی خواہش پر حضرت جعفر نے سورۂ مریم کی تلاوت کی جسے سُن کر وہ بہت متاثر ہوا اور فرمایا : محمّد تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی۔ پھر بادشاہ نے مکہ مکرمہ سے آنے والے لوگوں کو دربار سے نکلوا دیا۔

اس واقعہ کے بعد بھی مخالفین نے حبش میں یہ مسئلہ کھڑا کر دیا کہ مسلمان یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حبش کا عیسائی حکمران اور وہاں کے عیسائی عوام مسلمانوں کے خلاف ہو جائیں اور ان کو اپنے ملک سے باہر نکال دے۔ لیکن نجاشی ایک ذی علم اور انصاف پسند عیسائی بادشاہ تھا۔ اس نے پناہ گزیں مہاجرین سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ ان حضرات نے حضرت مسیح سے متعلق اسلامی موقف کی تشریح کی جس سے وہ مطمئن ہو گیا اور مخالفین اس میدان میں بھی مات کھا گئے۔

مکّہ مکرمہ کے مسلمان تیرہ ۱۳ سال تک کافروں کے ظلم وستم سہتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا پیارا وطن ان کے لیے آگ کا پہاڑ بن گیا۔ مکّی دور کے آخری ایام میں یثرب (مدینۂ منورہ) کے مسلمانوں کو یہ اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ کے لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر ظلم کر رہے ہیں تو انھوں نے خدمتِ نبویؐ میں پہنچ کر عرض کیا کہ آپ ہمیں ان ظالموں سے لڑنے کی اجازت دیجیے! مگر آپ نے اپنے حامیوں کو لڑنے سے منع کر دیا۔ اصبروا فانی لم اومر بالقتال : صبر سے کام لو مجھے لڑائی کا حکم نہیں دیا

گیا۔ اس کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کے مسلمانوں کو مدینۂ منورہ چلے جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی رختِ سفر باندھا اور ۱۶ ستمبر ۶۲۲؁ء کو مدینۂ منورہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ مکہ مکرمہ کے لوگوں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور ایمان والوں کے ساتھ اس قدر عداوت تھی کہ ان حضرات کرام کے وطن چھوڑ کر تین سو میل دور چلے جانے کے بعد بھی ان کی دشمنی کی آگ سرد نہیں ہوی اور مدینۂ منورہ پر حملہ کا منصوبہ بنالیا اور اس شہر کے باشندوں اور مختلف قبیلوں کو مسلمانوں کے خلاف ورغلایا اور ان کو دھمکیاں دیں کہ اگر محمدؐ اور اُن کے اصحاب کو شہر سے باہر نہیں کیا تو تم لوگ ایک خوفناک اور تباہ کن جنگ کے لیے تیار رہو۔ اب ایسی صورت آکھڑی ہو گئی کہ مسلمان اس وقت بھی صبر اور اعراض کی روش پر قائم رہ جاتے تو ان کی جان و مال اور عزت و آبرو سب کچھ ختم ہو جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں نے مدافعانہ اقدام کیا اور یہ ایسا ہی قدم تھا جس کو آج کی دُنیا "حفاظتِ خود اختیاری" کے عنوان سے جائز قرار دیتی ہے۔ اور اس کے جواز کا ثبوت قانون "تعزیراتِ ہند" سے بھی ملتا ہے۔ مسلمانوں نے یہ جنگ جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ لڑی تھی۔ جیسا کہ قرآن کریم کی اس صراحت سے اچھی طرح معلوم ہو رہا ہے: اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا۔ الایۃ

جن مسلمانوں سے کفار جنگ کر رہے ہیں انھیں بھی مقابلہ کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور انھیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس مدافعانہ جنگ کا مقصد صرف مظلومیت کا خاتمہ تھا۔ اگر مظلومین کی مدد اور ان کی دادرسی نہ کی جائے تو پھر دُنیا میں زور آور کمزور لوگوں کو جینے ہی نہ دیں۔ جس سے ساری زمین فساد سے بھر جائے۔

اس حکم سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اسلام امن پسند غیر مسلموں سے لڑنے کا حکم نہیں دیتا ہے بلکہ ان ہی غیر مسلموں سے لڑنے کا حکم دیا ہے جو مسلمانوں پر ظلم و ستم کرتے ہوں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو اور بھی احکام دیے گئے ہیں جن کا یہاں ایک سرسری جائزہ فائدہ سے خالی نہیں۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔ ان اللہ لا یحب المعتدین ۝ (البقرۃ)

اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو یعنی ان کے ظلم کو روکتے ہیں کہیں تم ایسا قدم نہ اٹھاؤ کہ تم ان پر ظلم کر بیٹھو اور انصاف کی حد سے باہر چلے جاؤ۔

اور ہر حال میں عدل و انصاف کا دامن تھامے رہو۔ یہی اخلاق و شرافت اور انسانیت ہے۔ اعدلوا ھو اقرب للتقوی ۝ (المائدہ)

اور جب تک وہ تمہارے ساتھ امن کے ساتھ رہیں، تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو: فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ۝ (التوبہ)

اور جہاں تک ہو سکے برائی کا بدلہ نیکی سے دو۔ ادفع بالتی ھی احسن ۝ (حٰم السجدہ)

اور زمین پر فتنہ و فساد بر پھیلاو: ولا تفسدوا فی الارض ہ (البقرۃ)

اور بُرائی کا بدلہ اسی جیسی بُرائی ہے اور جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے اس کا اجر اللہ کے ذمّہ ہے۔ اور ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظٰلمین ہ (الشوریٰ)

اور جو شخص صبر اور اعراض اور عفو و درگزر سے کام لے تو یہ بڑی ہمت اور حوصلہ کا کام ہے۔

ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور ہ

اور جب بھی کوئی نزاع اور جدال کی فضا پیدا ہو جائے تو حق و انصاف سے کام لو اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو جس میں کسی کی طرف داری نہ ہو: وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ہ (المائدہ)

مقابلہ آرائی اور شرانگیزی کے ماحول میں بھی صلح کو ترجیح اور اہمیت دو اور یہ بہتر اقدام ہے۔

والصلح خیر ہ (النساء)

اور ناحق ایک آدمی کا قتل بھی سارے انسانوں کے قتل کے مترادف ہے۔ من قتل نفسًا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ہ (المائدہ)

لوگوں کے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ کبھی کسی کی عزت و آبرو اور جان و مال کی ہلاکت کے درپے نہ ہو جاؤ: ان دمائکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم ہ (خطبۂ حجۃ الوداع)

ظلم و جور کے خاتمہ اور عدل و انصاف کے حصول میں اگر معرکہ آرائی کی صورت پیش آجائے تو اس ہنگامی صورت حال میں بھی عورتوں، بوڑھوں، بچوں اور گوشہ نشین لوگوں پہ ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ لا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا صغیرا ولا امراۃ ولا اصحاب الصوامع ہ (ابوداؤد)

اور غیر مسلم لوگوں کے خون کو اپنے خون کی طرح اور ان کے مال کو اپنے مال کی طرح خیال رکھو: دمائھم کدمائنا واموالھم کاموالنا۔ (حدیث)

اور جن غیر مسلم افراد کے ساتھ امن معاہدہ اور دیگر معاہدے کئے جائیں تو ان کے حقوق غصب کرنے سے بچو اور ان پر ظلم و زیادتی نہ کرو: الا من ظلم معاھدا او انتقصہ فانا حجیجہ یوم القیامۃ (ابوداؤد)

اور حقوق انسانی کے باب میں سارے انسانوں کو برابر رکھو اور اس طرح کہ اپنے بیگانوں کی طرح بیگانے اپنوں کی طرح ہوں۔ اجعلوا الناس فی الحق سواء قریبھم کبعیدھم وبعیدھم کقریبھم ہ (حدیث نبوی)

اور ہمیشہ حق کا ساتھ دو۔ ظلم کا معاملہ اپنی قوم کی حمایت کرنا کھلی عصبیت ہے: العصبیۃ ان یعین الرجل قومہ علی الظلم۔

اور سارے انسانوں کو ایک خاندان کے افراد کی طرح سمجھو: الناس کلھم عیال۔

اور سارے انسان خدا کا کنبہ ہے اور لوگوں میں خدا کے نزدیک چہیتا وہی ہے جو اس کے عیال کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ان کو نفع پہنچائے۔ الخلق عیال اللہ واحب الی اللہ من احسن الی عیالہ وانفعھم لعیالہ

اور سارے انسان آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے ہیں۔ لہٰذا عاجزی وانکساری ہی آدم کی اولاد کا وصف ہونا چاہیے۔ نہ کہ تکبر وغرور اور ظلم وجور۔ الناس کلھم بنو آدم وآدم من تراب (حدیث)

اور روئے زمین پر بسنے والی مخلوق پر رحم وکرم کا معاملہ کرو تاکہ آسمان والا تمہارے اوپر رحم وکرم کرے: ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السمآء۔ (مشکوٰۃ)

اور خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے ساتھ محبت والفت، ہمدردی وخیر خواہی اور حسن سلوک ورواداری کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش فرمایا۔ چناں چہ آپؐ کا غیر مسلموں کی عیادت کے لیے تشریف لے جانے اور ان کی دعوت قبول کرنے اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے اور خوش روئی وخوش خلقی سے پیش آنے کے واقعات کثرت سے احادیث میں مذکور ہیں۔

ایک مرتبہ آپ کے سامنے سے ایک غیر مسلم کا جنازہ گزرا تو آپؐ کھڑے ہوگئے۔ یہ منظر بعض اشخاص کے لیے حیرت واستعجاب کا سبب بن گیا تو آپ نے فرمایا: ان فیہ لنفسًا۔ یہ بھی تو ایک انسان ہے۔

غرض کافروں، یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ترک تعلق اور قتال کی جو آیات ہیں وہ سب پر منطبق نہیں ہوسکتیں۔ ان کے احکام ان ہی اشخاص کے ساتھ مخصوص سمجھی جائیں گی جنھوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم کو روا رکھا اور ان کے ساتھ دشمنی ودھوکہ دہی اور عہد شکنی کے مرتکب ہوئے۔ سیاق میں جو آیات اور احادیث نقل کی گئی ہیں، وہ انسان کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت اور احترام اور ظلم کے خاتمہ اور عدل وانصاف اور امن کے قیام کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسلام ایک دین رحمت ہے۔ جس میں انسانوں کے لیے دنیاوی فلاح اور اُخروی نجات ہے اور آسمانی مذاہب میں صرف یہی ایک محفوظ دین ہے اور اس کا یہی وصف اس بات کا متقاضی ہے کہ اس دین کو سارے انسانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور خود قرآن کریم نے بھی پیغمبر اسلام سے متعلق فرمایا کہ آپ کو ساری دنیا کے انسانوں کے لیے رسول اور ہادی بناکر بھیجا گیا ہے: وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرًا ونذیرًا۔

اسی لیے قرآن کریم نے محبت والفت، افہام وتفہیم اور حکمت ونصیحت کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس کے باوجود بھی اگر لوگ اس کے سایۂ رحمت میں آنا پسند نہ کریں تو ان پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے جو چاہے اسلام قبول کرے جو چاہے رد کردے۔ لا اکراہ فی الدین ۔ فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

عہد نبوی میں نجران سے چند عیسائی علماء کسی موضوع پر گفتگو کے خیال سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آپہنچے تو مقامی یہودی علماء بھی اُن کے ساتھ ہولیے۔ اور یہ سبھی حضرات مسجدِ نبوی میں جمع ہوئے اس موقعہ پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں وفود کو مسجدِ نبوی میں مشرقی حصہ میں ان کے طریقہ پر عبادت کی اجازت دے دی۔ فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دعوھم فصلوا الی المشرق ۔

(سیرت ابن ہشام)

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس روش پر آپ کے اصحاب کرام بھی چلتے رہے۔ بیت المقدس کی فتح کے موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک گرجا گھر کے صحن میں نماز پڑھنی چاہی تو عیسائی راہب نے عرض کیا: آپ یہاں نماز ادا نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ کہیں مسلمان اس جگہ کو مقدس خیال کرتے ہوئے ہم سے اس جگہ کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں خلیفہ نے یہ بات مان لی اور اس جگہ سے ہٹ کر نماز ادا فرمائی۔ اور معاہدہ میں اس شق کا بھی اضافہ فرمادیا کہ یہاں کی زمین بدستور گرجا گھر کی تحویل میں رہے گی۔ جس پر کسی کا قبضہ نہیں ہوگا۔

رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے اسی طرزِ عمل کے باعث غیر مسلموں کے مذہبی امور و معاملات، عقائد و عبادات، رسوم وعادات اور وراثت وغیرہ جیسے امور میں اسلامی حکومتوں اور مسلمانوں کی عدم مداخلت کا سلسلہ آج تک بھی قائم ودائم ہے۔

مذہبی آزادی اور رواداری کی تعلیم اس سے زیادہ اور کہاں مل سکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں پیش آنے والے بعض خوں ریز واقعات کو اسلامی تعلیمات کا ثمرہ قرار دینا ایک غیر تحقیقی وغیر علمی اور خلاف واقعہ بات ہے۔ جسے کوئی بھی اسلام سے آشنا انصاف پسند آدمی قبول نہیں کرسکتا۔ وما علینا الا البلاغ ...

روداد دار العلوم لطیفیہ

ادارہ

علم ایک عمدہ نعمت اور سرمایۂ حیات ہے۔ ایک حکیم سے کسی نے پوچھا کہ آدمی کو کب تک علم حاصل کرنا چاہیے؟ اس کے جواب میں کہا کہ جب تک حیات مہربان ہے۔

تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہے کہ آدمی میں سوچنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے۔ بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے اور اس کو ہونا چاہیے۔ کہ ہم سے پہلے سوچنے والے جو کچھ سوچ چکے ہیں، ان کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی ہم میں بیدار ہو۔ اسی ضرورت کے لیے ہمارے نصاب میں ایسی کتابیں قصداً رکھی جاتی ہیں، جن کی عبارت نسبتاً زیادہ سلیس و واضح نہ ہوتی تھی مقصد یہی ہے کہ اس مشق کے بعد گزرے ہوئے مصنفوں کی کتاب خواہ کتنی ہی الجھی ہوئی کیوں نہ ہو ان کی پیچیدگیوں پر قابو حاصل کر کے اُن کے افکار تک بآسانی رسائی حاصل ہو سکے۔

آغازِ سالِ نو

مورخہ ۱۱ر شوال المکرم ۱۴۲۲ھ ہجری مطابق 6 ار دسمبر 2001ء روز پیر دار العلوم کا نیا تعلیمی سال شروع ہوا۔ حسب عادت اس سال بھی بیشتر علاقوں کے طلباء کا داخلہ عمل میں آیا۔

افتتاحی اجلاس

انجمن دائرۃ المعارف کا افتتاحی اجلاس مورخہ ۱۲ر ذی قعدہ ۱۴۲۲ھ مطابق 27ر جنوری 2002ء بروز اتوار، بعد نماز ظہر، دار العلوم کے عظیم الشان ہال میں، زیر صدارت مولانا ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ عثمان قادری صاحب دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان، ویلور منعقد ہوا جس میں اساتذۂ کرام و طلباء عزیز اور بیرونی مہمان موجود تھے۔ دراصل یہ اجلاس طلباء کے درمیان تحریر و تقریر کے لیے اکابرینِ حضرت مکان نے مختص کیا تھا۔ ہنوز وہ سلسلہ جاری ہے۔ صدرِ جلسہ کے ارشاد کے مطابق تلاوتِ قرآنِ کریم و نعتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ مہمان خصوصی عالی جناب مولانا مولوی شمس الدین صاحب نے طلباء سے خطاب فرمایا۔ موصوف نے علم حاصل کرنے کے فوائد اور علم دین کی فضیلت پر سیر حاصل بیان فرمایا۔ نیز عالی جناب مولانا مولوی عبد الکریم ثقافی صاحب نے بزبانِ ملیالم کیرلہ کے طلباء سے خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ درسیات کی پابندی اور مدرسہ کے قوانین و ضوابط پر عمل پیرا رہیں۔ اور خطاب و تقریر کرنے کے گُر کو طلباء کے سامنے

پیش فرمایا۔ صدر جلسہ نے آئے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا فرمائی

دورۂ حدیث کا آغاز حسبِ سابق اس سال بھی دورۂ حدیث کا آغاز ۲۴ شوال المکرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۹ جنوری 2002ء صبح کے ٹھیک ۱۱ بجے دار العلوم لطیفیہ کے وسیع ہال میں ہوا جس کی صدارت عالی جناب مولانا ڈاکٹر سید شاہ عثمان قادری صاحب ناظم دار العلوم نے فرمائی۔ اور اساتذۂ کرام نے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا آغاز فرمایا۔ یہ مبارک و مسعود محفل حضرت ناظم صاحب کی دعاؤں کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

اسبابِ صحت روزانہ شام کے وقت تعلیم سے فارغ ہوکر طلبائے عزیز دماغی فرحت و جسمانی راحت کے لیے مختلف قسم کے گیمس کھیلتے ہیں۔

نوید مسرت مدراس یونیورسٹی کے امتحانات کے ڈگری کورس میں اکثر طلباء نے شرکت کی اور انھیں نمایاں کامیابی حاصل ہوی۔ الحمد للہ!۔

امتحانات اس سال بھی طلبائے عزیز نے ششماہی امتحانات مورخہ ۲ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۳ جون ۲۰۰۲ء، لکھا یہ امتحانات ہفتہ بھر اساتذہ کی نگرانی ہوتے رہے اور سالانہ امتحان ۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ مطابق 5 اکتوبر 2002ء کو شروع ہوا اور ہفتہ بھر جاری رہا۔

عبا پوشی و اعطائے اسناد دار العلوم کا سالانہ جلسہ مورخہ ۱۰ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۷ اکتوبر 2002ء بروز جمعرات شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ عثمان قادری صاحب مدظلہ نے فرمائی اور خود اپنے دست بابرکت سے فارغین کو عبا اور اسناد عطا فرمایا۔
نیز اس اجلاس میں مقامی و بیرونی علمائے کرام اور حکمائے عظام اور مقتدر علم دوست حضرات کثیر تعداد میں شریک رہے۔

تقسیم انعامات اسی دن شام میں ایک دوسری نشست ہوی جس میں درسیات و مقالہ نویسی اور مقابلہ تحریر و تقریر اور گیمس و اسپورٹس میں اول و دوم آنے والے طلباء و عہدیداروں کو ان کی خدمات کے صلہ میں قیمتی انعامات سے نوازا گیا۔

ہدیۂ تشکر ادارہ ان تمام حکیموں اور ڈاکٹروں کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے طلباء و اساتذۂ کرام کی صحت کا بھرپور خیال فرمایا۔ نیز ادارہ ان تمام مدیرانِ اخبار کا تہہ دل سے مشکور ہے جنھوں نے دار العلوم کی تمام کارروائیوں کو بروقت شائع فرمایا۔ بالخصوص ادارہ جناب کاتب محمد شریف برکاتی آمبور اور عالی جناب سید علیم الدین علیم صبا نویدی صاحب مدراس کا بے حد ممنون و مشکور ہے، جنھوں نے "سالنامۂ اللطیف" کی کتابت و طباعت کا کام بڑے خلوص و حسنِ خوبی کے ساتھ انجام دیا۔
اللہ ان سب کو جزائے خیر و سعادتِ دارین نصیب فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔ ...



جواھرُ القرآن

مولوی حافظ ابوالنعمان بشیرالحق ایم اے، مدرس دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان۔ ویلور

وجوہ یومئذ ناظرۃ الی ربھا ناظرہ

اسلام کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالٰے اہلِ ایمان کے سامنے جلوہ نما ہوگا اور سب اپنی نگاہوں سے ربِّ تعالٰے کو دیکھ لیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے: وجوہ یومئذ ناظرۃ الی ربھا ناظرہ: [القیامۃ]۔ کچھ تروتازہ چہرے اس دن اپنے رب کی جانب دیکھ رہے ہوں گے۔

اس موضوع پر احادیث بھی ملتی ہیں۔ ترمذی کی روایت ہے: ستورون ربکم یوم القیامۃ کما ترون القمر لیلۃ البدر: تم اپنے رب کو قیامت کے دن دیکھ لوگے جیساکہ چودہویں رات کے چاند کو دیکھ رہے ہو۔

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں: کما ترون ھذا القمر لا تضامون فی رویتہ: جس طرح اس چاند کے دیدار میں تمہیں مزاحمت نہیں ہورہی ہے اسی طرح قیامت کو اپنے رب کو بھی دیکھ لوگے۔

ترمذی کی حدیث ہے: قال اذا دخل اھل الجنۃ نادی منادی ان لکم عند اللہ موعدا قالوا الم یبیض وجوھنا و ینجنا من النار و یدخلنا الجنۃ قالوا بلی فیکشف الحجاب قال فواللہ ما اعطاھم شیئاً احب الیھم من النظر الیہ:

جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہوجائیں گے تو اللہ تعالٰے اُن سے فرمائے گا: جو نعمتیں تمہیں جنت میں ملی ہیں ان کے علاوہ اور بھی چاہیے تو کہو! ہم نوازیں گے۔ جنتی عرض کریں گے: اے اللہ! ہمارے لیے اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوسکتی ہے کہ آپ نے ہمیں دوزخ کے شعلوں سے بچالیا اور جنت کی بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ اس وقت اللہ اور اہل جنت کے درمیان سے حجاب اٹھ جائے گا اور سب اللہ تعالٰے کے دیدار سے مشرف ہوجائیں گے اور اس وقت دیدار الٰہی کی لذت وسرور کے سامنے جنت کی ساری نعمتیں کم تر معلوم ہوں گی اور اہلِ جنت کے نزدیک دیدارِ الٰہی سے زیادہ محبوب ترین کوئی اور نعمت نہ ہوگی۔

ترمذی کی ایک دوسری حدیث میں دیدارِ الٰہی سے زیادہ عظیم ترین نعمت رضائے الٰہی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور

فی الواقع اہلِ جنّت کے لیے جنّت کی ساری نعمتوں میں سب سے عظیم ترین نعمت اللہ کی رضا و خوشنودی ہے کہ وہ اپنے بندوں سے خوش رہے۔ ولو بالفرض اللہ تعالیٰ اہلِ جنّت سے ناراض ہوجائے تو پھر خلد سے اخراج کی بات ہوگی۔ چناں چہ اس وقت منظر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

عن ابی سعید الخذری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یقول لاھل الجنۃ یا اھل الجنۃ فیقولون لبیک ربنا وسعدیک۔ فیقول ھل رضیتم؟ فیقولون مالنا لا ترضیٰ۔ وقد اعطیتنا مالم تعط احدا من خلقک فیقول انا اعطیکم افضل من ذلک۔ قالوا وای شئی افضل من ذلک قال احل علیکم رضوانی فلا اسخط علیکم ابدًا۔ ھذا حدیث حسن صحیح۔

ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنّت سے خطاب فرمائے گا: اے جنّت والو! عرض کریں گے لبیک وسعدیک۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم مجھ سے راضی اور خوش ہو؟ عرض کریں گے: اے ربّ کریم! ہمارے لیے ناراض رہنے کی بات ہی کیا ہے، آپ نے تو ہمیں وہ وہ نعمتیں بخشی ہیں جو کسی مخلوق کو آپ نے عطا نہ کی۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میں تمہیں ایک ایسی نعمت عطا کروں گا جو جنّت کی ساری نعمتوں سے افضل ہوگی۔

اہلِ جنّت خوشی وحیرت کے جذبات کے ساتھ عرض کریں گے: جنّت کی نعمتوں سے بھی افضل نعمت کون سی ہوسکتی ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میں تم سے اپنی خوشنودی اور رضامندی کا اظہار اور اعلان کرتا ہوں اب تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح کہا ہے۔

عبداللہ بن عمر سے مرفوعًا روایت ہے کہ: اکرمھم علی اللہ من ینظر الی وجھہ غدوۃ وعشیۃ اللہ تعالیٰ جن افراد کو جنّت میں مخصوص درجہ عطا فرمائیں گے ان کو صبح و شام اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوتا رہے گا۔

رویت باری اور دیدارِ الٰہی کا یہ وہ پہلو ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ اور اس باب میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ صرف معتزلہ اور شیعہ اس کے قائل نہیں ہیں۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا اس دُنیا میں اللہ کا دیدار ہوسکتا ہے؟ تو اس باب میں اہلِ سنّت وجماعت کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ دُنیا میں اللہ کا دیدار نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات جسم اور جسم کے لوازم جو آمنے سامنے ہونا، قرب و بعد سے منزّہ ہے اور جہاتِ ستہ (آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں) سے منزّہ ہے۔ اور اس پہ دلیل پیش کی جاتی ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کو دیکھنے کی تمنّا ظاہر کی تو جواب ملا لن ترانی: اے موسیٰ آپ مجھے دیکھ نہیں سکتے۔ صاحبِ معارف القرآن نے اس موضوع پر بڑی عمدہ بحث کی ہے اور لکھا ہے۔ کہ عقلی اعتبار سے رویت ممکن ہے، لیکن شرعی اعتبار سے ممتنع ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

لن ترانی یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے، اس میں اشارہ ہے کہ رویت ناممکن نہیں۔ مگر مخاطب بحالتِ موجودہ

اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ورنہ اگر رویت ممکن ہی نہ ہوتی تو لن ترانی کے بجائے لن اُرٰی کہا جاتا کہ میری رویت نہیں ہو سکتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالٰے کا دیدار دُنیا میں بھی عقلاً ممکن تو ہے مگر اس آیت سے اس کا ممتنع الوقوع ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ اور یہی مذہب ہے جمہور اہل سنّت کا کہ دُنیا میں اللہ تعالٰے کی رویت عقلاً ممکن ہے مگر شرعاً ممتنع۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: لن یریٰ احد منکم ربہ حتی یموت: تم میں سے کوئی شخص مرنے سے پہلے اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور لکن انظر الی الجبل اس میں اس امر کی شہادت ہے کہ بحالت موجودہ مخاطب رویت الٰہی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لیے پہاڑ پر ادنیٰ سی جھلک ڈال کر بتلادیا گیا کہ وہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ انسان تو ضعیف الخلقت ہے۔ وہ کیسے برداشت کرے گا؟

صوفیاء کے نزدیک تجلّی کے معنی کسی چیز کو بالواسطہ دیکھنے کے ہیں۔ جیسے کوئی چیز بواسطہ آئینہ کے دیکھی جائے۔ اسی لیے تجلّی کو رویت نہیں کہہ سکتے۔ خود اسی آیت: فلما تجلی ربہ للجبل میں اس کی شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالٰے نے رویت کی تو نفی فرمائی اور تجلّی کا اثبات۔

غرض دُنیا میں اللہ تعالٰے کے دیدار کی نفی اور عدم روئیت کا موقف جن بزرگوں نے اختیار کیا ان کی نگاہیں قرآن کریم کی اس آیت لاتدرکہ الابصار (اس پر کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی) اور ان احادیث پر مرکوز رہیں جن میں نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دیدار الٰہی کی نفی کا پہلو موجود ہے۔

امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ ایک مقام پر کعب احبارؓ سے حضرت ابن عباسؓ کی ملاقات ہوی تو کعب نے کہا: اللہ نے اپنے کلام اور اپنے دیدار کو موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان تقسیم کردی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو مرتبہ کلام کا شرف بخشا اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو دو مرتبہ اپنے دیدار سے مشرف فرمایا۔

یہ بات جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے اس کی تردید کی اور فرمایا: اللہ تعالٰے کا فرمان ہے: لاتدرکہ الابصار نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں اسراء و معراج کے باب میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ سے مروی حدیث نقل کی ہے۔ انھوں نے نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اللہ کے رسول! آپ نے خدا کو دیکھا؟ ارشاد فرمایا: وہ نور ہے میں کیسے دیکھ سکتا ہوں!

صحیح بخاری میں ایک حدیث ملتی ہے، جس میں بھی نفی کا پہلو نمایاں ہے۔ چناں چہ حضرت مسروقؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا: اے مادرِ من! کیا حضور اکرمؐ نے خدا کو دیکھا تھا؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: جس کسی نے بھی یہ بات کہی کہ حضورؐ نے اللہ کو دیکھا تھا تو اس نے جھوٹ کہا۔ کیونکہ خدا کو نگاہیں نہیں پا سکتیں لاتدرکہ الابصار۔

صحابہ کرام اور اہلِ علم کا ایک طبقہ مذکورہ موقف سے اتفاق نہیں کرتا ہے بلکہ یہ حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوے۔ چناں چہ عکرمہ نے اپنے استاد حضرت ابنِ عباس سے لاتدرکہ الابصار کی تفسیر دریافت کی تو فرمایا: ہاں یہ صحیح ہے کہ خدا کو نگاہیں دیکھ نہیں سکتیں۔ مگر یہ اس وقت جب کہ اللہ تعالےٰ اپنے اصلی نور میں جلوہ نما ہو۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ اللہ تعالےٰ کو دیکھا تھا۔

شریک بن عبداللہ کی یہ تفسیر صحیح بخاری سے ہے: حتی جاء سدرۃ المنتھی دنا الجبار رب العزۃ فتدلی حتی کان منہ قاب قوسین او ادنیٰ۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو اللہ تعالےٰ یہاں تک قریب ہوا کہ اس کے اور آپؐ کے درمیان دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔

فارسی کے کسی شاعر نے کہا: ؎

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتو جمال　　　تو عین ذات می نگری در تبسمے

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جمالِ الٰہی کی ایک ہلکی سی جھلک کا مشاہدہ کیا تو اُن کی نگاہیں چکا چوند ہوگئیں اور وہ اس نظارہ کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور اس دیدار کی کیفیت یہ رہی کہ آپؐ کی نہ نگاہیں جھکیں اور نہ آپ نے پلکیں جھپکیں اور نہ آپ کے چہرہ پر خوف طاری ہوا اور نہ آپ کے دل میں اضطراب پیدا ہوا۔

اس مسئلہ میں سیدھی سادی اور صاف صاف بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے دیدار کا تعلق اگر عام اہلِ ایمان سے ہو تو کئی بحثوں کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ لیکن حضرات انبیاء اور بالخصوص سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ الٰہی کے مسئلہ میں کسی بحث و مباحثہ کی گنجائش ہی نہیں۔ کیوں کہ حضرات انبیاء کرام کی چشمِ بصیرت اور قلب کے مشاہدہ کی قوت کا عشر عشیر بھی کسی مومن کو میسر نہیں۔ حضرات انبیاء، فرشتوں کو دیکھتے ہیں اور غیر مرئی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مغیبات پر مطلع ہوتے ہیں اور براہ راست اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق اور ربط قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں جو دیدارِ الٰہی کی جو نعمت اہلِ ایمان کو آخرت میں ملنے والی ہے اگر وہ دنیا میں ہی حضرات انبیاء کرام کو مل جائے تو اس میں تعجب اور بحث کی کیا بات ہے۔

دیدارِ الٰہی کے مسئلہ میں دو تین لفظوں کے معنی و مفہوم کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ایک لفظ رویت ہے جس کا معنی ہے آنکھ سے دیکھنا۔ حواس خمسہ میں سے ایک حاسہ قوتِ باصرہ ہے۔ جس سے موجود اور محسوس چیز کا علم ہوتا ہے۔ نگاہ اور دیکھنے کی قوت کو بصر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کی جمع ابصار ہے۔

دوسرا لفظ ادراک ہے۔ جس کے معنی ہیں پانا، عقل دریافت کرنا، پکڑ لینا، احاطہ کر لینا۔

اور ایک تیسرا لفظ ہے تجلّی ۔جس کے معنی ہیں، ظاہر ہونا، واضح ہونا، منکشف ہونا۔ اگر دیدارِ الٰہی سے مراد صرف رویت بصری لیا جائے تو ظاہر ہے کہ انسان کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کی حقیقت کی کنہ (ماہیت، کسی شئے کی انتہاء) تک نہیں پہنچ سکتیں ۔ اور دُنیا کی آنکھ سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتا اور اس نفی کا تعلق دنیا سے ہے ۔ لیکن آخرت میں اہلِ ایمان اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں گے ۔ اور آخرت کی آنکھ دُنیا کی آنکھ جیسی نہ ہوگی۔ بلکہ وہاں کی ساری چیزیں خرقِ عادت کے طور پہ ہوں گی۔

معتزلہ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا، دنیا میں نہ آخرت میں ۔ یہ صحیح نہیں ہے اور شیعیوں کا موقف بھی منفی نقطۂ نظر کا حامل ہے ۔ جو کہ صحیح نہیں ہے ۔

اس مقام پہ یہ بات جان لینی چاہیے کہ رویت ایک چیز ہے اور ادراک دوسری چیز ہے ۔ اور کسی چیز کا ادراک نہ ہونا اس چیز کے نہ دیکھنے کا سبب نہیں ۔ اس لیے کہ ادراک کی معنی چیز کی حقیقت تک پہنچنا اور اس پہ احاطہ کرنا ہے ۔ اور رویت کے معنے ہیں صرف دیکھنا ۔ اور دیکھنا بغیر احاطہ کے واقع ہے ۔ مثلاً دریا یا آسمان کو بغیر احاطہ کے دیکھتے ہیں ۔ یہ رویت ہے ۔ ادراک نہیں ۔

رویت اور تجلّی میں بھی فرق ہے ۔ تجلّی کو رویت نہیں کہہ سکتے اور چشمِ قلب سے اللہ کی تجلّی کا مشاہدہ ہو سکتا ہے ۔ علامہ ابنِ حجر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کے قول کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دل کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور یہی معنی فتح الباری میں بھی بیان کیا گیا ہے ۔ لم یرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعینہ انما راہ بقلبہ : آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھ سے نہیں بلکہ اپنے قلب سے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ۔

حاصل کلام ! جہاں چشمِ بصیرت اور نگاہِ قلب کی بات آجائے تو وہاں اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کے مشاہدہ اور دیدار میں کوئی قیل وقال ہی نہیں ۔ رویتِ باری تعالیٰ کے مسئلہ میں حضرت قطبِ ویلور قدس سرہ کا ایک فارسی مکتوب بھی پُر از معلومات ہے ۔ جو آپ نے مولوی محمد علی، صدر امین راج بندری کے نام لکھا ہے ۔ یہاں اس کے بعض حصوں کا صرف ترجمہ پیش ہے :

"مرقات الجنّات" اور "رسالۂ ملا شبعی" دستیاب ہوے ۔ مرقات الجنّات کا مطالعہ کیا ۔ بلاشبہ وہ اسم بامسمّٰی ہے ۔ ملا شبعی کا رسالہ بھی نظر سے گزرا معلوم ہوا صاحب رسالہ بھی اپنے اسلاف کی طرح منقول کو معقول سے تطبیق دیتے ہیں اور رویت الٰہی کو نادان حکماء کے قواعد و ضوابط کے دائرے میں محدود و محصور خیال کرتے ہیں اور مشروط شرائط کے بغیر رویت کو ناممکن قرار دیتے ہیں ۔

دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سمیع اور بصیر ہے ۔ لیکن وہ سماعت اور بصارت کی مشروط

شرائط سے بے نیاز ہے۔ یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ آخرت کے امور خوارق عادات سے ہیں۔ ایک جنتی شخص مساوات کی دوری کے باوجود اور شرائط کے فقدان کے باوجود اپنے ملک وحشم کے آخر کو ایسا ہی دیکھتا ہے۔ جیسا کہ اس کے اول کو دیکھتا ہے نیز اہل ایمان اور اہل کفر غلمان و ولدان اور حور و ملائک کو دیکھیں گے۔ یہاں رویت سے متعلق نادان حکماء کی مشروط شرائط کہاں پائی جاتی ہیں۔

رویت کا مسئلہ سلف میں بھی مختلف فیہ رہا ہے۔ امام ربانی شیخ احمد سرہندی نے رسالہ "مبدا و معاد" میں رویت سے متعلق بڑی علمی و تحقیقی بحث کی ہے۔ لہٰذا فقیر شیخ سرہندی کی تحریر یہاں نقل کرنے پر اکتفا کر رہا ہے۔

'یہ بات حق ہے کہ اہل ایمان کو آخرت میں اللہ تعالٰے کا دیدار ہوگا اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کے قائل صرف اہل سنت وجماعت ہیں۔ ان کے علاوہ اسلام میں کوئی فرقہ اس کا قائل نہیں ہے۔ اور حکماء فلاسفر بھی رویت کا انکار کرتے ہیں۔ منکرین کے انکار کی وجہ شاہد پر غائب کا قیاس ہے اور یہ غلط ہے۔ مرئی (وہ چیز جو دکھائی دے) جب بے چون اور بے چگونہ اور بے مثل اور بے مانند (یعنی اللہ تعالٰے) ہے تو رویت بھی جو اس کے ساتھ متعلق ہوگی وہ بھی بے مثل ہوگی۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جس پر ایمان لانا چاہیے اور اس رویت کی کیفیت کو جاننے اور سمجھنے کے درپے نہیں ہونا چاہیے اور یہ راز اہل اللہ پر منکشف ہے۔ ہر چند کہ رویت نہیں لیکن بے رویت بھی نہیں ہے: ان تعبد اللہ کانک تراہ: اللہ تعالٰی کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔

کل قیامت کے روز اہل ایمان اللہ تعالٰی کو اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ لیں گے لیکن ادراک نہیں کرسکیں گے کیونکہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ لاتدرکہ الابصار۔

دو چیزوں کا علم ہوا۔ ایک علم یقین ضرور رویت ہوگی۔ دوسری وہ لطف ولذت جو رویت سے حاصل ہوگی۔ ان دو چیزوں کے علاوہ رویت کے لوازم سے ساری چیزیں اور شرطیں مفقود رہیں گی۔

رویت باری تعالٰی کا مسئلہ علم کلام کے دقیق مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ اور آدمی کی عقل وفہم اور اس کے تصوّر اور اثبات سے عاجز ہے۔ اس مسئلہ کو صوفیاء اور علماء نے نور فراست دریافت کرلیا ہے۔ اور یہ فراست انوارِ نبوت سے فیض شدہ ہے۔

اہل سنّت وجماعت کے علماء کو صرف نور فراست حاصل ہے اور صوفیاء کو نور فراست کے علاوہ کشف و شہود کی نعمت بھی حاصل ہے۔ کشف اور فراست کے درمیان اسی طرح کا فرق ہے جس طرح کا فرق حدسیات اور حسّیات کے درمیان ہے۔

فراست نظریات کو حدسیات بنادیتی ہے اور کشف حدسیات کو حسّیات بنادیتی ہے۔ ایسے مسائل جن کے قائل صرف اہلِ سنّت ہیں وہ تمام کے تمام اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کو نور فراست کے ذریعہ معلوم کیا گیا ہے اور

جن کا مشاہدہ کشفِ صحیح کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ لیکن مخالفین نے ان مسائل کو عقل وفہم کے ذریعہ حل کرنے کو ضروری سمجھا۔ اور جو بات بھی عقل کے دائرے میں نہ آسکی اس کے انکار کے درپے ہو گئے۔

اہلِ سنّت کے علماء نے بھی ان مسائل کے عقلی حیثیت سے تھوڑی بہت تشریح کی ہے لیکن اس سے ان کا مشاہدہ ونشاء تصویرِ ذہنیہ ہے۔ نظر ودلیل اور عقل وفکر کی بنیاد پر ان مسائل کا اثبات نہیں ہے۔ اس لیے کہ عقل کی آنکھیں ان مسائل کی تصویر اور اثبات سے اندھی ہے۔

اہلِ سنّت کے بعض علماء کا یہ طرزِ عمل بھی عجیب ہے کہ اپنے مسائل کو استدلال کے مقام میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان مسائل کو دلائل اور براہین کے ذریعہ ثابت کریں اور مخالفین پر حجّت پوری کردیں۔ لیکن یہ میسر نہ ہوگا اور انمام وانجام کو نہیں پہنچیں گے۔ نیز اس طریقہ اور عمل کی وجہ سے مخالفین خیال کریں گے کہ ان کے مسائل ان کے استدلالات کے رنگ میں ادھورے، کھوٹے اور نا تمام ہیں۔ مثلاً اس مسئلہ کو لیجیے۔

اہلِ سنّت وجماعت کے علماء نے استطاعت مع الفعل ثابت کیا اور یہ مسئلہ مسائل حقہ میں سے ہے۔ ایک ہے جو نور فراست اور کشف صحیح سے معلوم کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ثبوت میں جو دلیلیں دی گئی ہیں وہ ناقص اور نامکمل ہیں۔

اس مسئلہ کے اثبات پر ان کے دلائل کی قوت دو زمانوں میں عدم بقائے اعراض ہے۔ اس لیے کہ اگر عرض باقی ہوگا تو قیامِ عرض باقی ہوگا تو قیام عرض بعرض لازم آئے گا اور محال ہے۔

جب مخالفین نے اس دلیل کو ادھوری اور نامکمل دیکھا تو یقین کر بیٹھے کہ یہ مسئلہ بھی نا تمام اور مزلیف ہے لیکن یہ نہیں جان سکے کہ اس مسئلہ کے اثبات پر رہ نمائی کرنے والی چیز نور فراست ہے جو انوارِ نبوت سے فیض شدہ اور اخذ کردہ ہے۔

یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم حدسی اور بدیہی کو مخالفین کی نگاہوں میں نظری بتا رہے ہیں اور تکلفات کے ذریعہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس باب میں انتہا یہ ہے کہ مخالفین کے مقابلہ میں حدسی اور بدیہی درست نہیں۔ جس شخص کے دل میں ایمان کی روشنی ہوگی وہ بے اختیار قبول کرے گا اور جو بد نصیب ہوگا وہ انکار کے درپے ہی رہے گا۔

شیخ ابو منصور ماتریدی کے اصحاب کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو مقاصد پر ٹھہرالیا اور فلسفہ کی پیچیدگیوں اور دقتوں سے منہ موڑ لیا۔

شیخ ابو الحسن اشعری کی جماعت کے علماء میں فلسفیانہ انداز سے استدلال کی راہ ہموار ہوی اور انھوں نے چاہا کہ اہل سنّت وجماعت کے عقائد کو فلسفیانہ استدلال سے بھی مکمل بنائیں۔ لیکن یہ بہت ہی دشوار مرحلہ ہے۔ اور اس طریقہ سے مخالفین کو ہمارے اکابرین پر لعن وطعن کرنے کے لیے دلیر بنا دیتا ہے۔ اور سلف کے طریقہ سے ہٹ جاتا ہے۔

حاصلِ کلام! اہلِ ایمان کو آخرت کی مختلف منزلوں میں اللہ تعالےٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ ان میں سے ایک

مقام محشر بھی ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا سامنا ہوگا۔ محشر میں خدا کی جناب اور حضور میں پہنچنے کا عقیدہ۔ ہماری دُنیاوی زندگی پر بھی بڑے گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ اور یہ عقیدہ ہمیں مجبور کردیتا ہے کہ ہر قسم کے ظلم و ستم اور فحش و بدکاری سے بچے رہیں اور اپنی ذمہ داریوں اور دوسروں کے حقوق کو بحسن و خوبی انجام دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کے وقت ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے۔ اور اس کے غیض و غضب کا شکار بن جائیں۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو ایک مؤمن کو شُترِ بے مہار کی طرح زندگی گزارنے پر روک لگادیتا ہے۔ اور اسے فرائض و حقوق کی ادائیگی کی جانب مائل اور راغب کردیتا ہے۔

اللّٰھمّ ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

نعت شریف

مولوی حافظ سید رفیق احمد کوثر فدائی باقوی ایم۔اے،
اردو منشی، پی۔سی۔ گورنمنٹ ہائی سکول۔ پونے پلی (چتور)

محمد مصطفےٰ کی شان ہے اتنی بلندی پر
بلندی کو بھی خود ہے ناز اپنی اِس بلندی پر
قیامت میں نبی آئیں گے پہنے تاجِ نورانی
خدا کا فیصلہ ہوگا مرے آقا کی مرضی پر
جو سمجھے شرک، آقا کے تصوّر کو تشہد میں
نہ ہوگی رحمتِ باری کبھی ایسے نمازی پر
رہے سرکار جب فاقوں میں شاہِ دوجہاں ہوکر
تو پھر کیسے ہمیں ہو غم ہماری اس غریبی پر
کسی کو آج تک یہ بات نہ معلوم ہو پائی
گئے معراج کی شب مصطفےٰ کتنی بلندی پر
نظر کوثر کی ہے ہر وقت آقا کی عنایت پر
نہ سونے پر نہ چاندی پر نہ ہیرے پہ نہ موتی پر

جواہر الحدیث



احادیث کی روشنی میں نمازِ جنازہ کے احکام

مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق ایم اے، استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان۔ ویلور

اسلام کی ایک اہم ہدایت یہ ہے کہ مسلمان جہاں کہیں رہتے بستے ہوں وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھیں، تاکہ زندگی کے مسائل و مصائب اور مشکلات و آفات میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن سکیں۔ کیوں کہ کوئی بھی شخص دوسروں کے تعاون کے بغیر تنہا اپنی زندگی کا سفر جاری نہیں رکھ سکتا۔ اسی لیے اسلام نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے کچھ حقوق عائد کردیے ہیں۔ جن کو ادا کرنے کی ترغیب و تحریص دلائی اور ان حقوق کی ادائیگی پر اجر و ثواب کی بشارت سنائی۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو سلام کرے۔ سلام ایک ایسا اقدام ہے جس کے ذریعہ ایک اجنبی مسلمان دوسرے اجنبی مسلمان سے قریب ہوجاتا ہے۔ اور پھر یہی سلام کلام کا ذریعہ اور باہمی تعارف اور ربط و ضبط کا سبب بن جاتا ہے اس مرحلہ کے طے ہونے کے بعد قرآن کی رہ نمائی اس طرح ملتی ہے کہ آپس میں ہمیشہ بھلی اور اچھی بات کہو۔ اور کبھی ایسی بات نہ کہو جس سے قائم شدہ تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوجائے اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کرو کہ باہمی روابط اور تعلقات میں مضبوطی پیدا ہوجائے۔ اس کے لیے چند احکامات ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دعوت دے تو قبول کرے۔ دعوت فرد کے تعلق کو خاندان کے تعلق میں بدل دیتی ہے اور اس کے ذریعہ محبت اور دوستی میں وسعت اور پھیلاؤ ہوجاتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی مسلمان بیمار ہوجائے تو اس کی عیادت کے لیے چلے جاؤ اور اس کے لیے طبی و مالی اور دیگر سہولیات بہم پہنچاؤ۔ اس کے ذریعہ جانبین سے ہمدردی اور احسان شناسی اور خیر خواہی کے جذبات ابل پڑتے ہیں۔ اور تیسری یہ بات ہے کہ کوئی بھی مسلمان دنیا سے رخصت ہوجائے تو اس کی نمازِ جنازہ ادا کرو اور جنازہ کے ساتھ چل کر قبرستان تک جاؤ اور اپنے بھائی کو آخری خدمت انجام دو۔

ان ہدایات پر عمل کیا جائے تو اسلامی معاشرہ کے افراد ایک دوسرے سکے قریب تر ہونے چلے جائیں گے اور ان کے درمیان محبت والفت اور ربط وضبط پیدا ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک مسلمان کی شناخت وعلامت اور تعریف یہ ہو جائے گی کہ وہ اپنی زبان سے کسی کو تکلیف نہیں دیتا اور اپنے ہاتھ سے کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا اور مصیبت و تکلیف کے وقت اپنے بھائی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کی مدد کرتا ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده لا يهجر اخاه كما قال عليه السلام

جب کسی سوسائٹی میں ایسی فضا عام ہو جائے تو وہ ترقی اور خوش حالی کی منہ بولتی تصویر بن جاتی ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد نماز جنازہ سے متعلق چند احادیث اور ان کی ضروری تشریحات ملاحظہ کیجیے:

● ۱۔ عن براء بن عازب رضی الله عنه قال امرنا النبی صلی الله علیه وسلم بسبع ونهانا عن سبع امرنا باتباع الجنائز وعيادة المريض واجابة الدّاعي ونصر المظلوم وابرار القسم وردّ السّلام وتشميت العاطس ونهانا عن آنية الفضّة وخاتم الذهب والحرير والديباج والقسي والاستبرق۔ (بخاری)

حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات چیزوں کا حکم دیا ہے۔ ۱۔ جنازہ کے ساتھ چلنا۔ ۲۔ مریض کی عیادت کرنا۔ ۳۔ دعوت قبول کرنا۔ ۴۔ مظلوم کی حمایت کرنا۔ ۵۔ قسم پوری کرنا۔ ۶۔ سلام کا جواب دینا۔ ۷۔ کسی کی چھینک پر یرحمک اللہ کہنا۔

اور چاندی کے برتن استعمال کرنے سے، سونے کی انگوٹھی پہننے سے، ریشم کے کپڑے، مخلوط ریشم کے کپڑے، مخلوط کتان کے کپڑے اور استبرق کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے۔

جنازہ کے ساتھ پیدل چلنے کے مسئلہ میں امام ابو حنیفۃ النعمان کے ہاں پیچھے چلنا افضل ہے اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کے ہاں آگے چلنا افضل ہے موقع اور محل کی مناسبت سے آگے پیچھے اور دائیں بائیں ہر سمت سے چلنا بھی درست ہے۔ اس میں کوئی خاص پابندی نہیں ہے۔

● ۲۔ عن ابی هريرة رضی الله عنه يقول سمعت رسول الله صلے الله علیه وسلم يقول من تبع جنازة وحملها ثلث مرات فقد قضى ما عليه من حقها۔ (بخاری)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی جنازہ کے ساتھ چلا اور اس کو تین مرتبہ کندھا دیا تو میّت کا جو حق اس کے ذمہ تھا وہ اس نے ادا کر دیا۔

جنازہ کے ساتھ چلنا جنازہ کو کاندھا دینا جہاں اجر و ثواب کی بات ہے، وہاں انسانی ہمدردی کی بات بھی ہے۔ اس عمل کے ذریعہ معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کے غم اور دکھ میں شریک ہو جاتے ہیں لیکن سارے افراد کا شریک ہونا

بھی ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ جس کی وجہ سے شریعتِ مطہرہ نے جنازہ اٹھانے اور چلنے کو فرض کفایہ قرار دیا اور چند لوگوں کی شرکت کو سارے لوگوں کی شرکت کا ہم معنی قرار دیا اور سب کو اجر و ثواب میں شریک ٹھہرایا۔ اس مسئلہ میں سارے ائمہ متفق ہیں۔

• ۳ عن ام عطیۃ انھا قالت نھینا عن اتباع الجنائز (ترمذی)

ام عطیہؓ کا کہنا ہے کہ ہمیں جنازے کے ساتھ چلنے سے روک دیا گیا ہے

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورتیں جنازہ کو کندھا نہیں دے سکتیں اور نہ اس کے ساتھ چل سکتی ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ ممانعت مکروہِ تحریمی کے درجہ میں ہے۔ تو بعض کے نزدیک مکروہِ تنزیہی کے درجہ میں ہے۔ اور بعض کے نزدیک حرام ہے۔ جمہور کے نزدیک حرام ہے۔

• ۴۔ عن عامر بن ربیعہ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال اذا رأیتم الجنازہ فقوموا حتی تخلفکم۔ (بخاری)

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص جنازہ کو گزرتا ہوے دیکھے تو کھڑے ہوجاؤ۔

ائمہ کے درمیان قیام کے مسئلہ میں اختلاف ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے قیام چھوڑدیا۔ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کان یقوم فی الجنازۃ ثم جلس بعدہ۔ جس کی وجہ سے بعض کے نزدیک قیام کی حدیث منسوخ ہوگئی لیکن بعض کے نزدیک قیام کا حکم استحباب کے درجہ میں باقی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان، امام مالک، امام شافعی کے قیام واجب نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل اور بعض علمائے شافعیہ اور بعض علماے مالکیہ کے نزدیک مستحب ہے۔

ایک موقعہ پر کسی غیر مسلم کا جنازہ گزر رہا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو کھڑے ہوگئے۔ بعض صحابہ نے تعجب کا اظہار کیا تو ارشاد فرمایا: الیست نفسا: کیا یہ انسان نہیں ؟

• ۵۔ عن ثوبان قال خرجنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ فرأی ناسا رکبانا فقال الا تستحیون ان ملائکۃ اللہ علی اقدامھم وانتم علی ظھور الدواب۔ (ترمذی)

حضرت ثوبان کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازہ کے ہمراہ جارہے تھے۔ آپ نے بعض لوگوں کو سواری پر دیکھا تو فرمایا: کیا تم لوگوں کو شرم نہیں! اللہ تعالے کے فرشتے پیدل چل رہے ہیں اور تم گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو!

• ۶۔ عن سماک بن حرب قال سمعت جابر بن سمرۃ یقول کنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازہ ابن الدحداح وھو علی فرس۔ (ترمذی)

سماک بن حرب کا بیان ہے کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک جنازہ کے ساتھ تھے اور آپؐ اس وقت گھوڑے پر سوار تھے۔

● ۷۔ عن جابر بن سمرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتبع جنازۃ ابن الدحداح ماشیا ورجع علی فرس۔ (ترمذی)

جابر بن سمرۃ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابن دحداح کے جنازہ کے ساتھ پیدل تشریف لائے۔ واپسی کے وقت گھوڑے پر سوار ہوئے۔

مذکورہ احادیث سے دونوں پہلو نمایاں ہو رہے ہیں۔ جنازہ کے ساتھ پیدل اور سواری دونوں صورتوں کی گنجائش ہے۔ تاکہ لوگ وقت کی تنگی، چلنے کی معذوری اور قبرستان کی دُوری کے پیشِ نظر جو صورت حال موزوں اور مناسب نظر آئے اس پر عمل کر سکیں۔

جنازہ لے جاتے ہوئے اثنائے راہ میں بلند آواز کے ساتھ کلمۂ طیّب پڑھنا اور نعتیہ اشعار پڑھنا اور زمین پر جنازہ رکھتے ہوئے اور اٹھاتے ہوئے زور سے تکبیر کہنا یہ ساری صورتیں از روئے حدیث صحیح نہیں ہیں۔ ابنِ ماجہ کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسے جنازے کے ساتھ جانے سے منع فرمایا ہے جس میں شور اور آواز ہو۔ احناف کے نزدیک جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرتے ہوئے چلنا مکروہ ہے البتہ دل ہی دل میں ذکر اور دعا کی ممانعت کسی کے پاس نہیں ہے۔

جنازہ کی چارپائی کو اس کے چاروں کونوں سے اٹھانا چاہیے اور جنازہ کو سکوت و خاموشی اور ادب و احترام اور کسی قدر تیز رفتاری کے ساتھ ہچکولے اور جھٹکے کے بغیر کندھوں پر اٹھا کر لے جانا چاہیے۔ قبرستان کی مسافت دور ہو تو جنازہ سواری پر لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میّت کو غسل دینے اور کفن پہنانے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھنی چاہیے۔ اور ہر کلمہ گو کی نماز جنازہ پڑھنی چاہیے خواہ وہ کتنا ہی گناہ گار، بدکار کیوں نہ ہو۔ صرف چند اشخاص ایسے ہیں جن کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کا فتویٰ بعض فقہاء نے دیا ہے۔ مثلاً باغی، رہزن، ڈاکو اور بدعتی وغیرہ۔ جن فقہاء نے بھی مذکورہ اشخاص کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کا فتویٰ صادر فرمایا ہے، اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ حضراتِ کرام ان سیہ کاروں کی مغفرت کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ اس سے ان حضرات کا یہ نیّت ہے کہ ایسے افراد کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تو دیکھنے والوں کو عبرت ہو گی اور اُن کے دلوں میں بھی خوف پیدا ہو گا اور جرائم کا ارتکاب سے خود کو بچائے رکھنے کی کوشش کریں گے اور دنیا سے جانے والوں کی تذلیل اور انجامِ بد دیکھ کر یہ بھی ظلم و استبداد اور جرم و گناہ کے دلدل سے نکلنے کی سعی کریں گے۔ بہر کیف سماج اور سوسائٹی کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے جو صورت عبرت انگیز و نصیحت خیز نظر آئے اس پر عمل کرنا چاہیے اور

جہاں تک ہو کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہر مسلمان کی جنازہ کی نماز پڑھی جائے کیوں کہ اس وقت وہ ہماری دُعا کا شدید محتاج رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں امام ابن حزم کا موقف قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ امام موصوف فرماتے ہیں: گناہ کار اور بدکار مسلمان ہی دُعا کا سب سے زیادہ محتاج اور حق دار ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کی بھی نمازِ جنازہ ترک کرنا صحیح نہیں ہے۔ نمازِ جنازہ ادا کرنے کا عمل امّت میں تواتر اور تسلسل کے ساتھ قائم ہے اور یہ نماز فرضِ کفایہ ہے۔ چند افراد کے پڑھ لینے سے سارے لوگ ثواب کے مستحق ہوجاتے ہیں۔ احادیث میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ملاحظہ کیجیے۔ جس میں ثواب کی کثرت بیان کی گئی ہے۔

• ۸۔ عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم من صلی علی جنازة فله قيراط ومن تبع بها حتی يقضی دفنها فله قيراطان. احدهما او اصغرهما مثل أحد. (ترمذی)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے کسی میّت کی نمازِ جنازہ پڑھی تو اُسے ایک قیراط کا ثواب اور جس نے نماز ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دفن میں بھی شریک رہا تو اُسے دو قیراط ثواب ملے گا۔ (قیراط سے مراد کوہِ احد کی مقدار میں ثواب ملے گا)

نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے وضو، ستر پوشی، قبلہ رُخ ہونا ضروری ہے۔ یہ نماز تیمم سے بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ اور تیمم کے لیے وہی شرائط ہیں جو دوسری نمازوں کے لیے ہیں۔ مثلاً بیماری، بیماری میں اضافہ کا خدشہ، پانی کی قلت، پانی موجود ہے لیکن اس پر قدرت نہیں ہے وغیرہ۔ اگر نمازِ جنازہ شروع ہورہی ہے یا ہوچکی ہے اور ہم وضو کرتے بیٹھ جائیں تو نماز ختم ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں جلد از جلد تیمم کرکے نمازِ جنازہ میں شامل ہوجانا چاہیے۔

اور اگر کوئی شخص ایسے وقت میں آپہنچا جب کہ نمازِ جنازہ شروع ہوچکی ہے تو وہ امام کی تکبیر کا انتظار کرے۔ امام کے تکبیر کہنے کے بعد جماعت میں شامل ہوجائے اور اگر امام چوتھی تکبیر کہہ دے تو فوراً تکبیر کہہ کر جماعت میں شامل ہوجائے۔ انتظار نہ کرے۔ اس کے بعد تکبیر کے انتظار کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اور جتنی تکبیریں امام کے ساتھ مل جائیں انھیں پڑھ لے اور باقی تکبیرات کو امام سلام پھیرنے کے بعد پورا کرلے۔

نماز پڑھنے سے پہلے نیّت کرلینی چاہیے اور یہ ضروری ہے۔ کیوں کہ نیّت ہی شرعی امور میں اصل ہوتی ہے اور ایک حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ نیت ہی پر عمل کا دارومدار ہے۔ انما الاعمال بالنيات۔

نمازِ جنازہ کھڑے ہوکر پڑھنا چاہیے۔ اور چار تکبیرات کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرض نمازوں کی طرح کھڑے ہوکر چار تکبیرات سے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی نماز پڑھی۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے: ان النبی صلی الله عليه وسلم صلی علی النجاشی فكبر اربعاً۔

تکبیرات کے مسئلہ میں ائمہ کے اختلافات ہیں اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات پانچ، سات اور نو تکبیرات کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی ہے۔ شہدائے اُحد پر نو تکبیریں کہنے کی روایت عبداللہ بن مسعودؓ سے ہے۔ اس مسئلہ میں جمہور صحابہ اور سلف وخلف اور اکثر ائمہ کا موقف چار تکبیرات ہے۔ امام ابوعیسیٰ نے اپنی جامع میں چار تکبیرات والی روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: هذا حديث حسن صحيح والعمل على هذا عند اكثر اهل العلم من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وغيرهم يرون التكبير على الجنازة اربع تكبيرات۔

یہ حدیث حسن اور صحیح ہے اور چار تکبیرات پر اکثر اہلِ علم، صحابہ کرام اور دیگر علماء وفقہاء کا عمل رہا ہے۔

امام طبرانی کی روایت عبداللہ بن عباس کے واسطے سے ملتی ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نو تکبیریں پھر سات تکبیریں پھر چار تکبیریں کہنے لگے۔ اس کے بعد چار ہی پر عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

عبداللہ بن عباس کی مذکورہ صراحت سے یہ مسئلہ صاف ہوچکا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل مختلف ہوجائے تو ہمیں اس حدیث پر عمل کرنا چاہیے جو بعد والی ہے۔

احناف کے نزدیک قبلہ رُخ ہوکر پہلی تکبیر کہنی چاہیے۔ اور دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاکر ناف کے نیچے باندھ لینا چاہیے۔ جس طرح دوسری نمازوں میں ہاتھ باندھتے ہیں۔

پھر ثنا پڑھیں۔ پھر دوسری تکبیر کہنے کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھیں۔ نماز جنازہ میں درود پڑھنے کے مسئلہ میں سارے ائمہ متفق ہیں اور سبھی حضرات درود کو موافق شرع شریف تصوّر کرتے ہیں۔

البتہ اختلاف اس بات میں ہے کہ درود نماز جنازہ میں رکن ہے یا سنّت۔ امام ابوحنیفہ النعمان اور امام مالک کے نزدیک سنّت ہے اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک رکن ہے۔

غرض درود رکن ہو یا سنّت دونوں صورتوں میں نماز جنازہ کا ایک اہم حصّہ جس کو ترک نہیں کیا جاسکتا

تیسری تکبیر کہنے کے بعد خلوصِ دل اور تضرع کے ساتھ میّت کے لیے دعا کرنی چاہیے اور نماز جنازہ کا اصل مقصود یہی دعا ہے اور یہ اپنے جانے والے بھائی، بہن کا ایک حق ہے۔ میت کے لیے دعا کرنے کے مسئلہ میں سارے ائمہ متفق ہیں اور اس کو فرض قرار دیتے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے نمازِ جنازہ کی کئی ایک دعائیں منقول ہیں اور یہ سب حدیثوں کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

آپ صلعم نے نماز جنازہ میں میّت کا نام اور اس کے باپ کا نام لے کر بھی دعا فرمائی ہے اور اگر کوئی شخص فلاں ابن فلاں کہہ کر نام کے ساتھ دُعا مانگے تو یہ صورت بھی جائز ہے۔ نماز جنازہ کی منقول دعا ومنثور دعاؤں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ کی روایت کردہ دعا میں بڑی جامعیت ووسعت وہمہ گیریت ہے۔ لہٰذا اسی کو یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاھِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا
وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَاُنْثَانَا
اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ
مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ۔ (ابوداؤد)

اے اللہ تعالیٰ! ہمارے زندہ و مردہ، ہمارے حاضر و غائب، ہمارے چھوٹے و بڑے، ہمارے مرد اور عورت سب کی مغفرت فرما۔

اے اللہ تعالیٰ! ہم سے جسے تو زندہ رکھے اُسے اسلام پر قائم رکھو اور جسے تو موت دے اُسے ایمان پر موت دے۔

میّت کے حق میں دُعا کرنے کے بعد چوتھی تکبیر کہے اور دونوں جانب سلام پھیرے۔ سلام کسی امام کے نزدیک فرض ہے تو کسی کے نزدیک واجب ہے اور کسی کے نزدیک صرف دائیں جانب ایک سلام ہے تو کسی کے نزدیک دونوں جانب سلام پھیرنا ہے۔ احناف کے نزدیک سلام واجب ہے اور دونوں طرف پھیرنا ہے۔ احناف کا طریقۂ نمازِ جنازہ صاحبِ ترمذی نے اس طرح بیان کیا ہے: الثناء علی اللہ والصلوٰۃ علی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم والدعاء للمیت: نمازِ جنازہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ ثناء، درود اور میت کے لیے دعا۔

نمازِ جنازہ سرًّا پڑھنا چاہیے اگرچہ کہ بعض احادیث سے جہرًا پڑھنے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مؤخر اور دائمی عمل اور صحابہ و تابعین اور سلف و خلف کا عمل سرًّا ہی رہا ہے۔ اور یہی احناف کا مسلک بھی ہے۔

نمازِ جنازہ میں مسلمانوں کا کثیر تعداد میں شریک ہونا میّت کے حق میں مفید ہے۔ اس سلسلہ کی یہ دو حدیثیں ملاحظہ کیجیے:

- ۹۔ عن عائشۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لایموت احد من المسلمین فیصلی علیہ امۃ من المسلمین یبلغوا ان یکونوا مائۃ فیشفعوا لہ الا شفعوا فیہ۔ (ترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس میّت کی نمازِ جنازہ میں ایک سو مسلمانوں نے شرکت کی تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو میّت کے حق میں قبول فرمائے گا۔

- ۱۰۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علیہ ثلثۃ صفوف فقد اوجب۔ (ترمذی)

جس نمازِ جنازہ میں مصلیوں کی تین صف ہوں تو اللہ تعالیٰ ضرور میّت کی مغفرت فرماوے گا۔

ان دو حدیثوں سے معلوم ہوا کہ نمازیوں کی کثرت اور تین صف کے باعث میّت کی مغفرت ہوگی۔
نمازِ جنازہ ممنوع اوقات کے علاوہ کسی بھی وقت میں پڑھی جا سکتی ہے اس کے لیے کوئی افضل یا مسنون وقت مقرر نہیں ہے۔ اور یہ ممنوع اوقات وہی ہیں جن میں نماز پڑھنا منع ہے۔ جس طرح ان اوقات میں نمازِ جنازہ ممنوع ہے۔ اسی طرح میّت کو دفن کرنا بھی ممنوع ہے۔ اس حدیث میں یہ مسئلہ مستفاد ہے۔

عن عقبۃ بن عامر الجھنی قال ثلث ساعات کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ینھانا ان نصلی فیھن او نقبر فیھن موتانا حین تطلع الشمس بازغۃ حتی ترتفع وحین یقوم قائم الظھیرۃ حتی تمیل وحین تضیف للغروب حتی تغرب

عقبہ بن عامر الجھنی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تین اوقات میں نمازِ جنازہ پڑھنے اور میّت کو دفن کرنے سے منع فرمایا۔ ایک وقت جب کہ آفتاب طلوع ہو رہا ہو۔ یہاں تک کہ وہ بلند ہو جائے۔ دوسرا وقت جب کہ وہ نصف النہار پر ہو۔ تیسرا وقت جب کہ وہ غروب ہو رہا ہو۔ یہاں تک کہ غروب ہو جائے۔
نمازِ جنازہ سے متعلق ایک اور اہم مسئلہ جو دورِ نبوّت میں پیش آیا تھا۔ وہ یہ کہ کسی شہر میں کوئی مسلمان انتقال کر جائے تو دوسرے شہر میں اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل رہا ہے کہ آپؐ نے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی ہے۔ چناں چہ حبشہ میں وہاں کا بادشاہ نجاشی انتقال کر گیا تو آپؐ کو اس کی اطلاع مدینۂ منوّرہ میں ملی یہ خبر سُن کر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ سے فرمایا: تمہارے بھائی نجاشی کا انتقال ہو گیا ہے لہٰذا تم سب کھڑے ہو جاؤ، ان کی نمازِ جنازہ پڑھو۔ چناں چہ اس حدیث کے راوی عمرانؓ کا کہنا ہے کہ ہم سب کھڑے ہو گئے اور صفیں باندھ لیں جیسا کہ نمازِ جنازہ میں میّت کے سامنے صفیں بناتے ہیں۔ پھر ہم بادشاہ نجاشی کی نمازِ جنازہ اسی طرح پڑھی جس طرح کہ سامنے رکھی گئی میّت پر نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں۔

• ۱۱۔ عن عمران بن حصین قال قال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اخاکم النجاشی قدمات فقوموا فصلوا علیہ۔ قال فقمنا فصففنا کما یصف علی المیت فصلینا کما یصلی علی المیت۔ (ترمذی)

نمازِ جنازہ غائبانہ طور پر ادا کرنے کے مسئلہ میں ائمۂ اربعہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفۃ النعمان کا کہنا ہے کہ نمازِ جنازہ غائبانہ نہیں پڑھی جا سکتی۔ میّت کا سامنے رہنا ضروری ہے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل صرف نجاشی کی ذات کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے کسی کی غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھی۔ لہٰذا یہ حکم عام نہیں ہے۔ ذالک مخصوص بالنجاشی فلا یلحق بہ غیرہ۔

اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا یہ قول ملتا ہے: کشف النبی صلی اللہ علیہ وسلم سریر النجاشی حتی راہ وصلی علیہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نجاشی کی میت پیش کی گئی اور آپ نے اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھا اور نماز ادا کی۔

احناف کا یہ بھی استدلال ہے کہ بادشاہ نجاشی کا انتقال ایک ایسے وقت اور ایک ایسی جگہ میں ہوا۔ جہاں ان کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی۔ اس لیے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔

اس مسئلہ میں امام مالک بھی امام ابوحنیفۃ النعمان کے ہم خیال اور ہم عمل ہیں۔ البتہ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک نماز جنازہ غائبانہ ادا کی جا سکتی ہے۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی نماز جنازہ ادا فرمائی لہٰذا اس حدیث کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے تخصیص پر محمول کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

حنفی اور مالکی اشخاص کسی شخص کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرنا چاہیں اس کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ افراد کسی حنبلی یا شافعی امام کی اقتداء میں نماز جنازہ غائبانہ ادا کرسکتے ہیں اور اس پر عمل کرنے میں چنداں قباحت نہیں ہے۔

نماز جنازہ سے متعلق موجودہ زمانہ میں ایک مسئلہ یہ بھی کھڑا ہو گیا ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا چاہیے یا نہیں؟

بعض مقامات پر یہ عمل دیکھنے میں آتا ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی اور جہری دعا کی جاتی ہے اور بعض مقامات پر امام بلند آواز سے الفاتحہ کہتا ہے پھر امام اور مصلی حضرات سِرّی طور پر سورۃ الفاتحہ اور سورۃ الاخلاص کی تلاوت کرتے ہیں پھر امام جہری دعا کرتا ہے۔ اور بعض مقامات پر یہ عمل دیکھنے میں آتا ہے کہ نماز جنازہ کے بعد کوئی دعا نہیں ہوتی۔

عمل کی یہ مختلف صورتیں اپنی اپنی حیثیت سے صرف مستحسن کہی جا سکتی ہیں۔ ان کو حرام یا واجب کے خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ اعمال اس وقت غیر مستحسن ہو سکتے ہیں۔ جب کہ ان کی ادائیگی یا ممانعت میں شدّت اختیار کریں جیسا کہ یہ منظر مختلف جگہوں میں دکھائی دے رہا ہے۔ یہ حقیقت ہمیں فراموش نہ کرنی چاہیے کہ غلو و تشدّد اور تعصب و انکار دونوں بھی علمی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے غیر محمود پہلو ہیں۔

نماز جنازہ کے بعد دعا کے مسئلہ میں حدیث وفقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں کچھ مثالیں ملتی ہیں، جن کی روشنی میں دعا کا عمل محمود نظر آتا ہے۔ لیکن دعا کو ممنوع قرار دینے کے لیے کوئی مستند قول نظر نہیں آتا۔ اہل علم کا جو طبقہ نماز جنازہ کے بعد دعا کا قائل نہیں ہے، اس کا استدلال یہ ہے کہ نمازِ جنازہ ہی دعا ہے پھر مزید دعا تحصیل حاصل ہے اور یہ دین میں بدعت ہے۔ لہٰذا اس کا ترک کرنا واجب ہے۔ لیکن راقم الحروف کے خیال میں یہ موقف کسی قدر کمزور ہے کیوں کہ نماز جنازہ محض دعا ہی نہیں بلکہ وہ ایک نماز بھی ہے۔ اگر وہ محض دعا ہی ہوتی تو اس کے لیے وضو اور تکبیر تحریمہ کی چنداں ضرورت نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ دُعا بے وضو بھی درست ہے۔ اور بلا شبہ یہ نماز ہے محض دعا نہیں۔ ورنہ اس کو جنازہ کی نماز کی بجائے جنازہ کی دعا کا نام دینا چاہیے۔ علاوہ ازیں بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے خود نمازِ جنازہ کے بعد دعا کی ہے۔ ایسی صورت میں اس کو بدعت کہنا بھی ایک قسم کی زیادتی ہے۔ امام بیہقی کی روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت براء بن عازبؓ کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی اور اس کے بعد یہ دعا فرمائی: اللّٰھم اغفرہ وارحمہ وادخلہ جنتک: اے اللہ! اس کی مغفرت فرما اور اس پر رحم و کرم فرما اور اس کو اپنی جنت میں داخل فرما۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک میّت پر نمازِ جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہ دعا فرمائی:

• ۱۲ ۔ اللّٰھم ان فلان ابن فلان فی ذمتک ادخل فی جوارک فقہ فتنۃ القبر وعذاب النار وانت اھل الوفاء والحق۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ انک انت الغفور الرحیم۔

اے اللہ! یہ فلاں ابنِ فلاں ہے جو تیرے ذمہ میں ہے۔ تو اسے اپنے جوارِ رحمت میں داخل فرما، اسے قبر کے فتنہ و آزمائش سے بچالے اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھ تو دعاؤں کا سننے والا اور وعدہ پورا کرنے والا ہے۔

اے اللہ! اس میّت کی مغفرت فرما اور اس پر رحم و کرم فرما بلاشبہ تو غفور اور رحیم ہے۔

شمس العلماء اعلیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب قادری، بانیٔ مدرسۂ باقیاتِ صالحات، ویلور اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں:

"نمازِ جنازہ کے بعد میّت کے سر طرف سورۂ بقرہ کی شروع کی دو آیات الٓمٓ سے مفلحون تک اور پاؤں کی طرف سورۂ بقرہ کی آخری دو آیات اٰمن الرسول سے الکافرین تک پڑھنا مستحب ہے۔

اور بعض حدیثوں میں اس کو دفن کے بعد پڑھنا مذکور ہے۔ نمازِ جنازہ کے بعد بھی بعض دعاؤں کا پڑھنا ثابت ہے چنانچہ "بحر ذخار" میں مرقوم ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد یہ دعا پڑھی جائے۔ اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ واغفرلنا ولہ۔

مانعین حضرات نمازِ جنازہ ہی کو دعا اور نماز کے بعد کی دعا کو امرِ زائد اور بدعت کا نام دینے کی بجائے سدِّ باب کے طور پر اس مسئلہ کی تشریح فرماتے تو یہ ایک فقہی اور مفید موقف ہو سکتا تھا۔ اور قائلین کے موقف سے عوام میں دعا سے متعلق وجوب اور التزام کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے وہ کسی قدر کم ہو سکتی تھی اور قائلین حضرات بھی اس مسئلہ میں شدت سے عمل کرنے کی بجائے گاہے عمل اور گاہے ترک کی روش اختیار کر لیتے تو نمازِ جنازہ کے بعد کی یہ دعا ایک معمول اور رواج کی شکل اختیار نہ کرتی اور ایک غیر لازم چیز ملزوم اور وجوب کا درجہ اختیار نہ کر لیتی۔

دعا بعد نمازِ جنازہ کے بعد اب ہم ایک مسئلہ کی جانب رجوع ہوتے ہیں، جو آج بڑی شدّت کے ساتھ ابھرا ہوا ہے اور وہ ہے مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا مسئلہ۔

اس مسئلہ میں بعض اہلِ علم کا رویہ کسی قدر سخت گیر اور تشدّد خیز ہے کہ وہ مسجد میں نمازِ جنازہ کو مطلق

صحیح نہیں سمجھتے ہیں اور پوری شدت کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنے سے روکتے ہیں۔ ان حضرات کرام کی یہ اصلاحی جدوجہد بسا اوقات مسلمانوں کے درمیان باہمی دشمنی و عداوت اور فتنہ و فساد اور تفریق و اختلاف کی صورت اختیار کر جاتی ہے حالاں کہ احادیث میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے اور اس میں موقع و محل اور ضرورت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ مسئلہ بعض حالات میں جواز کا پہلو اور بعض حالات میں عدم جواز کا پہلو رکھتا ہے۔ تاکہ نماز جنازہ ادا کرنے میں کسی قسم کی تنگی اور حرج کی صورت پیدا نہ ہوسکے۔

اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔ اس موقف کی تائید میں امام ترمذی کی حدیث سے ہوتی ہے۔

۱۳۔ عن عائشہ قالت صلے اللہ علیہ وسلم علی سھل بن البیضاء فی المسجد

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء نامی خاتون کے لڑکے سہل کی نمازِ جنازہ مسجد کے اندر پڑھی۔

امام ترمذی مذکورہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ھذا حدیث حسن العمل علی ھذا عند بعض اھل علم وقال الشافعی یصلی علی المیت فی المسجد واحتج بھذا الحدیث۔

یہ حدیث شریف حسن ہے اور اس پر بعض اہلِ علم کا عمل ہے۔ وہ مسجد کے اندر نماز جنازہ کو صحیح سمجھتے ہیں اور امام شافعی بھی اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی مسجد میں نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔

امام شافعی کے علاوہ امام احمد بن حنبل اور بعض محدثین مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور محمد عاصم الحداد نے 'فقہ السنہ' میں حضرت عروہ اور عبداللہ بن عمر کی روایت سے یہ بات نقل کی ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق اور خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب کی نماز جنازہ مسجد ہی میں پڑھی گئی۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس موقف کے حامی اور طرف دار امام ابوحنیفۃ النعمان اور امام مالک ہیں۔

امام ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے ان کے ہاں کہلا بھیجا کہ حضرت سعد کے جنازہ کو مسجد میں لائیں تاکہ وہ اور دیگر ازواج مطہرات بھی ان کی نمازِ جنازہ پڑھ سکیں۔ جب ازواج مطہرات نے نماز جنازہ پڑھی تو حضرات صحابہ نے ان کے اس فعل کو غلط قرار دیا اور یہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کان تک پہنچی تو آپ رضؓ نے فرمایا: یہ کس قدر تعجب خیز بات ہے کہ لوگ ہمارے اس فعل کو غلط سمجھ رہے ہیں۔ حالاں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے صاحب زادے کی نمازِ جنازہ مسجد ہی میں پڑھی تھی۔

• ۱۴۔ لما توفی سعد بن ابی وقاص قالت عائشہؓ ادخلوا بہ المسجد حتی اصلی

علیہ فانکر ذلک علیھا۔ فقالت واللہ لقد صلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ابن بیضاء فی المسجد۔ (ترمذی)

اسی حدیث سے عدمِ جواز کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا سہل کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھنا ضرورت پر مبنی تھا۔ کیوں کہ اس وقت بارش ہو رہی تھی اور آپؐ مسجد میں معتکف تھے۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمل کو صحیح نہیں کہنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد میں دائمی طور پہ نماز جنازہ نہ پڑھنا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ یہ ضرورت پر مبنی مسئلہ تھا۔ اس کو عمومی دائمی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ جیسا کہ یہ موقف جامع الترمذی کے حاشیہ میں بیان کیا گیا ہے۔ فلنا اولاً واقعہ حال لاعموم لھا فیجوز کون ذلک کان لضرورۃ کونہ معتکفا ولو سلم عدمھا فانکارھم وھم الصحابۃ والتابعون دلیل علی ان الامر استقر بعد ذلک علی ترکہ

غرض اہلِ سنّت جماعت کے چار اماموں میں سے دو حضرات کرام امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک مسجد میں جنازہ پڑھنا جائز ہے اور دو حضرات کرام امام ابوحنیفۃ النعمان اور امام مالک کے نزدیک مسجد میں جنازہ پڑھنا مکروہ ہے اور جب کسی مسئلہ میں ائمۂ اربعہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو اس اختلافی صورت کو رحمت خیال کرنا چاہیے اور یہ خیال کرنا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ ان حضرات کرام نے اپنے اجتہادات اور استنباطات کے ذریعہ امت کے لیے عمل میں وسعت اور سہولت پیدا کر دی اور خانۂ دین کے لیے ایک سے زائد دروازے کھول دے تاکہ حالت و ضرورت اور سہولت کے مدّنظر جس دروازے سے چاہیں داخلہ آسان ہو جائے: ولکل وجھۃ ھو مولیھا فاستبقوا الخیرات۔

اور اختلافی مسائل کے اندر کسی مسئلہ کے ایک ہی پہلو کو حق و صواب کہنا اور دوسرے پہلو کو باطل و خطا کہنا اور ایک ہی پہلو پر عمل کرنے کے لیے سختی کرنا مسائل کے اندر تنگی اور حرج پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ ایسے مسائل و احکام کو حالات و ضروریات اور سہولیات کے خانہ میں رکھنا چاہیے اور اختلافی مسائل میں باہم ایک دوسرے پر لعن طعن اور تشنیع و تضلیل سے احتراز کرنا چاہیے۔ اور ہر ایک کو اس اس کے موقف پہ چھوڑ دینا چاہیے اور توقف و احتیاط اور اعتدال و میانہ روی کو ہر حال میں برقرار رکھنا چاہیے اور غلو و تشدّد اور تعصب و انکار ہر دونوں روش سے اجتناب کرنا چاہیے۔ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا: تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت کے راستے پر ہے۔

اس مسئلہ پر عمل کی بہترین صورت یہ ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ نہ پڑھنا اولیٰ اور افضل ہے اور حتی الامکان احتراز کرنا چاہیے تاکہ مسجد میّت کی نجاست سے آلودہ ہو جانے سے محفوظ رہ سکے اور اس حدیث پر بھی عمل ہو جائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جس نے کسی میّت کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی تو اس کے لیے کوئی ثواب نہیں ہے۔ لہٰذا نمازِ جنازہ پڑھنے

کے لیے ایک خاص جگہ کا انتظام کرنا چاہیے۔ جیسا کہ دورِ نبوّت میں موضع الجنائز (جنازہ کے لیے مقرر کردہ جگہ) کے نام سے نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے مسجد سے علاحدہ ایک جگہ مقرر تھی۔ اور اسی میں سارے جنازے لائے جاتے تھے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم موضع الجنائز میں جنازوں کی نماز پڑھاتے تھے۔ جیسا کہ یہ تفصیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ نے بیان کی ہے۔
موضع الجنازہ بالمدینۃ خارج من المسجد وھو الموضع الذی کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی علی الجنازہ۔

غرض مسجد میں نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کی صورت میں نبیٔ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر عمل ہو جائے گا اور حضرات صحابہ کے تعامل پر بھی عمل ہو جائے گا اور میّت کو اجر و ثواب بھی مل جائے گا۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ جب کہ مساجد سے متصل خالی جگہ نہ ہو اور قبرستان سے متصل میدان نہ ہو اور قریب نہ ہو اور موضع الجنائز کا تعین و تقرر مشکل ہو۔ جیسا کہ آج کل یہ صورتِ حال اکثر شہروں میں موجود ہے۔ اور بالخصوص بڑے شہروں میں فرض نمازوں کے لیے مساجد ناکافی ہو رہی ہیں اور ان کی توسیع کی بجائے ترفع اور بلندی کی صورتیں نکالی جا رہی ہیں۔ ان حالات میں مسجد میں نمازِ جنازہ ادا کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے اور جواز کی یہ صورت بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل سے نکل رہی ہے۔ کہ آپؐ نے حضرت سہل کی نمازِ جنازہ مسجدِ نبوی میں پڑھائی۔ البتہ اس صورت میں یہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے کہ جنازہ کے نیچے کوئی ایسی چیز رکھ دی جائے جس کی وجہ سے میّت کی نجاست مسجد میں گرنے نہ پائے اور اس موقف کی تقویت اور تائید کے لیے حضرت ابوہریرہ کی حدیث بھی معاون ثابت ہو رہی ہے۔ چناں چہ آپ کی روایت کردہ حدیث فلا شی لہ (مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے سے کوئی ثواب نہیں) ان الفاظ کے ساتھ بھی موجود ہے۔ فلا شی علیہ یعنی (مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

غرض جب اس مسئلہ میں جواز و عدمِ جواز اور کراہتِ تحریمی و کراہتِ تنزیہی کی صورت پیدا ہو گئی ہے تو مسجد میں نمازِ جنازہ کو مطلق ممنوع قرار دینے سے اجتناب کرنا چاہیے اور اس میں سختی و شدت سے احتراز کرنا چاہیے۔

راقم الحروف کے آبائی شہر اور وطنِ اصلی ادھونی (ضلع کرنول، آندھرا پردیش) کے اندر مساجد کے صحن میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی روایت و عادت عرصۂ دراز سے چلی آ رہی ہے۔ چند سالوں سے بعض اہلِ علم کی مسلسل کوشش رہی کہ صحنِ مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے سے روک دیا جائے۔ مگر یہ کوشش بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔

ماہ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۱ر اگست 1993ء روز چہار شنبہ عصر کے وقت میرے والدِ ماجد حضرت مولانا منشی محمد نور قریشی اشرفی، سابق امام شاہی جامع مسجد ادھونی، نور اللہ مرقدہٗ دنیا فانی سے کوچ کر گئے اور اس کے دو تین گھنٹے بعد مغرب کے وقت میری والدۂ ماجدہ حضرت معصوم بی صاحبہ نور اللہ مرقدھا بھی دارِ فانی سے رحلت کر گئیں۔ دوسرے دن جمعرات کو بعد نمازِ ظہر شاہی جامع مسجد میں دونوں کی نمازِ جنازہ کا اعلان

کیا گیا۔ نمازِ جنازہ ادا کرنے کے وقت پر میرے عمِ محترم حضرت منشی عبد الحق قریشی نور اللہ مرقدہٗ نے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا کہ صحنِ مسجد میں نمازِ جنازہ نہیں ہونی چاہیے اور میں یہ بات عرصۂ دراز سے مساجد کے متولیانِ کرام اور ائمۂ کرام سے کہتے آرہا ہوں لیکن کوئی بھی گوش برآواز نہ ہوا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: تم اپنے والدین کی نمازِ جنازہ صحنِ مسجد میں ادا نہ کریں۔ عمِ محترم کی تحریک اور ترغیب پر میں نے والدینِ کریمین کی نمازِ جنازہ مسجد کے صحن سے متصل ایک وسیع عریض میدان میں پڑھائی۔

اس واقعہ کا یہاں ذکر کرنے سے منشاء اور مقصد یہ ہے کہ یہ مسئلہ شہر ادھونی میں سخت اختلاف کا شکار تھا اور اس کی وجہ سے باہمی نفرت و عداوت اور ذاتیات پر حملہ کی فضا پھیل چکی تھی۔ ایک ایسا مسئلہ جو ائمۂ اربعہ کے درمیان مختلف فیہ ہے اور اس میں جواز کا پہلو بھی موجود ہے تو پھر ایسی فضا پیدا ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ اہلِ علم کا اختلافی مسائل میں "متشدد" ہونا ہے اور عوام کا علماء کے اختلافات میں دخل انداز ہونا ہے۔ اسی لیے اکابرِ امّت اور صلحائے امّت نے عوام کو علمی اور فقہی اختلافات میں دخل دینے اور بحث کرنے سے منع کیا اور اہلِ علم کو اختلافی مسائل میں سخت گیر رویہ اختیار کرنے سے منع کیا تاکہ احکام پر عمل کرنے میں آسانی اور سہولت پیدا ہو جائے اور تشدّد کے نتیجے میں تعصب (طرف داری) کا ماحول پیدا نہ ہو جائے۔

حاصلِ کلام! نمازِ جنازہ کا ادا کرنا ہمارے خونی و اسلامی بھائی اور بہن کا ایک واجبی حق ہے۔ جس کی ادائگی میں کوتاہی اور پہلوتہی نہیں کرنا چاہیے۔ اور اس حق کو پورا کرتے ہی انتقال کنندہ سے ربط و تعلق کا باب بند نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کی تدفین میں شریک رہنا چاہیے اور تدفین کے بعد بھی اس کے حق میں ثابت قدمی اور مغفرت کی دعا کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہیں سے اس کی برزخی زندگی کی شروعات ہو جاتی ہے اور قبر آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔ بعض مقامات پر تدفین کے بعد دعا کو بدعت اور ایک غیر ضروری عمل سمجھتے ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے بلکہ دعا وغیرہ کے بعد میّت کو مخاطب کرتے ہوئے ثابت قدمی کے کلمات کہنا بھی ایک مفید عمل ہے۔ جیسا کہ صوبۂ ٹمل ناڈو کے بعض شہروں میں تلقین کے عنوان سے جاری ہے۔

اس سلسلہ میں محمد عاصم الحداد کا یہ بیان ملاحظہ کیجیے:

حضرت عثمان سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب میّت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس ٹھہرتے اور لوگوں سے فرماتے کہ اپنے بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو۔ اس لیے کہ اس وقت اس سے سوال ہوگا۔

حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک دعا اور قرآن خوانی کے لیے قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا مستحب ہے جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جا سکے۔ بعض اہلِ حدیث علماء نے بھی اس کو مستحب قرار دیا

ہے۔ اس بارے میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث نہیں آئی۔ البتہ حضرت عمرو بن عاص نے اپنی وفات کے وقت اس کی وصیّت فرمائی تھی۔

شافعیہ اور اکثر حنبلیہ کے نزدیک تدفین سے فارغ ہو کر میّت کو مخاطب کر کے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرنا مستحب ہے۔ اس بارے میں بعض احادیث بھی آئی ہیں۔ جن کے قابلِ حجّت ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ دوسرے مذاہب کے علماء کا ان پر عمل نہیں ہے۔ (فقہ السنّہ)

تدفین سے واپس ہونے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس کی قبر پر حاضری دینا چاہیے۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں آدمی کسی کی قبر سے گزرے جس کو وہ پہچانتا تھا تو صاحبِ قبر اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

● ۱۵۔ عن ابی ھریرۃ قال اذا مر الرجل بقبر یعرفہ فیسلم علیہ رد علیہ السلام۔

ابنِ عیینہ کے ماموں کے صاحب زادے فضل فرماتے ہیں:

جب میرے والد کا انتقال ہو گیا تو مجھے انتہائی رنج و غم لاحق ہوا۔ میں ان کی قبر پر روزانہ بلا ناغہ حاضری دیتا رہا۔ پھر کچھ دن تک نہ جا سکا۔ ایک روز ان کی قبر پر پہنچا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اتفاق سے نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ والد صاحب کی قبر شق ہو گئی ہے۔ اور وہ قبر کے اندر کفن میں لپٹے بیٹھے ہیں۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور میری آنکھ سے آنسو ابل پڑے۔ والد صاحب نے مجھ سے پوچھا: میرے بیٹے! کیا تمہیں اتنے دنوں کے بعد ادھر آنے کا خیال ہوا؟ میں نے کہا: ابا جان! کیا میرا آنا جانا آپ کو معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا: تم جب بھی یہاں آئے، تمہارے آنے سے میں باخبر ہو گیا۔ تمہارے آنے سے اور تمہاری دعاؤں سے نہ صرف میں بلکہ یہاں آس پاس کے لوگ بھی خوش اور مانوس ہوتے ہیں۔

اس خواب کے بعد میں نے کبھی والد صاحب کی زیارت کے لیے کوتاہی نہیں کی۔

زیارتِ قبور کا مسئلہ بہت ہی معروف اور واضح ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ہر ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ قبور کی زیارت کرنی چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ وہ جمعہ کا دن ہو۔ اور جب کوئی شخص زیارتِ قبور کا ارادہ کرے تو اس کے مستحب اور مستحسن ہے کہ وہ اپنے گھر میں دو رکعت نفل نماز ادا کرے اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور آیت الکرسی اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھے۔ پھر اس کا ثواب میّت کو پہنچائے تو اللہ تعالیٰ میّت کی قبر میں ایک نور بھیجتا ہے اور نماز پڑھنے والے کو کثیر ثواب عطا فرماتا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر ایصالِ ثواب کے بعد مقابر کی طرف روانہ ہو جائے۔

بزرگانِ کرام اور صالحینِ عظام کی مزارات کی زیارت کے لیے سفر کر کے جانا بھی جائز ہے۔ (علم الفقہ: فتاویٰ عالمگیری)

۱۶۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا"
میں نے تمہیں قبروں کی زیارت کرنے سے منع کیا تھا۔ اب اس کی اجازت دے رہا ہوں۔ تم قبور کی زیارت کرو۔
ایک دوسری حدیث میں زیارت کی غرض بھی ان الفاظ میں بیان کی گئی۔ فانھا تذکرکم الآخرہ قبور کی زیارت کرنے سے تمہارے دلوں میں آخرت کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود قبور کی زیارت فرمائی اور اہلِ قبور کے حق میں دعا فرمائی اسی بنیاد پر فقہاء نے زیارتِ قبور کو مسنون اور مستحب قرار دیا ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف یہ ہے کہ حدیث میں زیارتِ قبور کی جو اجازت دی گئی ہے کیا یہ صرف مردوں کے ساتھ مخصوص ہے یا عورتیں بھی اس میں شامل ہیں؟ ایک طائفہ کا کہنا ہے کہ یہ اجازت صرف مردوں کو ہے، عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ کیوں کہ ایک دوسری حدیث میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔ لعن اللہ زائرات القبور۔
فقہاء کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ زیارتِ قبور کا حکم مطلق دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس اجازت کے اندر مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔
اس مسئلہ میں بعض فقہاء کا محتاط موقف یہ ہے کہ جوان عورتوں کے لیے اجازت نہیں ہے البتہ معمر عورتوں عبرت و نصیحت کے لیے زیارت کرنا چاہتی ہیں تو ان کے لیے اجازت ہے۔ اور اگر فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو اور خلافِ شرع امور صادر ہونے کا خدشہ ہو تو عورتوں کے لیے زیارتِ قبور ممنوع ہے۔ چناں چہ اسی علت کی وجہ سے عورتوں کو مساجد میں آکر فرض نماز ادا کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔
جب کسی کی قبر کی زیارت کے لیے جائیں تو تمام مُردوں کو بھی سلام کرنا چاہیے۔ اور سب کے لیے بھی دعائے مغفرت کرنی چاہیے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ تلقین کردہ دعا بہت معروف ہے:
اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ ۔ اِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ ۔ اَنْتُمْ فَرَطُنَا وَنَحْنُ لَكُمْ تَبَعٌ وَنَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمْ وَالْعَافِيَةَ ۔
اے اس دیار کے مومن و مسلمان، تم پر سلامتی ہو۔ ان شاء اللہ ہم بھی تم سے آکر ملنے والے ہیں۔ تم ہم سے پہلے جا چکے ہو اور ہم تمہارے بعد اسی دیار میں آرہے ہیں۔ ہم اللہ سے تمہارے لیے اور ہمارے لیے عافیت چاہتے ہیں۔
امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے قبرستان کے پاس سے گزرتے تو آپ ان کی جانب متوجہ ہوکر یہ دعا پڑھا کرتے تھے:
اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ . اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ۔

رحلت کردہ اشخاص کی زیارت کے علاوہ ان کے حق میں دعائے مغفرت اور صدقات و خیرات کا سلسلہ بھی جاری و ساری رکھنا چاہیے۔ ایک حدیث میں کہا گیا ہے۔کہ میت کو تین صورتوں سے فائدہ پہنچ سکتا ہے:

• ۱۷۔ اذا مات الانسان انقطع عمله الامن ثلث صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوله۔

پہلی صورت : صدقہ جاریہ مثلاً مسجد، مدرسہ، سرائے، ہسپتال، غریبوں کے لیے مکانات، دانش گاہ کی تعمیر اور دیگر رفاہِ عام کے کام کا ثواب میت کو پہنچایا جا سکتا ہے۔

دوسری صورت : علم دین کی اشاعت۔ جیسے درس و تدریس، دعوت و تبلیغ، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لائبریری، کتابوں کی اشاعت وغیرہ کا عمل میت نے اپنی زندگی میں انجام دیا ہو۔

تیسری صورت : نیک اور صالح اولاد جو اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔

• ۱۸۔ ان ام سعد ماتت سئل النبی صلے اللہ علیہ وسلم ای صدقة افضل؟ قال اسق الماء۔

سعید بن مصیب کی روایت ہے کہ سعید رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: میری والدہ انتقال کر گئی ہے، ان کے ایصالِ ثواب کے لیے کون سا صدقہ افضل ہے؟ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: پانی!

اس حدیث میں پانی صدقہ کرنے کا حکم موجود ہے۔ جو اس وقت پانی کی شدید قلت تھی۔ اسی سے یہ قیاس صحیح ہے کہ ہر انسانی ضرورت کی چیز کی فراہمی بھی صدقہ ہے۔

فقہ کی معروف کتاب "بحر الرائق" میں مرقوم ہے:

صام او صلیٰ او تصدق وجعل الثواب لغيره من الاحياء والاموات يصل ثوابه اليهم عند اهل السنة والجماعة۔

اہلِ سنّت و جماعت کے پاس مالی اور بدنی عبادتوں کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ مولانا شاہ اسحاق دہلوی "مسائلِ اربعین" میں فرماتے ہیں:

علمائے حنفیہ کے نزدیک مالی اور بدنی عبادات کا ثواب اموات کو پہنچتا ہے۔ چناں چہ "ہدایہ" میں مرقوم ہے:" اہلِ سنّت جماعت کے نزدیک ایک شخص اپنے عمل کا ثواب کسی دوسرے شخص کو پہنچا سکتا ہے۔ جیسے نماز، روزہ، صدقہ، حج، اعتکاف، تلاوتِ قرآن، ذکر وغیرہ۔ مالی عبادات کا ثواب میت کو پہنچنے کے مسئلے میں سب فقہا متفق ہیں۔ بدنی عبادات کا ثواب میت کو پہنچنے کے مسئلہ میں فقہا کا اختلاف ہے۔

درسِ نظامیہ کی معروف نصابی کتاب ''شرح عقائد نسفی'' میں علّامہ تفتازانی فرماتے ہیں:

احادیث میں اموات کے لیے دعا کرنے کا حکم ہے اور بالخصوص نمازِ جنازہ میں میّت کے لیے دعا کرنے کی تاکید ہے اور اس پر سلف کا عمل تواترث اختیار کر گیا ہے۔ اگر اس عمل میں اموات کے لیے کوئی نفع نہ ہوتا تو یہ حکم اپنے اندر کیا معنی رکھتا ہے؟

زندوں کی جانب سے مردوں کو صدقہ و خیرات اور دعا کا نفع اور ثواب پہنچتا ہے۔

''زاد الآخرۃ'' کے مصنف لکھتے ہیں:

مومن کے لیے قبر کی آزمائش سات دن تک ہے۔ اور گنہ گار کے لیے چالیس دن تک ہے۔ اگر میّت کے گھر والے صاحبِ استطاعت ہوں تو چالیس روز تک ایصال ثواب کی نیت سے میّت کے حق میں صدقہ و خیرات کرتے رہیں۔ اور اگر صاحبِ استطاعت نہ ہوں تو سات روز تک صدقہ کرتے رہیں ورنہ کم از کم تین روز تک صدقات و خیرات کا ضرور اہتمام کرنا چاہیے۔

مذکورہ وضاحتوں سے یہ حقیقت آشکار ہو چکی کہ میّت کے لیے ایصالِ ثواب اور صدقہ و خیرات کے عمل میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ صدقہ اپنے اصل کے اعتبار سے جائز ہے اور تخصیص کے اعتبار سے بدعت ہے۔ اور اس مسئلہ میں شرعی قباحت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ نفلی اور غیر واجبی صدقات کو واجب قرار دیں اور ان کی ادائیگی میں التزام کا پہلو اختیار کریں اور ایام کی تخصیص کو ضروری اور ثواب کی زیادتی تصوّر کریں اور صدقات کو مختلف عناوین اور شکلوں میں ڈھال کر ان کے اندر غیر شرعی امور کو شامل کر لیں تو یہ طرزِ عمل مفسدات اور منکرات کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ اس موضوع کی وضاحت کے لیے درجِ ذیل فتویٰ کافی اور شافی ہے جو حضرت مولانا سید محمد قادری دامادِ حضرت قطب ویلور کے قلم سے صادر ہوا ہے جس کی تصدیق و توثیق مولانا شاہ عبد الوہاب قادری ویلوری بانی مدرسہ باقیات صالحات ویلور نے فرمائی ہے:

فاتحہ کے اندر تعینِ اوقات بہ نیّتِ خیر ہے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔ التزام ناجائز کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو لازم اور ضروری خیال کریں۔ اور کبھی بھی اس کو ترک نہ کریں۔ یا تعین ہی میں حصول ثواب یا زیادتی ثواب سمجھیں اور ترک کرنے میں عدم ثواب یا ثواب میں کمی سمجھیں۔ مثلاً کسی شخص کے انتقال کے تیسرے دن دعائے مغفرت، دوسرے یا چوتھے دن یا کسی بھی دن ہو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں۔

لیکن یہ لازم کر لینا اور ضروری سمجھ بیٹھنا کہ انتقال کے تیسرے دن ہی زیارت کرنا چاہیے، اس سے قبل یا بعد نہیں کر سکتے یا ثواب نہیں ہوگا۔ یہ چیز ناجائز ہے۔

حاصلِ کلام!

چند احادیث کی روشنی میں نمازِ جنازہ کے متعلق بعض اہم مسائل اور احکام کی ضروری و مفید تشریحات بیان کی گئیں اور ان پر یہ سلسلہ بھی اختتام پذیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کلمات کو قبول فرمائے اور خاص و عام کے لیے مفید اور نافع بنائے۔ اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔ آمین بجاہ سید المرسلین وآلہ الطیبین واصحابہ الطاھرین ومن تبعھم الی یوم الدّین۔۔۔

نعت النبیؐ

علیم صبؔا نویدی

سایہ افگن چار سو ہے روئے انوارِ نبیؐ
ذرّہ ذرّہ سرفراز بوئے انوارِ نبیؐ

میری آنکھوں کی شعاعوں کا سفر ہے نا تمام
کون لے جائے گا مجھ کو سوئے انوارِ نبیؐ

خاک نورانی، زمین و آسماں عنبر فشاں
ہر کلی، ہر پھول میں خوشبوئے انوارِ نبیؐ

دھڑکنوں میں دوڑتی پھرتی لہو کی بوند کو
ہر نفس ہے جستجوئے کوئے انوارِ نبیؐ

خامۂ فکرِ صبؔا پر شاہِ دیںؐ کا ہے کرم
اور دل میں موجزن ہے جوئے انوارِ نبیؐ



ایک اہم فتویٰ

ادارہ

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مولوی سید حمید اشرف کچھوچھوی علیہ الرحمہ، سابق مدرس دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور نے پچیس۲۵ سال قبل یہ فتویٰ تحریر فرمایا تھا۔ جو حضرت مولانا سید ہلال احمد قادری صاحب نائب ناظم دار العلوم کی وساطت سے دستیاب ہوا۔ اسے ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے۔ اس فتویٰ میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مولوی محمد علوی ملیباری علیہ الرحمہ اور مولانا مولوی سید ابو المکارم مصطفیٰ حسین بخاری کڈپوی سابق استاذ دار العلوم لطیفیہ کی تصدیق اور دستخط ہے۔

سوال

۱ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کسی بزرگ یا عالمِ دین اور بادشاہِ اسلام کو اعلیٰ حضرت کہنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کس دلیل سے؟

۲ زید کہتا ہے کہ صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تو صرف حضرت ہی کہا جائے اور غیر رسول کو اعلیٰ حضرت کہا جائے۔ اعلیٰ حضرت صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ غیر رسول کو اعلیٰ حضرت کہنا جائز نہیں۔ کیا یہ رسول سے بڑھ گئے؟ زید کے اس قول کا کیا جواب ہے۔ بینوا و توجروا

السائل: محمد عمران قادری

الجواب اللّٰہم ہدایۃ الحق والصواب

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔

درصورت مسئولہ، قاعدہ اور اصول کی بات یہ ہے کہ جو کسی بزرگ، یا عالم یا بادشاہِ اسلام کے لیے لفظِ اعلیٰ حضرت کا اطلاق و استعمال ناجائز کہے وہ عدمِ جواز کی دلیل پیش کرے اور جب عدمِ جواز پر کوئی دلیل نہیں۔ نہ قرآن و حدیث سے مخالفت نہ اجماعِ امت و قیاس سے مخالفت، تو بقاعدہ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ۔ یعنی تمام چیزوں میں اصل و ضابطہ یہ ہے کہ وہ حلال و جائز ہے۔ البتہ اگر شریعت منع کردے۔ تب حرمت یا عدمِ جواز ثابت ہوگا بلکہ کراہت کے ثبوت کے لیے بھی دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔

بغیر دلیلِ شرعی کراہت کا ثبوت نہیں ہو سکتا جیسا کہ شامی جلد اول بیان المستحب والسنۃ وا میں ہے لان الکراہۃ حکم شرعی فلا بدلہ من دلیل من دلیل خاص۔ تو جب کراہت کا ثبوت بھی بلا دلیل نہیں ہو سکتا تو عدم جواز یا حرمت کا ثبوت بلا دلیل کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ کسی شئے کے جواز کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ شرع نے اس کی ممانعت ثابت نہیں ہے۔ جیسا کہ شامی بحث تعریف سنت میں ہے المختار ان الاصل الاباحۃ عند الجمهور من الحنفیۃ والشافعیۃ۔

۲۔ زید کا یہ خیال کہ اعلیٰ حضرت کا لفظ صرف رسول کے لیے استعمال کیا جائے۔ غیر رسول کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں۔ اس کی کوئی سند قرآن وحدیث یا دیگر ادلہ سے نہیں ملتی۔ ادلہ اربعہ میں کہیں صراحتاً یا کنایۃً یہ نہیں ہے۔ کہ یہ لفظ رسول کے لیے خاص ہے۔ اگر کہیں ہو تو پیش کیجیے۔ بلکہ زید کے مفروضہ کی بناء پر تو لازم آتا ہے۔ کہ جس طرح غیر رسول کے لیے لفظ اعلیٰحضرت کا اطلاق ناجائز ہے۔ اسی طرح رسول کے لیے بھی اعلیٰحضرت کا اطلاق ناجائز ہو۔ کیوں کہ سب سے اعلیٰ وارفع ذات تو اللہ تعالےٰ کے لیے ہے۔ کیا رسول کی ذات خدا سے بڑھ کر ہے۔ جو آپ کو اعلیٰحضرت کہا جائے؟ تو جب خدا اور رسول میں بے شمار فرق مراتب کے باوجود زید کے نزدیک اعلیٰحضرت کا اطلاق رسول کے لیے جس دلیل سے جائز ہے، اسی دلیل سے ہم رسول اور امت میں بے شمار فرق مراتب کے باوجود غیر رسول کے لیے اعلیٰحضرت کا اطلاق جائز کہیں گے۔

پھر زید سے یہ کس نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو صرف حضرت ہی کہا جائے، جس طرح آپ چاہیں اونچے سے اونچے، بڑے سے بڑے القاب وآداب سے رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو یاد کیجیے۔ صرف خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہیے۔ صاحبِ قصیدہ بردہ شریف نے فرمایا: ؎

دع ما ادعتہ النصاریٰ فی نبیھم   واحکم بما شئت من شرف ومن عظم

فان فضل رسول اللہ عیسیٰ لہ   حد فیعرب عنہ ناطق بفم

اس کلام سے صاف ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام کی عظمت ورفعت کا اندازہ انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ جس طرح چاہو عظمت وفضیلت کے اعلیٰ سے اعلیٰ الفاظ آپ کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ کمتری اور برتری کا سوال اس وقت ہو گا جب کوئی رسول کو صرف حضرت سمجھے اور رسول کے مقابلہ میں غیر رسول کو اعلیٰحضرت یا اللہ تعالےٰ کو صرف حضرت سمجھے اور اللہ کے مقابلہ میں رسول کو اعلیٰحضرت کہے، تب بے شک تنقیص وترجیح کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کسی خاص سے خاص اور جاہل سے جاہل شخص کا بھی یہ عقیدہ یا تصوّر نہیں ہوتا۔ کہ جب وہ اعلیٰحضرت کا استعمال رسول کے لیے کرتا ہے تو وہ رسول کو خدا سے بھی بڑھ کر سمجھتا ہے۔ اس طرح جب وہ غیر رسول کے لیے اعلیٰحضرت کا لفظ کہتا ہے تو اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کے تمام رسولوں، نبیوں، صحابہ، تابعین، ائمہ کرام واولیاء عظام سے بڑھ کر ہے۔ یہ عقیدہ تو بالکل ضلالت وگمراہی ہے۔ مسلمان اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

قاعدہ یہ ہے کہ اللہ کے لیے تمام صفاتِ کمالیہ کا اثبات علی الاطلاق کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ سب کا مالک اور خالق ہے۔ وہ سب سے بالا وبرتر ہے۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے کلماتِ فضیلت ورفعت کا جب اطلاق کیا جائے

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا کے بعد تمام کائنات و مخلوق میں آپ ہی کا درجہ ہے۔ آپ ان اوصاف و کمالات میں تمام دیگر مخلوقات سے افضل و برتر ہیں۔ اور جب غیر رسول کے لیے کلمۂ فضیلت استعمال کیا جاے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس کو اپنے زمانہ میں دوسروں پر فضیلت حاصل ہے۔ خواہ اپنے زمانہ کے تمام افراد پر اسے فضیلت حاصل ہو، جیسے حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم۔ کہ ان میں ہر ایک اپنے زمانہ میں تمام دوسروں سے افضل تھا یا اسے جزوی فضیلت حاصل ہو۔ جیسے خلفائے راشدین کے بعد سے اب تک۔ اپنے اپنے درجہ و مرتبہ کے لحاظ سے لوگوں کی فضیلت رہی ہے۔

"گلستان اور اخلاق محسنی" میں بھی بادشاہوں کے لیے حضرت، اعلیٰ حضرت اور آں حضرت وغیرہ کا استعمال کیا ہے اور یہ کتابیں سینکڑوں سال سے عربی مدارس میں داخل درس ہیں۔ تو کیا سب لوگ غلطی پر ہیں؟ صرف زید ہی صحیح کہتا ہے۔

(دستخط) کتبہ سید حمید اشرف غفرلہ

مدرس دار العلوم لطیفیہ مکانِ حضرت قطب ویلور

(دستخط) سید مصطفےٰ احسین بخاری

مدرس دار العلوم لطیفیہ

مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز

المجیب

(دستخط) علوی

مدرس دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ

مکتوبات

مجددؔ جنوب حضرت قطب ویلور علیہ الرحمہ نے اپنے مریدین ومعتقدین اور تلامذہ وخلفاء کے نام فارسی میں خطوط تحریر فرمائے ۔ بعض مکتوبات کا ترجمہ ھدیۂ ناظرین ھے :

مترجم : مولوی حافظ ابوالنعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی ایم اے ۔ استاذ دار العلوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکتوب بنام مولانا مولوی امام الدین مہکری

قاضیٔ عدالت عالیہ میسور

حمد وصلوٰۃ اور سلام ودعا کے بعد واضح خاطر شریف ہوکہ آنے والے حضرات کی زبانی آپ کے نائب قاضی ہونے کی خبر ملی ۔ اور مخدومی محی الدین مہکری کے مکتوب کے ذریعہ بھی یہ اطلاع ملی ۔

جب سے آپ قضاء کے امور ومعاملات اور مقدمات میں لگ گئے ہیں آپ کے خطوط آنا بند ہو گئے ہیں ۔ یہاں تک کہ خان صاحب ممدوح کے مکتوب میں بھی آپ کا سلام مذکور نہیں ہوتا خط وکتابت کا ذکر ہی کیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قضاوت کی خدمت میں مصروف رہ کر آپ نے ہم فقیروں کو بھلا دیا ہے ۔ شاید قضاوت کی خدمت ہم فقراء کی یاد ومحبت سے مانع ہے ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اپنے محلے کی چند اونٹنیوں کا دودھ ہر روز بعد نماز مغرب دوہا کرتے تھے ۔ لیکن جب مسندِ خلافت پر متمکن ہوے تو آپ نے اس وقت بھی دودھ دوہنا نہیں چھوڑا ۔

تعجب کی بات ہے آن عزیز قاضی ہوجانے کے بعد ہم فقیروں کو یاد بھی نہیں کر رہے ہیں ۔

دوست کی جانب سے جو بات بھی پہنچتی ہے وہ بڑی بھلی اور حسین ہوا کرتی ہے ۔ خان صاحب ممدوح کے مکتوب

میں چند کلمات آپ کے خاطر سپرد قلم کیا ہوں ۔ ان کو اپنے لیے دستور العمل بنا لیجیے ۔ اپنے آپ کو ہمیشہ شریعت مطہرہ کا پابند رکھیے ۔ عدالت اور قضاوت کو شرعی احکام کے نفاذ اور اجراء کا ذریعہ سمجھیں ۔ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو عہدۂ قضا کو اپنے لیے ایک آفت اور مصیبت سمجھیے ۔

حدیث شریف میں ہے ، بہت سے عزت اور مرتبہ والے قیامت کے دن ذلیل وخوار اور رسوا ہو جائیں گے اور بہت سے حقیر اور فقیر جن کی دُنیا میں کوئی وقعت نہ تھی قیامت کے روز عزت وافتخار اور اکرام واحترام کے مقام پر فائز ہوں گے ۔

اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اور آپ کو اس فانی دُنیا میں گرفتار نہ کرے اور دُنیا کی عزت وجاہت اور ظاہری شان وشوکت ہمیں فریب نہ دے اور آخرت کی ہمیشہ رہنے والی عزّت وسربلندی سے ہمکنار فرمائے ۔

اللہ تعالےٰ ہم سے ہمارے دلوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور یقیناً وہ ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے تم جہاں کہیں رہو ۔ ٥٥

مکتوب بنام جناب الحاج مرتضیٰ خان بہادر

سلام مسنون کے بعد واضح خاطر ہو کہ

مکرمی ومخترمی سید شاہ محمد قادری کی زبانی معلوم ہوا کہ اس فقیر کی سفارش قبول ہوئی ۔ اور مساعیٔ جمیلہ کی وجہ سے مسجد بھی آباد ہو گئی ۔ اللہ تعالےٰ ہماری جانب سے جزائے خیر عطا فرمائے ۔

آپ ہم جیسے دور افتادہ فقراء کے ساتھ جو محبت اور الفت سے پیش آتے ہیں اور موجودگی اور غیر موجودگی میں ہماری باتوں کا لحاظ فرماتے ہیں اور التفات والطاف فرماتے ہیں اس امید ہے کہ خدا کی عنایات والطاف آپ کی جانب ہوں گی اور آپ کا یہ مخلصانہ عمل اللہ کی خوشنودی ورضا کا باعث ہوگا ۔ انہ قریب مجیب ۔

حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ

آپ شریعتِ مطہرہ کی اشاعت اور اس کے احکام کی تنفیذ کے خیال سے امراء وسلاطین کی صحبت اختیار کرتے تھے اور حاجت مندوں کی حاجت روائی فرماتے تھے ۔

یہ حال تو اس زمانہ کا ہے ، جس میں اسلام کو قوت اور غلبہ حاصل تھا ۔ اب تو ایسا دور ہے کہ اسلام انتہائی ضعف کے عالم میں ہے ۔ ایسے زمانہ میں تھوڑا سا عمل بھی ثوابِ کثیر کا باعث ہوگا اور اللہ تعالےٰ کے نزدیک مقبول ہوگا ۔

ہمارے اس دَورِ انحطاط میں اگر کوئی عالم وفاضل شخص خلوصِ نیت کے ساتھ شریعت کے احکام کی تنفیذ کے خیال سے امراء کی صحبت اختیار کرے اور ملّت کے مسائل حل کرنے کی سعی کرے اور حاجت پوری کرادے

تو اس نیکی سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہو سکتی اور اس سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔
ناگور کے سفر سے واپسی کے بعد نواب عظیم جاہ بہادر کو مختار النساء سے لڑکی تولد ہوئی۔
ان ہی دنوں میں بہو بیگم صاحبہ نے مریم بی کو میرے پاس اولاد صالح کی استدعا کے خیال سے بھیجا تھا۔ اور دوا بھی طلب کی تھی۔ میں اسم الممصود کے نقش اور سفوف کی پڑیاں جو ازالۂ بانجھ پن' تقویت رحم اور تقویت جنین کے لیے بڑی مفید اور مجرب ہیں روانہ کیا۔ جس کے دو ماہ بعد مریم بی کی معرفت سے نواب صاحب کے حمل کی بشارت دی گئی۔ اللہ تعالے کا صد شکر ہے کہ اس نے گنہ گار کی دعا اور دوا کا نتیجہ ظاہر فرمایا۔
غیب کی باتوں کا علم اللہ تعالے ہی کو ہے۔ تاہم امورِ غیبیہ کا ظہور انسان کو ترقیات صوری و معنوی کے لیے دعا سے بے نیاز اور بے پروا نہیں کرتا۔ ربنا تقبل منا انك انت سميع العليم۔
سعادت آثار!
دنیا کی فلاح و ترقی اور لوگوں کا نفع و نقصان' امراء و سلاطین کے ساتھ قائم ہے اور ان امراء کی خوبیوں اور خرابیوں کا اثر دوسروں کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ ایسے افراد کی بڑی کمی ہے جو دولت و شباب کی حالت میں اللہ تعالے کی جانب مائل ہیں۔
دولت مندی صحیح معنوں میں دولت کے عطا کرنے والے خالق و مالک کی طاعت و فرمانبرداری میں ہے اور دولت مند آدمی رعایا کی دولت ہے۔ یہ حقیقت ہمیشہ ذہن میں رکھیے موت حق ہے۔ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا حق ہے۔ جنت و دوزخ حق ہے۔
یہ اہلِ سنت و جماعت کے عقائد ہیں۔ آپ اچھی طرح سے نواب صاحب کے ذہن میں بٹھا دیجیے۔
میں نے ایک اور رسالہ" اثباتِ توحید و نبوت انبیاء اور آخرت" یہ لکھا ہے۔ آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں ملاحظہ و مطالعہ فرمائیں۔
اور یہ بات نواب صاحب ممدوح کے گوش گزار کریں کہ وہ قرآن کی تفاسیر اور احادیث کی شرحیں اور سیرت نبوی ﷺ اور سیر صحابہؓ کا مطالعہ کرتے رہیں اور اس کے ساتھ نواب صاحب کے مطالعہ میں یہ کتابیں بھی رہنی چاہئیں۔
" روضۃ الاحباب" مصنف جمال الدین مدک اور امام غزالی کی تصانیف اور حضرت غوث پاک کے ملفوظات و تصانیف اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور امام ربانی مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی "آداب الصالحین" الاشیاء تعرف باضدادہا۔ کیوں کہ اشیاء کی پہچان اضداد سے ہوتی ہے۔ علم حق کے نور سے کفر کی قباحت ظاہر ہوتی ہے اور علم نورانی کی بدولت خدا کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالے کا ارشاد ہے: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ علماء ہی اللہ تعالے سے خوف کھاتے ہیں۔

مرغن غذائیں، رنگین کپڑے، ظاہری شان و شوکت، اغنیاء کی قربت کا خیال اور نکتہ چینی کا ڈر وغیرہ یہ ایسی چیزیں جو آخرت میں کام آنے والی نہیں ہیں سے آخرت تباہ و تاراج ہو جاتی ہے اور یہ تمام چیزیں ایک مومن کے لیے قید خانہ ہیں جو اس کو دلیر ہونے سے باز رکھتی ہیں۔ ؎

اے سرا و باغ تو زندانِ تو خان و مان تو بلائے جان تو

اے انسان تیرا باغ اور تیرا امکان تیرے لیے ایک قید خانہ ہے۔ اور یہ مال و اسباب تیری جان کے لیے ایک آفت و مصیبت ہے: اللہ وایاکم عن حب الدنیا واھلھا۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو دُنیا و مافیہا کی محبت میں گرفتار رہنے سے بچائے اور موت کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھے اور آخرت کی ہولناکیوں کو نظر میں رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے دلوں کو اپنی معرفت کے نور سے منوّر اور معمور فرمادے۔ دنیا جس کے لیے ثبات اور دوام نہیں ہے اور قبر میں ساتھ دینے والی نہیں ہے اس کی محبت سے بچائے اور ہمارے دلوں کو قوت عطا فرمائے۔ ؎

تو مرا دل دہ دلیری بیین روبہ خویش خوان شیرے ببیں

آپ مجھے دل دیجیے اور بہادری کا نظارہ کیجیے اور مجھے اپنی بلی کہہ دیجیے۔ اس کے بعد مجھ سے شیرین اور شیری دیکھیے۔ الوقت سیف قاطع: وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔ اس پر قدرت کو غنیمت سمجھو یعنی جو بھی وقت آپ کے قبضہ میں ہے اس سے فائدہ اٹھالو۔

زیادہ کیا لکھوں اللہ معکم اینما کنتم: تم جہاں کہیں رہو اللہ کی نصرت و تائید تمہارے ساتھ رہے۔ والسلام ...

بقیہ "عصری دکنی کی چند لسانی خصوصیات" صـ 128/ سے آگے۔

ضرب الامثال:

عمر میں نیں سے کم رو۔

گھر کا بڑا ننگا کھڑیا،

بلالی جی شا، کمر پوشینہ۔

کِھلا تو پھول نیں تو ماٹھی دھول۔

بانٹ کے کھاؤ ایمان بڑھاؤ۔

نماز پڑھیا اللہ کے واسطے گھاس چرایا گائی (گائے) کے واسطے۔

تھوک چاٹے تو بھوک مٹتی نیں۔ وغیرہ۔

خالص دکنی محاورے اور ضرب الامثال کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ انھیں اکٹھا کریں تو دکنی کی بڑی خدمت ہوگی۔ بہرکیف ان شواہد سے عصری دکنی کی امتیازی خصوصیات کا تعین بآسانی ہوسکتا ہے۔



جواہر السلوک — فائدہ ۲۵

ترجمہ: ڈاکٹر سیّد وحید اشرف الجیلانی کچھوچھوی۔ سابق صدر شعبۂ عربی فارسی اردو۔ مدراس یونیورسٹی

حضرت مجدّد جنوب قطب ویلور کی معرکۃ الآرا فارسی تصنیف جواہر السلوک کا
مفہوم خیز ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے

امام ربّانی کے مکتوبات جلد اول، مکتوب نمبر ۲۸ کا خلاصہ ہے کہ ایسا دیکھا گیا ہے کہ طالبان نے اپنی ہمت کی کوتاہی اور فطرت کی پستی اور شیخ کامل مکمل کی صحبت سے محرومی کے سبب طویل مسلک اور بلند مقصد کو مختصر راہ اور پست مقصد پر محمول کرلیا ہے اور راہ میں اُن کو جو کچھ حقیر اور معمولی حصّہ مل گیا اسی پر اکتفا کرلیا اور اسی کو اصل مقصد سمجھ لیا اور اسی کے حاصل ہو جانے پر اپنے کو کامل اور منتہی سمجھ لیا۔ جو احوال منتہیوں اور واصلانِ درگاہ الٰہی نے بیان کیے ہیں اس فطرت جماعت نے انھیں کو اپنے ناقص احوال پر منطبق کرلیا۔ ع چوہے نے خود کو خواب میں دیکھا کہ اونٹ ہے
نہایت گہرے سمندر کے ایک قطرہ بلکہ دریائے عمان کے ایک قطرے کے چھینٹے کو بلکہ محض صورتاً ایک چھینٹے پر قناعت کرلیا ہے۔ مخلوق کو خالق تصوّر کرلیا اور خالق سے دُور ہو کر مخلوق میں سکون اختیا کرلیا۔ با مثل کو بے مثل تصوّر کرلیا اور بے مثل سے مثل کی طرف رجوع کرلیا۔ یہ ناقص سالکین جو ناقص احوال کے سراب سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں وہ بدرجہا بہتر ہیں جن کا ایمان تقلیدی ہے اور جنھوں نے سلوک نہیں اختیار کیا اور وہ بے چون و بے ہمتا ذات پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ حق اور باطل اور بے خطا اور خاطی میں بہت فرق ہے۔ افسوس ہے ان طالبان پر جو اصل مقصود حاصل ہونے سے پہلے محدث کو قدیم سمجھ لیتے ہیں اور چوں کو بے چون خیال کرتے ہیں۔ اگر (آخرت میں) اس غلط کشف پر ان کو معذور نہ سمجھا گیا تو پھر ان کی خطا پر مواخذہ ہوگا

اے رب ہماری دانستہ یا نادانستہ غلطیوں پر گرفت نہ فرما۔

مثلاً ایک شخص کعبہ کے دیدار کے شوق میں روانہ ہوا۔ اتفاقاً راستہ میں اُسے ایک گھر ایسا دکھائی دیا جس کی شکل کعبہ کی عمارت جیسی تھی۔ اس ظاہری مشابہت کے سبب اسی کو کعبہ سمجھ لیا اور وہیں معتکف ہوگیا۔ ایک دوسرا

شخص ہے جس نے کعبہ کے اوصاف کو ایسے شخص سے پہلے معلوم کر لیا جس نے کعبہ کو دیکھا ہو۔ تو اگرچہ یہ شخص کعبہ کے سفر کے لیے روانہ نہ ہوا، لیکن غیر کعبہ کو کعبہ نہیں سمجھے گا۔ اس تصدیق میں وہ حق پر ہے۔ اور وہ شخص جو کعبہ کی طلب کے لیے چلا تھا اس سے اُس کا حال بہتر ہے۔ ہاں! وہ طالب جو ہر چند مقصود تک نہ پہنچا ہو، لیکن غیر مقصود کو مقصود نہ سمجھا ہو اس کا حال اس سے بہتر ہے۔ جس طلبِ مقصود کے لیے ایک قدم نہیں بڑھایا۔ لیکن تقلید میں حق پرست ہے۔ کیوں کہ جو حقّیت کی تصدیق کے بعد حصولِ مقصد کے لیے راہ پر چلا اور قطع مسافت کیا وہ قابلِ ترجیح ہے لیکن دانھیں ناقص سالکین میں سے) بعض نے اپنے خیالی کمال اور وہمی وصال کی بناء پر اپنے کو شیخی کی مسند کے قابل سمجھ لیا اور خلق کے مقتدا بن بیٹھے اور خود اپنے نقص کی علّت کے سبب ان لوگوں کی استعداد کو بھی ضائع کر دیا۔ جو حصول کمالات کی صلاحیت رکھتے تھے اور اپنی صحبت کی برودت کی نحوست سے طالبان کے مقصود کی حرارت کو زائل کر دیا۔ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کر دیا۔ اپنے کو ضائع کیا۔ دوسروں کو بھی ضائع کر دیا۔ یہ مجذوبانِ سلوک ناکردہ اپنے وہم سے اپنے کو اُن سے زیادہ باکمال سمجھتے ہیں جنھوں نے راہِ سلوک طے کیا۔ لیکن فنا کی منزل تک نہیں پہنچے۔ کیوں کہ مبتدی اور منتہی جذب میں یکساں دکھائی دیتے ہیں۔ اور ظاہر میں عشق و محبّت میں برابر معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت میں ان میں کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

ابتداء میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی علّت ہوتی ہے اور اس میں غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور انتہا حق سے ہے۔ اور حق کے لیے۔ (وہاں غرض معدوم ہو جاتی ہے۔ حق ہی رہتا ہے۔) اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔ فی الجملہ یہ ظاہری مشابہت و مناسبت اسی طرح کی تخیّل و توہم کا باعث ہوتی ہے۔ اور چوں کہ طریقۂ نقشبندیہ میں سلوک پر جذبہ مقدم ہے۔ اس لیے اس طریق کے مجذوبان جو سلوک کی دولت سے مشرف نہیں ہوئے ہیں اس طرح کے تخیّل و توہم ان میں بہت ہوتا ہے اور ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ مقامِ جذبہ میں ان کے اندر مختلف احوال پیدا ہوتے ہیں اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو اسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سلوک کے منازل طے کر رہے ہیں۔ اور اسے وہ سیر الی اللہ سمجھتے ہیں۔ اور احوال کی ان تبدیلیوں کی وجہ سے اپنے کو مجذوبان سالک سمجھتے ہیں۔ اس لیے میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ چند فقرے لکھے جائیں جو جذبہ و سلوک کی حقیقت کے بیان میں ہوں اور ان دونوں مقام میں فرق بتایا جائے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے خواصِ ممیّزہ کا ذکر کیا جائے۔ اور مبتدی کے جذب اور منتہی کے جذب کا فرق بتایا جائے۔ اور ساتھ ہی مقام تکمیل و ارشاد اور بعض دوسرے علوم جو اس سے مناسبت رکھتے ہیں بیان کیے جائیں۔ تاکہ حق کا اثبات اور باطل کا ابطال ہو جائے۔ خواہ مجرموں کو کتنا ہی ناگوار معلوم ہو۔

یہ تحریر دو مقصد پر مشتمل ہے اور ایک خاتمہ پر۔ مقصد اوّل اُن معارف کے بیان میں ہے، جو مقامِ جذبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور مقصد ثانی جو سلوک سے تعلق رکھتے ہیں اور خاتمہ میں بعض علوم و معارف متفرقہ ہیں کہ طالبان کو اُن کے جاننے سے بہت فائدہ ہوگا۔

مقصدِ اوّل

۱۔ جان لو کہ وہ مجذوبان جنھوں نے سلوک طے نہیں کیا۔ وہ کتنا ہی قوی جذبہ رکھتے ہوں اور خواہ کسی راہ سے وہ مجذوب ہوئے ہوں، وہ ان اربابِ قلوب کے گروہ میں داخل ہیں جنھوں نے سلوک طے نہیں کیا ہے۔ اور بغیر سلوک اور تزکیۂ نفس کے مقامِ قلب سے نہیں گزر سکتے۔ ان کا انجذاب انجذابِ قلبی ہے۔ اُن کی محبت عرضی ہے۔ نہ عرضی ہے نہ اصلی۔ کیوں کہ اس مقام پر روح نفس سے آمیز ہے اور ظلمت نُور سے مختلط ہے۔ مقامِ قلب کی تنگی سے پُورے طور پر نکل آنا اور مقلّبِ قلب سے پیوست ہو جانا مطلوب کے ساتھ انجذابِ روحی پیدا کرنا، بغیر روح کے نفس سے منزّہ کئے ہوئے تاکہ مطلوب کی طرف پوری توجّہ ہو سکے اور نفس کو روح سے جدا کیے بغیر مقامِ بندگی پر فرود کرنا متصوّر نہیں ہے۔ جب تک کہ دونوں (یعنی روح و نفس) فی الحقیقت مجتمع ہیں۔ حقیقت جامعۂ قلبیہ محکم اور قائم ہے۔ اس حالت میں خالص انجذاب روحی متصوّر نہیں ہے۔ اور روح کا نفس سے جُدا ہونا قطع منازلِ سلوک اور سیر الی اللہ کی تکمیل اور سیر فی اللہ میں تحقیق بلکہ مقام جمع کے بعد مقام فرق کے حصول کے بعد جس کا تعلق

سیر عن اللہ باللہ سے ہے، صورت پذیر ہوتا ہے
ہر ایک مرد مردِ میداں نہیں ہوتا
آخر کا کوئی پشّہ سلیماں نہیں ہوتا
پس مبتدی اور منتہی کے جذب کا فرق ظاہر ہوگیا

ان مجذوبانِ اربابِ قلوب کا شہود کثرت کے پردہ میں ہے۔ اس معنی کو معلوم کریں یا نہ کریں اور اُن کا اس کثرت میں نہیں ہے۔ سوائے عالمِ ارواح کے جو کہ اپنے موجد کے اندر سریان کرے اور لطافت و احاطہ کرتے میں شبیہہ کی صورت میں ہے۔ (یعنی روح خود شبیہہ اختیار کر لیتی ہے) اسی مناسبت سے شہودِ روح کو شہودِ حق سمجھتے ہیں اور احاطہ و سریان و قرب و معیّت کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔ کیوں کہ سالک کی نظر صرف مقامِ فوق تک ہی پہنچی ہے۔ اور مقامِ فوقِ فوق تک نہیں پہنچی۔ ان کے فوق کا مقام روح کا مقام ہے۔ ان کی نظر روح کے مقام سے اوپر نہیں جاتی۔ شہود سوائے روح کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ فوقِ روح پر نظر مقام روح تک پہنچنے پر موقوف ہے اور محبت و انجذاب بھی شہود کے رنگ میں ہے۔ (شہودِ حق سبحانہٗ تعالیٰ) بلکہ محبت و انجذاب بجنابِ قدس حصولِ فنا سے وابستہ ہے جو کہ نہایت سیر الی اللہ کے بعد ہی معتبر ہے۔

نہ پہنچے کوئی گر مقام فنا تک
نہیں رہ اسے درگہ کبریا تک

اس مقام پر شہود کا اطلاق تنگی الفاظ کے سبب ہے ورنہ ان بزرگوں کا معاملہ اس شہود و متعارف سے ماوراء ہے جس طرح کہ ان کا مقصد ذات بے چون ہے۔ ان کا اتصال بھی حق سبحانہٗ سے بے چون و بے چگون ہے۔ چون کو بے چون تک راہ نہیں ہے۔

اتّصالی بے تکیّف بے قیاس　　ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس　　(مولانا روم)

(ربّ النّاس کو جانِ ناس کے ساتھ انصال بے تکیّف و بے قیاس ہے۔)

وہ عالم جس کا تعلق توحیدِ وجودی سے ہے اس کا منشا انجذاب و محبت قلبی ہے۔ وہ ارباب قلوب جنھوں نے جذب پیدا نہیں کیا ہے اور سلوک کی راہ سے قطع منازل نہیں کیا ہے ان لوگوں سے یہ علم مناسبت نہیں رکھتا اسی طرح وہ مجذوب جو قلبی سلوک کے ذریعہ مقلّب قلب کی کامل طور پر متوجہ ہوتے ہیں، ان علوم سے عاری ہوتے ہیں اور ان سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ (مترجم کے خیال میں مفہوم یہ ہے کہ جو صرف ذکرِ قلبی کرتے ہیں اور سلوک کی باقاعدہ ریاضت نہیں کرتے ان کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم) بعض مجذوبان ایسے ہوتے ہیں ہر چند انھوں نے راہ سلوک طے کی ہو اور منازل طے کی ہو لیکن ان کی نظر مقامِ مالوف سے (یعنی دنیاوی تعلقات و منافع سے) منقطع نہیں ہوتی اور وہ فوق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ان کے علوم ان کو گرداب سے باہر نہیں نکال سکتے لہٰذا قرب کے مدارج اور قدس کی بلندیوں تک متوجہ ہوتے ہیں وہ گویا کہتے ہیں کہ اے ربّ ہمارے اس ظالم قریہ سے نکال۔ الخ:

نہایت مقصد کے وصول کی یہ علامت ان علوم سے تبرّا ہے۔ کیوں کہ جتنا تنزیہہ سے زیادہ مناسبت ہوگی عالَم کو صانع سے مناسبت کے علم سے وہ اتنا ہی زیادہ بعید ہوگا۔ (یعنی سالک کو مصنوع کے انکشافات کے ذریعہ سلوک میں جو تعلق صانع سے پیدا ہوتا ہے وہ بغیر سلوک کے محض جذبِ قلبی کے ذریعہ نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم: مترجم) اس وقت عالم کو صانع سمجھنا یا صانع کو محیط عالم سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ (یعنی اس کا قول اس مقام پر محض تقلیدی ہوگا، تحقیقی نہیں۔ مترجم) اور اس کا یہ سمجھنا مٹی یعنی انسان یا مخلوق یا ربّ الارباب کے بارے میں نہ ہوگا۔

معرفت

حضرت خواجہ نقشبند نے فرمایا ہے کہ ہم انتہا کو ابتدا میں درج کرتے ہیں۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ انجذاب و محبت جو منتہیوں کو انتہا میں میسّر ہوتی ہے اس طریق میں وہ انجذاب و محبت ابتدا ہی میں مندرج ہے۔ کیوں کہ منتہی کا انجذاب روحی ہے اور مبتدی کا جذب قلبی ہے۔

اور چوں کہ قلب برزخ ہے نفس و روح کے درمیان۔ اس لیے جذب قلبی کے ضمن میں جذب روحی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اگرچہ تمام جذبات میں یہ معنی حاصل ہے۔ لیکن اس اندراج کو اس طریقہ (نقشبندیہ) میں جو خصوصیت حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ اس خانوادہ کے بزرگوں نے اس معنی کے حصول کا مخصوص طریقہ وضع کیا ہے اور اس مطلب کے وصول میں اپنا ایک مسلک متعین کیا ہے۔ اور دوسروں کو یہ معنی محض اتفاق سے میسر ہو جاتا ہے اور وہ اس کا کوئی متعین طریقہ نہیں رکھتے۔

ان بزرگواران (نقشبندیہ) کو مقام جذبہ میں خاص شان ہے۔ جو دوسروں کو نہیں حاصل ہے۔ اور اگر حاصل ہے تو وہ بہت نادر ہے۔ اس لیے ان میں سے بعض کو اس مقام میں منازل سلوک قطع کئے بغیر ایک طرح کی فنا و بقا ارباب سلوک کے فنا و بقا کی مانند ہوتی ہے۔ اور ان کو ایک مشرب حاصل ہوتا ہے مقام تکمیل سے۔ جو کہ سیر عن اللہ باللہ کے مشابہ ہے۔ نیز حاصل ہوتا ہے۔ جو کہ دوسروں کو تربیت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس مبحث کی تحقیق عنقریب بیان کی جائے گی۔

یہاں ایک باریکی ہے۔ جاننا چاہیے کہ روح کو بدن سے تعلق پیدا کرنے سے پہلے ایک طرح کی توجّہ مقصود حاصل ہوتی ہے۔ جب اس کا تعلق بدن سے ہو جاتا ہے تو وہ توجّہ زائل ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ کے بزرگوں نے ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے کہ جس کے ذریعہ وہ توجّہ سابق پھر سے ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ لیکن چوں کہ روح کا تعلق بدن سے ہے۔ اس لیے توجّہ قلبی حاصل ہوتی ہے جو روح و نفس کی جامع ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ توجّہ روحی توجّہ قلبی میں مندرج ہے۔ لیکن وہ توجّہ روحی جو منتہیوں کو ہوتی ہے وہ فنائے روح کے بعد ہوتی ہے اور اس کا وجود حقانی ہے جو بقا باللہ کے پل کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ توجّہ روحی جو توجّہ قلبی کے ضمن میں ہے۔ بلکہ توجہ روح جو بدن سے متعلق ہونے سے پہلے ہوتی ہے وہ بھی ایک توجّہ ہے جو روح کی ہستی کے ساتھ ہے کہ اُسے فنا نہیں اور توجّہ روح باوجود ہستی روح اور توجّہ روح با فنائے روح میں بہت فرق ہے۔ پس اس توجہ روحی کو جو قلب میں مندرج ہے۔ نہایت کہنا اس اعتبار سے ہے کہ توجّہ روح ہے کہ جو انتہا میں بھی رہتی ہے اور بس۔ اس لیے ہدایت میں نہایت کے اندراج کا مطلب ہے نہایت کی صورت کا اندراج ہدایت میں، نہ کہ حقیقت میں نہایت کیوں کہ ہدایت میں نہایت کی حقیقت کا اندراج محال ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ صورت کا ذکر نہ کرنے کا مقصد یہ ہو کہ اس طریقہ کے جو طالب ہوں اُن کے اندر ترغیب پیدا ہو اور حقیقت تو وہی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی مدد سے جس کی تحقیق پیش کی ہے اور سابقان جن کا انجذاب بغیر محنت اور کسب کے ہے، وہ بھی انجذاب قلبی ہے۔ اور وہ روح کی سابق توجّہ کا اثر ہے۔ جو بدن کے ساتھ تعلق کی بنا پر بالکلیہ زائل نہیں ہوی ہے۔ کسب و تعمل سابق توجّہ کے ظہور کے لیے اُس جماعت کے لیے ہے کہ جنھوں نے روح کے بدن کے ساتھ تعلق کے بعد توجّہ سابق کو فراموش کر دیا ہے

گویا کسبِ توجّہِ سابق پر متنبہ کرنے کے لیے ہے اور اس گمشدہ دولت کو یاد دلانے کے لیے ہے۔ لیکن سابقہ توجّہ کے بھولنے والے لطیف الاستعداد سابقان مذکور ہیں کیوں کہ نسیان توجّہ سابق اس بات کی خبر دیتی ہے کہ توجّہ کلّی متوجّہ الیہ میں گم ہوگئی ہے اور عدم نسیان توجّہ کا یہ حال نہیں ہے۔ سابقان کے باب میں وہ توجّہ ان کی کمیت میں شامل اور ظاہر ہوتی ہے اور ان کا بدن بھی روح کا حکم اختیار کرلیتا ہے۔ جیساکہ یہ محبوبین و مرادین کی شان ہے۔ (روح کا جسم مثالی بن جانا غوث العالم محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانی ثم الکچھوچوی کے حالات میں کئی بار ملتا ہے۔ مترجم) لیکن شمولِ محبوبان اور شمولِ سابقان کا فرق حقیقت شئے اور صورت شئے کے فرق کی طرح ہے جیساکہ اُن کے حاملین سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ محبّان واصل اور مریدانِ کامل کے لیے قسم شمول متحقق ہے، لیکن برق کی طرح ہے۔ دائمی نہیں ہے اور شمول دائمی خاصۂ محبوبان ہے۔

معرفت مجذوبانِ اربابِ قلوب جب مقامِ قلب میں متمکن ہوجاتے ہیں، اور رسوخ پیدا کرلیتے ہیں تو وہ معرفت وھو جو اس مقام کے مناسب ہے ان کو میسر ہوتے ہیں۔ تو وہ طالبان کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور ان کی صحبت میں طالبین کی جماعت کو انجذاب اور محبّتِ قلبی حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ اُن لوگوں سے وہ کمال تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیوں کہ یہ خود کمال کی حد تک نہیں پہنچے ہیں۔ اس لیے دوسروں کے لیے حصول کمال کا واسطہ نہیں بن سکتے۔ مشہور ہے ناقص سے کامل وجود میں نہیں آسکتا۔ ہر چند یہ سلوک کی نہایت تک پہنچے ہیں اور منتہیوں کا جذب (جذب روحی) پیدا کرلیتے ہیں لیکن وہ مقام قلب تک بطریق سیر عن اللہ باللہ نہیں پہنچے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ منتہی جسے عالم کی طرف رجوع کرنے کا اختیار نہیں ملا، وہ مرتبۂ تکمیل اور دوسرے کو فائدہ پہنچانے کا حق نہیں رکھتا۔ کیوں کہ اس کو عالم سے کوئی مناسبت اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ تاکہ اُسے فائدہ پہنچا سکے۔ اور شیخ مقتدا جس کو برزخ کہتے ہیں اس اعتبار سے ہے کہ وہ مقامِ برزخیت میں جو مقامِ قلب ہے نزول کرچکا ہے۔ اور نفس و روح دونوں جانب سے اپنا حصّہ حاصل کرچکا ہے۔ روح کی طرف سے فوق سے استفادہ کرتا ہے اور نفس کی جہت سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے اندر توجّہ حق سبحانہٗ اور توجّہ خلق دونوں جمع ہوچکے ہیں کہ اب کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔ بس فائدہ پہنچانا اور فائدہ حاصل کرنا دونوں ایک ساتھ اس کو حاصل ہیں۔ بعضے مشائخ اس برزخیت کو حق و خلق کے مابین سمجھتے ہیں اور شیخ برزخ کو جامع بین التشبیہ و التنزیہ کہتے ہیں۔

پوشیدہ نہ رہے کہ یہ برزخیت جس کی بنیاد سُکر پر ہے۔ لائق مقام شیخی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی بنیاد صحو نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُن کا نفس اس مقام میں روح کے انوار کے غلبہ کی وجہ سے مندرج ہے اور یہی اندراج سُکر کا منشاء ہے۔ اور مقامِ برزخیت قلب میں نفس و روح ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ پس ناچار سُکر کی یہاں

گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ یہاں تمام تر صحو ہے جو دعوت کے مقام کے مناسب ہے۔ تو اُس کا دامن تھام لو۔

جب شیخ کامل قلب کے مقام پہ لاتے ہیں برزخیت کے واسطہ سے، تو عالم سے مناسبت پیدا کرتے ہیں اور مستعدوں کے لیے حصولِ کمالات کا واسطہ ہوتے ہیں اور مجذوبِ متمکن بھی۔ چوں کہ مقام قلب میں ہوتا ہے۔ اس لیے عالم سے مناسبت رکھتا ہے۔ توجّہ کو ان سے دریغ نہیں رکھتا اور انجذاب و محبت اگرچہ قلبی ہے۔ لیکن اس سے اپنا حصہ حاصل کر لیتا ہے۔ لاجرم افادہ کی راہ اس پہ کھول دی جاتی ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ مجذوب متمکن کے افادہ کی کمیّت افادہ منتہی مرجوع کی کمیّت سے زیادہ ہوتی ہے اور منتہی کے افادہ کی کیفیت مجذوب کے افادہ کی کیفیت سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ منتہی مرجوع (جس سے لوگ زیادہ رجوع کرتے ہیں۔) کو عالم سے زیادہ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ظاہری طور پہ ہے فی الحقیقت وہ عالم سے جدا ہے۔ وہ اصل رنگ سے رنگا ہوا ہے۔ اور اسی سے باقی ہے اور عین مجذوب کو عالم سے مناسبت فی الحقیقت ہے۔ وہ از جملہ افرادِ عالم ہے ہے اور اس کی بقا سے باقی ہے۔ جس سے عالم باقی ہے۔ پس ناچار بواسطۂ مناسبت حقیقی مجذوب سے لوگ زیادہ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اور منتہی مرجوع سے کمتر۔ لیکن کمالاتِ ولایت کے مراتب تک پہنچانے میں منتہی مخصوص ہے پس لاجرم منتہی کا افادہ کیفیت میں راجح ہے۔

منتہی کو حقیقت میں ہمت و توجّہ نہیں ہے اور مجذوب صاحبِ ہمت و توجّہ ہوتا ہے۔ ہمت اور توجّہ سے طالب کے کام کو آگے بڑھاتا ہے۔ ہر چند بحدِّ کمال نہیں پہنچاتا۔ اور نہایت توجّہ جو کہ طالبان کو مجذوبان متمکن سے حاصل ہوتی ہے۔ وہی توجّہ سابق روح ہے جسے فراموش کر دیا تھا۔ اور ان کی صحبت میں یاد آئی اور اندراج کے طور پہ توجّہ قلبی حاصل ہوئی۔ اس توجّہ کے خلاف جو منتہیان کی صحبت میں پیدا ہوتی ہے۔ توجّہ حادث ہے کہ جو پہلے سے بالکل موجود نہیں تھی۔ فنائے روح پر موقوف تھی بلکہ وجود حقانی کے ساتھ اس کی بقا و پہ۔ اس لیے یقیناً توجّہ اول کا حاصل کرنا زیادہ آسان ہوا اور توجّہ ثانی کا وجود بہت کم ہے۔ جو زیادہ آسان ہے۔ زیادہ ہے اور جو بہت مشکل کمتر ہے۔ اسی سبب سے کہا گیا ہے کہ جہتِ جذبہ کی تحصیل میں شیخ مقتدا واسطہ نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ نسبت اس کو پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ جو نسیان کے سبب تعلیم و تنبیہہ کی محتاج ہو گئی تھی لہذا اس شیخ کو شیخ مجذوب متمکن کہتے ہیں۔ شیخ تربیت نہیں کہتے اور سلوک کے لیے جس میں منازل سلوک قطع کیے جاتے ہیں۔ شیخ مقتدا کی ضرورت ہے اور اس کی تربیت ضروری ہے۔ شیخ مقتدا کو چاہیے کہ وہ مجذوب متمکن کو افادۂ عام کی اجازت نہ دے اور اسے مقام تکمیل و شیخی پہ نہ بٹھائے۔ کیوں کہ بعض طالبان ایسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی استعداد بلند ہو اور کمال و تکمیل کی قابلیت بروجہ اتم ہو۔ اس لیے اگر وہ اس مجذوب متمکن کی صحبت میں آئے تو احتمال ہے کہ اس کی استعداد ضائع ہو جائے اور وہ قابلیت برطرف ہو جائے۔ مثلاً ایک زرعی زمین ہے، جس میں گیہوں پیدا کرنے کی استعداد ہے۔ اگر اس میں نہایت عمدہ

گندم بویا گیا تو اس کی استعداد کے مطابق اس میں عمدہ گیہوں پیدا ہو گا۔ لیکن اگر اس میں ردّی گیہوں چنا ملا کر بویا گیا تو پیداوار کیا بلکہ اس کی پیداوار کی قابلیت ہی ختم ہو جائے گی۔

اور اگر بالفرض شیخ مقتدا مصلحت یہ سمجھتا ہے کہ اس کو اجازت دی جائے اور اس کے اندر افادہ کی صورت دیکھتا ہے تو اس کو افادہ کے لیے قید کی شرط لگا دے۔ مثلاً یہ کہ طالب کے اندر جس قدر مناسبت کا ظہور ہو اور اس کی استعداد ضائع نہ ہونے پائے اور اس اقتدائی میں اس کی نفسانی خواہش کا دخل نہ ہو۔ کیوں کہ عدم تزکیۂ نفس کی وجہ سے ابھی اس کی ہوائے نفسانی زائل نہیں ہوئی ہے اور جب اس کو معلوم ہو جائے کہ طالب مقتدا کی پوری قابلیت کو حاصل کر چکا ہے اور اس کی استعداد اس سے زیادہ ہے تو چاہیے کہ وہ طالب پر اسے ظاہر کر دے اور اس کو اجازت دے دے کہ اپنے مقصد کو کسی دوسرے شیخ کی تربیت سے حاصل کرے اور خود کو منتہی نہ ظاہر کرے۔ اور خود کو منتہی ظاہر کر کے لوگوں کی راہبری نہ کرے اور اس طرح کی شرائط جو مناسب وقت وحال ہو اس کو بیان کر دے اور اس کو پوری وصیت کے ساتھ رخصت کر دے۔

لیکن منتہی مرجوع افادہ و تکمیل میں ان قیود کا محتاج نہیں ہے۔ کیوں کہ جامعیت کے سبب اس کو جمیع طرق و استعدادات سے مناسبت ہے۔ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق اس سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ ہر چند شیوخ کی صحبت میں قوت و ضعفِ مناسبت کے سبب کہیں تاخیر اور کہیں سُرعت متصور ہے۔ لیکن اصل افادہ میں شیوخ مساوی ہیں۔

شیخ مقتدا طالب کے افادہ کے وقت حق سبحانہٗ کی جناب میں التجا کرے اور یہ التجا صرف اسی امر امر میں نہیں بلکہ جمیع امور اور جمیع اوقات میں جو حق سبحانہٗ تعالےٰ نے اس کو عطا کیں ہیں۔ کسی وقت اور کسی فعل میں اس سے منفک نہیں ہوتی۔ (یعنی ہر امر میں حق سبحانہٗ تعالےٰ سے التجا کرے۔) وذالك فضل الله یؤتیه من یشاء والله ذوالفضل العظیم۔

مقصدِ ثانی
ان چیزوں کے بیان میں جن کا تعلق سلوک سے ہے:

جان لو کہ طالب جب سلوک کے طریقہ میں فوق کی طرف متوجّہ ہوتا ہے تو جب وہ اس اسم کی طرف پہنچتا ہے جس کا کہ وہ رب ہے اور اس میں وہ فانی اور مستہلک ہو جاتا ہے تو اس پر فنا کا اطلاق درست ہے، اور بقا کے بعد اسم اسم کے ساتھ بقا کا اطلاق اس پر مسلّم ہے اور اس فنا و بقا سے بمرتبۂ اولیٰ وہ ولایت سے مشرف ہوتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے اور شرحِ کلام ضروری ہے۔

تمہید
وہ فیض جو کہ ذات تعالیٰ و تقدس سے پہنچتا ہے دو قسم کا ہے ایک قسم وہ جس کا تعلق ایجاد، ابقا، تخلیق، ترزیق، احیاء، امانت اور اس طرح کی چیزوں سے متعلق ہے۔ اور دوسری

نوع وہ ہے جس کا تعلق ایمان معرفت اور ولایت و نبوّت کے کمالات سے ہے۔ پہلی قسم صفات کے توسط کے فیض سے ہے۔ اور دوسری قسم بعض صفات کے توسط سے ہے اور بعض شیونات کے توسط سے ہے۔ صفات و شیونات کے درمیان بہت باریک فرق ہے۔ یہ فرق صرف بعض محمدی المشرب اولیا، پر ظاہر کیا جاتا ہے اور کسی دوسرے پر منکشف نہیں ہوتا۔

بالجملہ صفاتِ ذات سے خارج میں موجود ہیں جو ذات تعالےٰ و تقدس پر زائد ہیں۔ اور شیونات مجرّد اعتبارات ہیں۔ ذات عزّ سلطانہ ہیں۔ (صفات کا ذات پر زائد ہونا مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ حضرت قطب رح ویلور نے شیونات کا ذکر کر کے اس مسئلہ کی وضاحت ایک نئے ڈھنگ سے کی ہے۔ ممکن کسی اور ولی اللہ نے اشارۃً بیان کیا ہو (جو مترجم کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔ مترجم)

یہ ایک وصال سے واضح ہے۔ مثلاً پانی بالطبع اوپر سے نیچے کو آتا ہے۔ پانی کا یہ فعل اعتبار کرتا ہے۔ کہ حیات، علم، قدرت و ارادت کا وجود ہے۔ کیوں کہ علم رکھنے والے اپنے جسم کے وزن اور اپنے علم کے اقتضا سے اوپر سے نیچے کو آتے ہیں۔ اور اوپر کی طرف متوجّہ نہیں ہوتے۔ (یہ اوپر سے نیچے کو آنا علم، قدرت، حیات اور ارادہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ مترجم) اور علم تابع حیات ہے اور ارادت تابع علم ہے۔ اور اس سے قدرت بھی ثابت ہے۔ یہ اعتبارات پانی میں بمنزلہ شیونات ہیں۔ اگر ان اعتبارات کے وجود کے سبب پانی میں صفاتِ زائدہ ثابت کیا جائے تو یہ بمنزلہ صفات موجو ہیں۔ ان زاید صفات کے وجود کے سبب پانی کو اعتبارات اولیٰ کے مطابق حی، عالم، قادر، مرید نہیں کہا جا سکتا۔ ان ناموں کے اطلاق کے لیے ثبات زایدہ کا ثبوت درکار ہے۔ اس لیے بعض مشائخ کے بیان سے جو پانی کے لیے مذکورہ ناموں کے اثبات میں ہے، اُن مبنا شیوں و صفات میں فرق نہ کرنا ہے اور اسی طرح نفی و وجود ثبات کا حکم بھی محمول ہے۔ اُس فرق کے نہ ہونے کے سبب۔ اور شیون و صفات میں دوسرا فرق یہ ہے کہ شیون کا مقام مواجہ ذی ایشان (کذا) ہے۔ اور مقام صفات ایسا نہیں ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اور وہ جماعت کہ جو اُن کے قدم پر ہے۔ اُن کے فیض ثانی کا وصول شیونات کے توسط سے ہے اور تمام انبیاء اور جماعت کہ اُن کے قدم پر ہیں۔ ان کے لیے اس فیض کا وصول بلکہ فیض اول بھی متوسط صفات ہے۔ پس ہم کہتے ہیں اس سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رب ہے اور واسطہ فیض دوم ہے ظلّ شانِ العلم اور یہ شان جامع جمیع شیون اجمالی و تفصیلی ہے۔ اور وہ ظلّ معبّر بقابلیت ذات ہے۔ تعالیٰ و تقدس، شان العلم کے لیے۔ بلکہ جمیع شیون اجمالی و تفصیلی کے لیے۔ لیکن باعتبار شمولِ شان علم ان کو جاننا چاہیے کہ یہ قابلیت اگرچہ برزخ ہے۔ ذاتِ عزّ شانہٗ اور شان العلم کے درمیان لیکن چوں کہ اس کی ایک جہت بیرنگ ہے اور جہتِ ذات ہے تعالیٰ شانہٗ برزخ میں بھی اس کا رنگ نہیں ظاہر ہوتا۔ پس وہ برزخ پر رنگ جہت دیگر جو کہ شان العلم ہے، اس سے رنگا ہوا ہے۔

پس ناچار اسے اُس شان کا ظل کہا گیا۔
اور ظلّ شئے عبارت ظہورِ شئے سے ہے اگرچہ وہ شبہ و مثال کے لیے ہے۔ مرتبۂ دوم میں اور چوں کہ برزخ کا حصول طرفین کے حصول کے بعد ہے لاجرم یہ برزخ مکاشفہ کے وقت اس شان کے تحت منکشف ہوتا ہے۔ پس اس ظہور کے اعتبار سے آخر تک ظلّیت کا اطلاق کرنا مناسب ٹھہرا۔
اولیاء اللہ کا وہ گروہ جو خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے قدم پر ہے۔ اُن کے ارباب کے اسماء فیضِ ثانی کے وصول میں اس قابلیتِ جامعہ کے ظلال ہیں اور اس ظلّ مجمل کی تفصیل کی طرح ہیں اور بقیہ تمام انبیاء علیہم السلام کے ارباب اور ان کا واسطۂ وصول فیض اول و ثانی کی قابلیات اتصاف ذات ہیں ہے۔ عز سلطانہ صفات موجودہ زائدہ کے ساتھ۔ اور اولیاء اللہ کا وہ گروہ جو ان انبیاء کے اقدام پر ہیں ان کے ارباب صفات ہیں وصول فیضِ اول و ثانی کے حق میں اور فیض اول اکا واسطہ اس سردار انبیاء کے لیے قابلیت اتصاف ذات تعالیٰ و تقدس جمیع صفات کے لیے گویا وہ قابلیات جو تمام انبیاء کے فیوض کے وسائل میں وہ ظلال ہیں اس قابلیت جامعہ کے اور اس جامع مجمل کی تفصیل کی مانند ہیں۔
وہ گروہ جو سردار انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم پر ہے اُن کے فیضِ اول کے وسائط بھی جدا ہیں جو کہ صفات ہیں۔ پس محمدیان کے فیض اول کے وصول کے وسائل جدا ہیں فیض ثانی کے وصول کے وسائط سے، دوسروں کے خلاف کہ اُن کے لیے ایک ہی ہے۔ بعض مشائخ قدس سرہٗ جنھوں نے ربِّ آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتصاف کی قابلیت میں منحصر کیا ہے اس کا سبب شیون و صفات میں فرق نہ کرنا ہے بلکہ مقام شیون سے لاعلمی ہے اور اللہ ہی حق کو ثابت کرنے والا اور راہ دکھانے والا ہے۔
پس یہ ثابت ہوا کہ ربِّ آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام اور رب الارباب مقام شیون میں بھی ہیں اور خانۂ صفات میں بھی ہیں اور ہر دو فیض کے وصول کا واسطہ بھی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ولایت کے کمالات کے مراتب کا فیض کا وصولِ ذاتِ باری سے ہے۔ کسی امر زائدہ کے توسط کے بغیر کیوں کہ شیون عین ذات ہیں۔ ان میں زیادتی کا اعتبار غیر معقول ہے۔ لہذا تجلّی ذاتی اُن کے لیے (سردار انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے) مخصوص ہے۔ اور ان کی کامل اتباع کرنے والے چوں کہ انھیں سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ تو اُن کو بھی اس مقام کا کچھ ذوق حاصل ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے صفاتی وسائط کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور صفاتِ زائد وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ درمیان میں محکم پردہ ہے۔ ان کو تجلّی صفاتی کا نام دیا گیا۔
جاننا چاہیے کہ ہر چند قابلیت اتصاف اعتبار ہے۔ لیکن زائد وجود نہیں رکھتا۔ کیوں کہ صفات موجود ہیں نہ کہ اُن قابلیات۔ لیکن چوں کہ قابلیت ذات وصفات کے درمیان برزخوں کی طرح ہیں۔ بلکہ شیون وصفات کے درمیان بھی برزخوں کی طرح ہیں اور برزخ اپنے طرفین کا رنگ قبول کرتا ہے اور قابلیات بھی صفات کا رنگ قبول

کے قابلیت پیدا کرتی ہیں:

اک لمحہ ہجر دوست کسے کب گوارا ہے
آنکھوں میں نیم موئے بھی حد سے زیادہ ہے (یعنی آدھا بال)

اس بیان سے روشن ہوا کہ ذاتِ تعالےٰ وتقدس کا بے پردہ ظہور تجلیّ شہودی کے منافی نہیں ہے۔ لیکن تجلیٗ وجودی کے منافی ہے۔ اس لیے سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے کمالاتِ ولایت کے فیض کے وصول میں کوئی چیز درمیان میں حائل نہیں ہے۔ اور فیضِ وجودی کے وصول کی جانب درمیان میں پردہ ہے۔ جو قابلیت اتصاف ہے جیساکہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب ان کے شیون اور قابلیات عقل کے اعتبارات سے ہوں تو وجود ذہنی ثابت ہوتا ہے اور اس حجاب علمی سے لازم آیا کہ صفات کے حجابات کی غایت خارجی ہے اور شیون کے حجابات علمی ہیں۔ کیوں کہ ہم کہتے ہیں کہ دو موجود خارجی کے درمیان موجود ذہنی پردہ نہیں ہوتی موجود خارجی کے لیے۔ اور اگر تسلیم کرلیا جائے کہ علمی حجاب کا مرتفع ہونا محض معارف کے حصول کے درمیان ممکن ہے۔ خارجی حجاب کے برخلاف، تو پھر اس کا زوال ممکن نہیں۔

جب یہ مقدمات معلوم ہوگئے تو اب جان لو۔ کہ اگر محمدی ہے تو اس کی سیر کی منتہا ظلِّ شان ہے۔ جو اُس کا نام ہے۔ اور اس اسم میں فانی ہونے کے بعد فنا فی اللہ سے مشرّف ہوا۔ اگر اس اسم کے ساتھ باقی ہوگیا تو اُسے بقا باللہ میسّر ہوا۔ اور اس فنا و بقا سے ولایت خاصۂ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں داخل ہوگیا۔ اور اگر محمدی مشرب نہیں ہے تو محنت کی قابلیت کے مطابق یا نفس صفت کے مطابق جو کہ اس کا رب ہے اس مقام تک پہنچتا ہے اور اگر اسم میں فانی ہوگیا (یعنی جو ربّ الارباب نہیں ہے۔ (مترجم) تو اس پر فنا فی اللہ کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے اور اسی تقدیر پر اس اسم کے ساتھ باقی رہنے پر بقا باللہ کا اطلاق بھی نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اسم اللہ جامع ہے تمام صفات و شیونات کا۔ اور چوں کہ شیون کی جہت سے زیادت اعتباری ہے تو یہ عین ذات ہیں۔ جو ایک دوسرے کے عین ہیں۔ پس ایک اعتبار سے فنا ہونا تمام اعتبارات سے فنا ہونا ہے بلکہ فنا ذات تعالےٰ وتقدس میں ہے اور اسی طرح ایک اعتبار سے بقا تمام اعتبارات سے بقا ہے۔ پس اس صورت میں فانی فی اللہ و باقی باللہ کہنا درست ہے بخلاف صفات کے اعتبار سے جو زاید بر ذات موجود ہیں۔ ان کی مغائرت ذات عزّ سلطانہ سے تحقیقی ہے۔ اس لیے ایک صفت میں فنا جمیع فنا کو مستلزم نہیں ہے۔ اور یہی حال بقا کا ہے۔ پس ناچار اس فانی کو فانی فی اللہ نہیں کہنا چاہیے اور باقی کو باقی باللہ نہیں کہنا چاہیے۔ ہاں مطلق فانی و باقی کہہ سکتے ہیں۔ یا کسی صفت کی قید لگا کر کہہ سکتے ہیں۔ یعنی فانی صفت علم میں یا باقی صفت علم میں۔ پس ناچار محمدیوں کو فنا بتمام و کمال ہے اور ان کی بقا اکمل

روحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ شیون کی جانب ہے اور شیون کو عالم سے کوئی نسبت نہیں۔ کیوں کہ عالم صفات کا ظل ہے نہ کہ شیون کا ظل۔ پس سالک کا فنا کسی شان میں اس کے فنائے مطلق کو مستلزم ہے، اس طور پر کہ سالک کے وجود کا بقا نہیں رہتا اور اسی طرح بقا کی تقدیر تمام تر اسی شان سے باقی رہتا ہے۔ بخلاف صفت میں فانی کے۔ کیوں کہ وہ کلیتہً بشریت سے باہر نہیں آتا۔ اور اس کا اثر زائل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وجود سالک اسی صفت اور اس کے ظل کا اثر ہے۔ پس اصل کا ظہور ظل کے وجود کو بالکلیہ مٹا دینے والا نہیں ہوتا اور بقا فنا کے اندازہ کے مطابق ہے۔ پس محمدی بشری صفات کی طرف لوٹنے سے مامون رہتا ہے۔ اور ردّ کے خوف سے محفوظ کیونکہ وہ بالکلیہ اپنے وجود سے باہر آگیا ہے۔ اور اس سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ باقی ہے۔ اس محل میں عود کرنا ممنوع ہے۔ فنا صفاتی کی صورت کے خلاف کہ وہاں وجود کے اثر کے بقا کے سبب ایسا ممکن ہے۔

یہاں ایک اختلاف مشائخ کے درمیان واقع ہو سکتا ہے۔ رجوع کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں کہ اگر محمدی ہے تو محفوظ ہے عود کرنے سے۔ اور بعض دیگر نے زوال اثر کو جائز نہیں رکھا ہے۔ اس باب میں بھی تفصیل ہے۔ اگر محمدی ہے تو عین واثر دونوں گم ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا غیر زائل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ صفت جو کہ اس کی اصل ہے باقی ہے۔ پس اس کا ظل کا زوال ممکن نہیں ہے۔ یہاں ایک باریکی ہے۔ جاننا چاہیے کہ عین واثر کے زوال سے مراد زوالِ شہودی ہے نہ کہ وجودی۔ کیوں کہ زوالِ وجودی کا قول الحاد و زندقہ کا مستلزم ہے اور اس گروہ کی ایک جماعت نے زوالِ وجودی تصوّر کر کے فکن کے اثرات کے زوال کے منکر ہو گئے اور اس کو الحاد و زندقہ قرار دیا۔ اور حق وہ ہے جس کی تحقیق ہم نے حق سبحانہٗ تعالیٰ کی مدد سے کر دی۔

عجیب بات یہ ہے کہ زوالِ وجودی کے قول کے باوجود عین کے زوال کے بھی قائل ہیں۔ کیوں کہ وجودی اعتبار سے عین کا زوال اثر کے زوال کے حکم کے رنگ میں الحاد و زندقہ کو مستلزم ہے۔ بالجملہ زوالِ وجودی عین واثر میں محال ہے۔ اور شہودی ہر دو میں ممکن ہے بلکہ واقع ہے۔ لیکن یہ محمدی مشرب کے لیے مخصوص ہے پس محمدیان قلب سے بالکلیہ باہر نکل آتے ہیں۔ اور مقلب القلوب سے پیوستہ ہو جاتے ہیں۔ اور احوال کے تقلّب سے آزاد ہیں۔ اور دوسروں کو چوں کہ وجود آثار دامنگیر ہے اور مقام قلب سے تقلب احوال سے خلاصی نہیں رکھتے کیوں کہ آثار کا وجود اور احوال کا تقلّب حقیقتِ جامعہ قلبیہ سے ہے۔ اس لیے دوسروں کا شہود ہمیشہ پردہ میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ جس قدر سالک کے وجود کا باقی رہنا ثابت ہے مطلوب کا پردہ اسی قدر ہے۔ چوں کہ اثر باقی ہے۔ یہ پردہ وہی اثر ہے۔

معرفت

اگر سالک غیر متعارف سلوک کی راہ سے اس اسم کے اوپر جو کہ اس کا رب ہے۔ کسی مرتبہ تک پہنچتا ہے۔ لیکن اس اسم تک نہیں پہنچتا اور وہ جس مرتبہ تک پہنچا ہے۔ اس میں فانی اور مستہلک ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی اس کو فنا فی اللہ کہنا درست ہے اور اسی طرح اسی مرتبہ میں بقا باللہ

کہنا بھی درست ہے۔ پس اس اسم میں فنا فی اللہ کی تخصیص اس اعتبار سے ہے کہ فنا کے تمام مراتب میں یہ اس کا پہلا مرتبہ ہے۔
محبوبان کو قلاب عنایت کی طرف کھینچ لے اور اثنائے راہ میں اس کو چھوڑ نہ دے۔ لیکن یہ کفایت تمام متقدم جذبات کے حق میں بھی ممنوع ہے۔ وہ جذبہ جو انجام کار سلوک کی طرف مائل کرتا ہے کافی ہے اور اگر وہ سلوک کی طرف نہ آیا تو مجذوبِ ابتر ہے۔ محبوبان میں سے نہیں ہے۔

خاتمہ مشائخ کے ایک گروہ نے کہا ہے تجلّی ذاتی شعور کو زائل کرنے والی اور حِس کو معطل کرنے والی ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنا حال یوں بیان کیا ہے۔ کہ تجلی ذاتی کے ظہور کے وقت دیر تک وہ بے حس و حرکت ہو گئے۔ یہاں تک کہ لوگ انھیں مُردہ سمجھتے تھے۔ اور بعض دوسروں کا یہ حال ہوا کہ تجلّی ذاتی کے ظہور کے وقت وہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ ان باتوں کی حقیقت یہ ہے کہ یہ تجلّی ذات در پردہ ایک اسم ہے۔ اسماء میں سے۔ اور بقایا وہ بقایا صاحبِ تجلّی کے وجود کے اثر سے ہے اور وہ بے شعوری اس بقیہ کے واسطہ سے ہے۔ اور اگر بالکلیہ فانی ہونا اور بقا باللہ سے مشرف ہوتا تو وہ تجلّی اس کو ہرگز بے شعور نہ کرتی۔ آگ سے وہ جلایا جاتا ہے۔ جو آگ کو چھوتا ہے اور جو خود آگ ہے۔ کیسے جلایا جائے گا۔ پہلا آگ کو چھونے والا ہے تو وہ یقیناً جلے گا اور پریشان ہوگا۔ اور دوسرا عینِ آتش ہے تو وہ کیسے جلایا جائے گا۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ وہ تجلّی جو در پردہ ہے، تجلّیِ ذات نہیں تجلّیِ صفات میں داخل ہے۔ تجلّی ذات آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ بے پردہ ہے۔ پردہ کی علامت بے شعوری ہے اور بے شعوری دُوری کے سبب ہے اور بے پردگی کی دلیل شعور ہے۔ اور شعور کمالِ حضور کے ساتھ ہے۔ کسی بزرگ نے اس تجلّی والے کا حال جو کہ بالاصالۃ اور بالاستقلال ہے اس طرح بیان کیا ہے ؎

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتوِ صفات	تو عینِ ذات مینگری در تبسّمے
(موسیٰؑ نہ تاب لا سکے ظلِّ صفات کی	اور عینِ ذات آپؐ نے دیکھا خوشی کے ساتھ)

اور اسی طرح تجلی ذاتی جو بے پردہ ہے محبوبوں کے لیے دائمی ہے اور محبّوں کے لیے برقی ہے۔ کیوں کہ محبوبوں کے جسم نے اُن کی ارواح کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ نسبت ان کی کلیّت میں سرایت کر گئی ہے اور محبّوں میں یہ سرایت بر سبیل ندرت ہے اور وہ جو اس حدیث میں آیا ہے۔ کہ لی مع اللہِ وقتٌ الخ : سے مراد تجلّی برقی نہیں ہے۔ کیوں کہ آسرورما کے حق میں جو تمام مرادوں کا بادشاہ ہے دائمی[1] ہے بلکہ ایک نوع کی خصوصیت اس دائمی تجلّی میں ہے۔

---

[1] امام ربّانی اپنے مکتوب نمبر ۸۵ میں لکھتے ہیں کہ دوام وقت و اسرار وقت اس کو مسلّم ہے۔ کہ جو فناء مطلق کے تحقق کے بعد بقا باللہ سے مشرف ہوا ہو اور اس کا علم حصولی علم حضوری سے تبدیل ہو گیا ہو۔ اس بحث کو ہم وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جان لو کہ ہر وہ علم کہ عالم کو اپنی ذات کے خارج سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے حصول کے طریقہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

معرفت

مشائخ قدس اللہ اسرارہم، حدیث: لی مع اللہ وقت لا یسعنی ملک مقرب ولا نبی مرسل ۔ کے متعلق دو طبقوں میں ہیں۔ ایک طبقہ نے وقت سے مراد وقتِ دائمی لیا ہے اور دوسرے طبقے نے اس سے ندرتِ وقت مراد لیا ہے اور حق یہ ہے کہ استمرار وقت کے باوجود وقتِ نادر بھی متحقق ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس فقیر کے نزدیک اس وقتِ نادر کا تحقق ادائے نماز کے وقت میں ہے۔ اور یقیناً سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حدیثِ قرۃ عینی فی الصلوٰۃ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بندہ اپنے رب سے نماز میں زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اور حق تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ واسجد واقترب۔ پس جس وقت کہ قرب الٰہی جل شانہٗ بیشتر ہے گنجائش غیر اس وقت ممنوع ہے۔ اور بعضے مشائخ قدس اسرارھم نے جو فرمایا ہے۔ وہ اپنے حال کی قوت سے اس استمرار کی خبر دی ہے۔ جیسا کہ نماز میں میرا وہی حال رہتا ہے، جو نماز سے قبل رہتا ہے۔ تو پھر مذکورہ حدیث بلکہ نص مذکور مساوات و استمرار کی نفی کرتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ استمرار وقت متحقق ہے۔ گفتگو اس باب میں ہے کہ استمرار کے باوجود حالت نادرہ بھی واقع ہوتی ہے یا نہیں؟ وہ جماعت جنھوں نے ندرتِ وقت کی اطلاع نہیں دی ہے اس کی نفی کے قائل ہیں اور دوسری جماعت جن کو اس مقام سے حصہ ملا ہے انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے اور حق یہ ہے کہ جس کو حضور علیہ الصلوٰۃ

(حاشیہ ص سے آگے۔) معلوم کی صورت کا حصول ہے جو کہ عالم کے ذہن میں ہوتا ہے اور وہ علم جو صورت کے حصول کا محتاج نہ ہو اور وہ خود اس کی ذات کا علم ہے۔ وہ علمِ حضوری ہے۔ کیوں کہ ذات بنفسہٖ عالم کا حاضر ہے اور علم حصولی میں جب تک معلوم کی صورت ذہن میں حاصل ہے وہ معلوم کی طرف متوجہ ہے اور جب وہ صورت ذہن سے زائل ہو گئی پس دوام توجہ علم حصولی میں محال عادی ہے اس کے برعکس حضوری، معلوم سے غفلت غیر متصور ہے کیوں کہ اس کے تحقق کا منشا، عالم کی ذات ہے اور چوں کہ یہ حضور دائمی علم بھی ذات میں دائمی ہوگا پس ذات سے زوال توجہ ممکن نہ ہوگا اور بقا باللہ میں علم حضوری ہے کہ اس کا زوال متصور نہیں ہے۔ یہاں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ بقا باللہ کا مفہوم یہ ہے کہ خود را عین حق سمجھ لے۔ ہرگز نہیں۔ جیسا کہ اس گروہ کے بعض لوگوں نے حق الیقین سے یہی مراد لیا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ بقا باللہ جو فنائے مطلق کے بعد میسر ہوتا ہے۔ اس قسم کے علوم سے مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ حق الیقین جس کے متعلق بعض نے کہا ہے اس بقا کے مناسب ہے کہ جو جذبہ میں حاصل ہوتا ہے۔ وہ بقا جو ہمارا مقصود ہے وہ کچھ اور ہے۔ ع

ذوقِ ایں مے نشناسی بخدا تا نچشی

(اس شراب کے ذوق کا پتہ اس وقت تک نہ پاؤ گے جب تک خود نہ چکھ لو گے)

پس استمرار توجہ اور دوام حضور بقا باللہ کی صورت میں ثابت ہو گیا۔ بقا باللہ کے تحقق کے بغیر دوام ممکن نہیں ہے اگرچہ ایسے بہت سے ہیں کہ اس مقام تک پہنچنے سے پہلے انھیں اس معنی کا وہم ہوتا ہے۔ (حاشیہ از مصنف)

والسلام کے طفیل نماز میں جمعیتِ خاطر ملی ہے ان کو دولتِ قرب سے مشرف کیا ہے۔ اور یہ اقل قلیل ہیں۔ اللہ تعالےٰ اپنے کمال کرم سے ہمیں اس مقام کو نصیب فرمائے۔ بحرمتہ محمد علیہ وعلیٰ آلہ والصلوٰۃ والسلام۔

معرفت ارباب صفات کے منتہیان علوم و معارف میں مجذوب (غیر سالک) کے نزدیک ہیں۔ شہود میں بھی دونوں یک رنگ ہیں۔ کیوں کہ دونوں اربابِ قلوب سے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔) اربابِ صفات تفاصیل سے مطلع ہیں۔ بخلاف مجذوبان۔ اور اربابِ صفات سلوک و عروج کے سبب قربِ بیشتر رکھتے ہیں۔ مجذوبوں کے مقابلوں میں جنھوں نے عروج نہیں کیا ہے۔ لیکن اصل سے محبت ان کو دامن گیر ہیں۔ اگرچہ درمیان میں پردے ہیں۔ کیا عجب کہ المرءمع من احبّ کے حکم کے مطابق مجذوبوں میں قرب و معیّتِ اصل کا اعتبار کیا جائے۔ پس مجذوبانِ محبت میں محمدیان سے نسبت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ حبِّ ذاتی خواہ وہ پردوں کے ساتھ ہو، مجذوبوں کے حق میں متحقق ہے۔

معرفت اس گروہ کے بعض لوگوں کی عبارتوں میں آیا ہے کہ اقطاب کے لیے تجلّیِ صفات ہے اور افراد کے لیے تجلّیِ ذات ہے۔ اس باب میں کچھ تامل ہے۔ کیوں کہ قطب محمدی مشرب ہوتا ہے اور محمدیان کے لیے تجلّیِ ذات ہے۔ البتہ اس تجلّی میں بھی بہت تفاوت ہیں۔ جو قرب افراد کو ہے وہ اقطاب کو نہیں ہے۔ لیکن دونوں کو تجلّیِ ذات نصیب ہے مگر یہ کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قطب سے مراد قطبِ ابدال لی گئی ہوگی جو کہ اسرافیل کے قدم پر ہیں نہ کہ بر قدم محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

معرفت اِنّ اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ۔ اللہ تعالےٰ بیچون و بیچگون ہے۔ روح آدم کو جو کہ اس کا خلاصہ ہے بے چونی و بے چگونی کی صورت پر پیدا کیا ہے۔ پس جس طرح حق تعالےٰ لامکانی ہے روح بھی لامکانی ہوی۔ اور روح کی نسبت بدن کے ساتھ ایسی ہے، جیسے حق تعالےٰ کو عالم سے ہے۔ نہ داخل ہے، نہ خارج نہ متصل نہ منفصل۔ قیوّمیت سے زیادہ یہ نسبت مفہوم نہیں ہوتی۔ ذرّاتِ بدن کے ہر ذرّہ کا مُقیّوم روح ہے جیس طرح حق تعالےٰ قیوّمِ عالم ہے۔ اس تبارک و تعالیٰ کی قیوّمیت بدن کے لیے روح کی قیوّمیت کے واسطہ سے ہے۔ ہر فیض جو کہ وارد ہوتا ہے اس فیض کے ورد کا محل ابتداً روح ہے۔ روح کے واسطہ سے وہ فیض بدن کو پہنچتے ہیں اور چوں کہ روح کو بے چونی اور بیچگونی کی صورت میں پیدا کیا ہے۔ لاجرم بے چون و بے چگون حقیقی کو اس میں گنجائش ہوئی۔ لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبد المؤمن (مجھ کو نہ زمین نے سمایا نہ آسمان نے بلکہ بندہ مومن کے قلب میں میری سمائی ہوی۔) کیوں کہ زمین و آسمان وسعت و فراوانی کے باوجود دائرہ مکان میں داخل ہیں۔ اور چونی و چگونی کا داغ رکھتے ہیں۔ پھر یہ لامکانی کی گنجائش جو کہ کتنا اور کیسے سے بری ہیں۔ نہیں رکھتے۔

لامکانی مکان میں گنجائش نہیں رکھتا اور بے چون چون میں قرار نہیں پکڑتا۔ پس ناچار[علہ] قلب مومن جو لامکانی ہے اس میں گنجائش اور کتنے اور کیسے سے مُبرّا متحقق ہو گیا۔

مومن کے قلب کے ساتھ تخصیص اس لیے ہے کہ جو مومن کامل نہیں ہے۔ وہ لامکانی اوج سے نیچے آگیا ہے اور کتنے اور کیسے میں گرفتار ہے اور مکانی کے حکم میں آگیا ہے۔ پس اس نزول و گرفتاری کے سبب چوں کہ دائرۂ مکانی میں داخل ہو گیا ہے اور چونی پیدا کر لیا ہے۔ تو اس نے اس قابلیت کو ضائع کر دیا ہے۔ کتنا ہی وسیع ہو تنگ ہے۔ عرش باوجود عظمت و فراخی کے چوں کہ مکانی ہے۔ ہر آئینہ لامکانی کے سامنے جو کہ روح ہے دانۂ خردل کا حکم رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ قلب چوں کہ محلِّ تجلّیِ انوار قدم ہے بلکہ قدیم کے ساتھ باقی ہے۔ عرش اور ما فیہا اس کے اندر سما جائیں تو محو ہو جائیں اور اُن کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ جیسا کہ سیّد الطائفہ نے اس مقام کے بارے میں کہا ہے کہ جب محدث قدیم کے ساتھ مل گیا تو پھر اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ یہ ایک یکتا لباس ہے جو روح کے قد کے مطابق سِلا گیا ہے۔ فرشتے بھی یہ خصوصیت نہیں رکھتے جو داخلِ دائرۂ مکان ہیں اور چون سے متصف ہیں۔ لاجرم انسان رحمٰن جلّ شانہٗ کا خلیفہ ہوا۔ بلکہ صورتِ شئے خلیفۂ شئے ہے۔ جب تک کہ صورتِ شئے پر مخلوق نہ ہو شئے کی خلافت کے لائق نہ ہوگا اور جب تک کہ خلافت کے لائق نہ ہو اپنے اصل کی امانت کا بار نہیں اٹھا سکتا: لا یحملُ عطایا الملکِ الّا عطایاہ ۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنّا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال الخ۔

اور جان لو کہ مطلوب کی صرف نسبت بلکہ عجز کا ادراک اس موقع پر ادراک ہے اور اپنے جہل کا اعتراف ہی معرفت ہے۔ معرفت باللہ جتنا زیادہ ہوگی اس میں اتنا ہی زیادہ تحیّر ہوگا۔

تنبیہ: اگر کسی عبارت میں کوئی لفظ ایسا ہو کہ جس سے باری تعالیٰ کی شان میں ظرفیت اور مظروفیت کا مفہوم نکلتا ہو تو اسے عبارت کی تنگی پر محمول کرنا چاہیے۔ اور عبارت کے معانی کو علمائے اہلِ سنّت کی رائے کے مطابق سمجھنا چاہیے۔

علہ

چرخِ فلک و آنچہ اندر خمِ ش | آن چہ خرد نام نہد عالمش
در سعتِ دائرۂ دل گم است | ایں ہمہ چون قطرہ و دل قلزم است

جامیؒ

(چرخ و فلک جو بھی اُس کے خم میں ہیں، جس کا نام عقل نے عالم رکھا ہے وہ سب دل کی وسعت میں گم ہیں۔ یہ سب قطرہ کی طرح ہیں اور دل قلزم ہے۔)

معرفت

عالم کیا صغیر اور کیا کبیر سب اسماء و صفاتِ الٰہیہ کے مظاہر ہیں۔ شیون کمالات ذاتیہ کا آئینہ ایک پوشیدہ خزانہ تھا اور ایک راز میں یہ خزانہ پوشیدہ تھا۔ اس نے چاہا کہ خود کو خلوت سے جلوت میں لائے اور اس اجمال کی تفصیل کی طرف لائے تو عالم کو پیدا کیا تاکہ یہ عالم اپنے اصل پر دلیل بن جائے۔ پس عالم کو اس کے صانع سے یہی نسبت ہے کہ عالم اس کی مخلوق ہے اور اپنے صانع کے پوشیدہ کمالات پر دلیل ہے۔ اس کے ماوریٰ جو بھی حکم ہے۔ مثلاً اتحاد، عینیت، احاطہ، معیّت، یہ سب سُکر وقت اور غلبۂ حال کی وجہ سے ہے۔ مستقیم الاحوال اکابر کو قدح صحو سے ایسی شراب پلائی گئی ہے کہ وہ ان علوم سے بری اور مستغفر ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض کو سلوک کی راہ میں یہ علوم حاصل ہوتے ہیں لیکن آخرکار وہ اس سے گزر جاتے ہیں۔ اور علمِ شریعت کے مطابق اُن پر علمِ لدنّی ظاہر کیا جاتا ہے۔

اس مبحث کی تحقیق کے لیے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک ذوفنون عالم یہ خواہش کرتا ہے کہ اپنے پوشیدہ کمالات کو عرصۂ ظہور میں لائے اور اپنے چھپے ہوئے فنون کو عوام پر ظاہر کرے۔ اس کے لیے حروف اور اصوات ایجاد کرے تاکہ ان حروف اور اصوات کے پردے میں اپنے کمالات کو ظاہر کرے۔ پس اس صورت میں ان حروف اصوات کو معانئ مخزونہ کے ساتھ بلکہ اس موجد عالم کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ عالم اس کا موجد ہے اور یہ دوال اس کے پوشیدہ کمالات پر۔ حروف واصوات کو اُس عالِم موجد کا عین یا ان کا معانی کا عین کہنا بے معنی ہے۔ اسی طرح احاطہ و معیّت کا حکم اس حادثہ میں غیر واقع ہے۔ معانی وہی صرافتِ مخزونہ ہیں۔ البتہ چوں کہ معانی و صاحبِ معانی اور حروف و اصوات کے درمیان دالّیت و مدلولیّت کی مناسبت متحقق ہے۔ تو بعضے معنی زائدہ غیر واقعہ تخیّل میں آتے ہیں۔ فی الحقیقت وہ عالِم اور اس کی معنی مخزونہ ان زائدہ نسبتوں سے منزّہ اور مبرّا ہیں اور یہ حروف واصوات خارج میں موجود ہیں۔ نہ یہ کہ وہ عالِم اور معانی موجود ہیں اور حروف و اصوات اوہام و خیالات ہیں۔ پس عالَم جو ماسوا سے عبارت ہے خارج میں موجود ہے۔ اپنے ظلّی وجود کے ساتھ۔ یہ نہیں ہے کہ عالَم محض اوہام و خیالات کا نام ہے۔ یہ مذہب تو مذہب سوفسطائی ہے۔ جو کہ عالَم کو اوہام و خیالات سمجھتے ہیں۔ عالَم میں حقیقت کو ثابت کرنا، عالَم کو اوہام و خیالات نہیں ثابت کرتا اور حقیقت موجود ہے۔ نہ کہ عالَم۔ کیوں کہ اس حقیقت مفروض سے ماوراء ہے۔

تنبیہ مظہریت اور عالَم کی مرائیت سے مراد خاص کر اس کے اسماء و صفات کی مرائیت ہے نہ کہ اسماء و صفات کی مراعیت اعیان میں کیوں کہ اسم مسمّیٰ کے رنگ میں کسی مرأت کا محاط نہیں ہوتا اور صفت موصوف کی طرح کسی مظہر میں مقید نہیں ہوتی۔ ـــه

ہے تنگنائے صورت معنی بیاں ہو کیسے
سلطان کو کیا سروکار اپنے گدا کے در سے

معرفت سرورِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کامل اتباع کرنے والے اگرچہ اس اتباع کے واسطہ سے تجلّیِ ذات سے بہرہ مند ہوتے ہیں جو کہ بالاصالۃ خاصۂ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کو تجلّیات صفات کے واسطہ سے قرب کے مراتب حاصل ہیں۔ جو کہ اِس امّت کے کامل متبعین کے لیے نہیں ہے۔ لیکن باوجود تجلّی ذات بطریق تبعیت اس امّت کو جو کہ خیر الامم ہے۔

اس کا ولی اپنے پیغمبر کی افضلیت کے باوجود کسی نبی کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھو کہ ایک شخص آفتاب کے جمال کی محبت میں مدارج عروج کو طے کر کے آفتاب تک پہنچتا ہے اور آفتاب اور اس کے درمیان سوائے ایک باریک پردے کے کوئی چیز حائل نہیں ہے۔ اور ایک دوسرا شخص آفتاب کے جمال کی محبت میں باوجود عروج تک پہنچنے سے عاجز ہے۔ ہر چند اس کے اور آفتاب کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ لیکن پہلا شخص آفتاب سے زیادہ نزدیک ہے اور کمالات میں زیادہ عالم ہے۔ اس لیے جس کو بیشتر قرب حاصل ہے اور زیادہ معرفت رکھتا ہے۔ وہ زیادہ افضل ہے۔ پس امّت جو کہ خیر الامم ہے اس کا کوئی ولی انبیاء کے مراتب تک نہیں پہنچ سکتا۔ کُلّی فضل انبیاء کو ہے۔ اولیاء اس کے طفیلی ہیں۔

عبداللہ انصاری ہروی منازل السائرین نے اس کی بابت تفصیلی بحث کی ہے۔ وہاں دیکھنا چاہیے۔

جواہر الحقائق

قسط ۱۲

تصنیف لطیف ماہرِ علومِ دین طریقت، واقفِ رموزِ معرفت و حقیقت حافظِ قرآن مجیدِ جنوب حضرت شاہ محی الدین سید شاہ عبداللطیف نقوی قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز المتوفی ۱۲۸۹ھ

نوادر الدقائق ترجمہ جواہر الحقائق

ترجمہ و تشریح

حضرت مولانا قاری ڈاکٹر حکیم سید افسر باشاہ صاحب قاسمی صبغۃ اللّٰہی شفا ڈسپنسری گڑیاتم

سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ

حمد تیری اے خدائے لم یزل
ہے یہ اپنی زندگی کا ماحصل
نام تیرا میرے دل کی ہے دوا
ذکر تیرا روح کی میری شفا

جب زباں پر محمد ﷺ کا نام آگیا
دوستو زندگی کا پیام آگیا
آپ کی مدح انسان کیا کر سکے
عرش سے جب درود و سلام آگیا

ہر قسم کی تعریف ثابت ہے اس پاک پالن ہار کے لیے جو ساری کائنات کا خالق و پروردگار ہے اور ہزاروں ہزار بار درود و

سلام اس دربارِ گہر بار خلاصۂ کائنات فخر موجودات محسنِ اعظم، فخرِ آدم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ جن کے طفیل و بدولت اسلام کا بول بالا ہوا اور شرک وضلالت، کفر وجہالت کا منہ کالا ہوا۔

الحمد للہ! زیرِ نظر کتاب نوادر الدقائق" ترجمۂ "جواھر الحقائق کی یہ بارھویں قسط ہم آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جو کتاب" جواہر الحقائق" کے الحمد للہ پانچوں فائدوں کے ترجمہ سے فارغ ہو کر اب اس کے چھٹویں فائدہ کے ترجمہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ دعا فرمائیں کہ یہ خدمت بھی باحسن وجوہ پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ آمین۔

اس ترجمہ کے تعلق سے عرض ہے کہ اس کے اندر اتنی رعایت اور کوشش کی ہے کہ ترجمہ لفظی اور بامحاورہ ہو اور پھر بھی بعض مقامات پر عبارت دقیق اور مشکل ہوتی ہے اور اس کے سمجھنے میں سالکین اور ناظرین کو بعض وقت دشواری پیش ہوتی ہے تو ایسی صورت میں حتی الوسع عبارت کا خلاصہ یا حاصل ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی بعض مشکل اور ادق الفاظ کے ابہام و تفہیم میں اگر دشواری محسوس کی تو وہاں قوسین کے اندر اس کی تسہیل کر دی ہے۔ جو راقم مترجم کی جانب سے خفیف اضافہ اور فائدہ ہے۔ اور جہاں تشریح کا مستقل عنوان ہے وہاں مترجم کی طرف سے تفہیم و تشریح کی ایک ادنیٰ کوشش سمجھیں۔

زیرِ نظر کتاب نوادر الدقائق ترجمۂ جواہر الحقائق کی یہ بارھویں قسط درجِ ذیل عناوین پہ مشتمل ہے:

۱۔ چھٹواں فائدہ عالم ارواح کے ثبوت پر۔
۲۔ ارواح کی پہلی قسم۔
۳۔ ارواح کی دوسری قسم۔
۴۔ ارواح کی تیسری قسم۔
۵۔ ارواح کی چوتھی قسم۔
۶۔ ارواح کی پانچویں قسم۔
۷۔ روح مکلف وغیر مکلف۔
۸۔ تشریحِ مترجم۔
۹۔ روح کی تین قسمیں۔
۱۰۔ فرشتوں کی پانچ قسمیں۔
۱۱۔ فرشتوں کی پہلی قسم کو حضرت آدم کے سجدے کا حکم نہیں تھا۔
۱۲۔ فرشتوں کی دوسری قسم۔
۱۳۔ روح اعظم عقل۔ عقل اول، عقل کُل نور، ام الکتاب اور قلم اعلیٰ۔
۱۴۔ مقام جبروت اور ملائکہ کی خدمات۔
۱۵۔ تشریح مترجم۔
۱۶۔ فرشتوں کی تیسری قسم۔
۱۷۔ پہلی صف کے انفاس۔
۱۸۔ ملکوتِ اعلیٰ۔
۱۹۔ ملکوتِ اسفل۔
۲۰۔ ہر چیز کا ایک ایک فرشتہ
۲۱۔ محافظ فرشتوں کا ثبوت قرآن اور انبیاء کی زبان سے۔
۲۲۔ تشریح مترجم۔

چھٹواں فائدہ عالم ارواح کے وجود و ثبوت پر

ارواح کا عالم اور ان کے وجود کا ثبوت نقلاً بھی ہے اور عقلاً بھی۔ چناں چہ قرآن مجید، حدیث شریف، توریت

انجیل اور دیگر آسمانی کتابوں میں ارواح اور فرشتوں کا ذکر، نیز ملأ اعلیٰ اور عقلِ کل کا ذکر موجود ہے۔ عقلوں اور نفوس مجردہ اور عالمِ مجردات کے مناسب و موزونیت کو دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے۔

اور یہ عالمِ مجردات کبھی حسی اشارات کو قبول نہیں کرتا اور یہ مادے سے بھی، رنگ سے بھی اور شکل و صورت اور جسمانی عارضات سے بھی مستثنیٰ اور الگ ہے۔ (یعنی غیر جسمانی چیز جو جسم، رنگ، شکل و صورت وغیرہ کچھ نہیں رکھتی) اور یہ مجرد ارواح (غیر جسمانی شئے) کے سوا بھی مزید دیگر ارواح ہیں۔

۱۔ ارواح کی پہلی قسم (حضرت علامہ) قیصری[رح] "شرح فص الآدمیہ" میں فرماتے ہیں کہ "روح کی قسمیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں اہلِ جبروت بھی ہیں۔ جیسے عقلِ اول (حضرت جبرئیل علیہ السلام) اور وہ فرشتے جو نگہبان و محافظ ہیں اور آسمانی فرشتے اور عناصرِ بسیط (وہ اصلی بنیادیں جو غیر مرکب ہوں) اور وہ عناصر بھی جو مرکب ہوں۔ اور یہ اپنے اندر تولیدی مادہ یا جوہر رکھتے ہیں، اگرچہ کہ ان کے طبقات، لائنوں، قطاروں اور درجات میں اختلاف بھی ہے۔

۲۔ ارواح کی دوسری قسم ان میں سے اہلِ ملکوت بھی ہیں جیسے نفسِ کلیہ (ملائکۃ العرش) اور آسمانی فرشتے اور وہ بسیط و مرکب مادے جن کے وجود (وظہور) میں کوئی شئے نہیں ہے۔ سوائے جبروت اور ملکوت میں سے کچھ عقل بھی ہے اور کچھ نفس بھی شامل ہے۔

۳۔ ارواح کی تیسری قسم ان نفوس پر منطبق ہے، جن کے جسم و بدن اور طبیعت علویات اور سفلیات اور پخ نیچ، اچھائی اور برائی والی خصلتوں اور عادتوں سے منسلک ہیں۔

۴۔ ارواح کی چوتھی قسم یہ وہ جسمانی ارواح ہیں، جو نفوسِ منطبقہ (منقوشہ) کے خادم و دربان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۵۔ ارواح کی پانچویں قسم یہ جنات و شیاطین کی ہے۔ (اور یہ حقیقت ہے کہ) قوی کا اطلاق اس کے توابع پر ہوتا ہے اور وہ توابع خواہ روحانی ہوں یا نفوسِ منطبقہ میں سے ہوں۔ پھر نفوس کے توابع یعنے ماتحات کے لیے (ماتحت) کہا جاتا ہے کہ روح کی قوتیں (دراصل) قلب کی قوتیں ہیں (اور اس طرح روح کی کمزوری بھی گویا قلب کی کمزوری ہے۔) اور (ان دونوں) روح اور قلب کے لیے کوئی الگ سی قوت اور طاقت نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں ایک ہیں اور تمام مظاہر اور طاقتوں کے دونوں سردار ہیں۔ انتہیٰ۔ (شرح فص الآدمیہ: للشیخ قیصری[رح])

۷۔ روح مکلّف و غیر مکلّف (ارواح کی اس تقسیم کے بعد اب یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ روح مکلّف ہے یا غیر مکلّف؟ (سو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ روح مکلّف بھی ہے اور غیر مکلّف بھی) پھر غیر مکلّف روح کو روحِ حیوانی بھی کہتے ہیں۔ (تمام حیوانات کی ارواح اسی غیر مکلّف جنس میں داخل ہے۔ کیوں کہ ان کے اندر جہاں نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی ہے۔ وہیں ان سے کسی طرح کی پوچھ گچھ بھی نہیں ہوگی اور جزا سزا کا معاملہ بھی نہیں رہے گا۔

اور روح مکلّف یا تو وہ خالص بُری اور بد روح ہوگی اور یہ شیاطین کی روحیں ہیں۔ نیز انسانوں اور جنّاتوں کی دونوں بُری روحوں پر بھی شیاطین کا اطلاق صادق آتا ہے۔ جیسے اللہ تعالےٰ خود ارشاد فرماتے ہیں: وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوّا شیٰطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا (ترجمہ) اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن شریر انسانوں کو اور جنّوں کو پیدا کیا ہے جو کہ سکھلاتے ہیں ایک دوسرے کو بناوٹ اور چالبازی کی باتیں دھوکہ دینے کے لیے۔

تشریح مترجم

غرض یہی وہ "شیاطین الانس والجن" ہیں جنھیں ایک دوسری جگہ سورۂ "ناس" میں بھی اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: "من الجنۃ والناس" یہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے والے خناس، جو دراصل انسانوں کے اندر بھی پائے جاتے ہیں اور وہ جناتوں میں بھی موجود ہیں۔ انھیں سوائے بدکاری، گنہگاری اور عصیاں شعاری سکھانے کے اور کوئی اچھا کام ان کی فطرت اور خمیر میں ہے ہی نہیں۔ یہ خالص شیطان کی روحیں ہیں۔ اور ان کے ضمن میں وہ بُری روحیں بھی آجاتی ہیں جو اپنے اندر شیاطین کی خصلتیں اور چالیں چلتی ہیں اور یہ انسانوں میں بھی ہیں۔ اور جناتوں میں بھی۔ یعنے بُرے انسان اور بُرے جنّات بھی حقیقت میں ثانی شیطان ہی ہیں۔ اسی لیے انھیں قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے شیٰطین الانس والجن سے یاد کیا ہے۔

اور جیسے دوسرے معنی میں یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے اعمال کے اعتبار سے تین قسم کی مخلوق پیدا کی ہے۔ (۱) ایک وہ ہے جس کی ضمیر و خمیر اور فطرت میں برائی کے سوا کوئی اچھا عمل ہے ہی نہیں۔ وہ برائی اور گندے کاموں کی طرف ہی مائل ہے اور وہ ہے شیاطین کی جماعت۔

پھر اس کے اندر بھی انسانوں میں سے وہ بُرے لوگ شامل ہیں جو صرف بُرے خیالوں کے سوا اچھے خیالات نہیں رکھتے اور انھیں اس کی توفیق بھی نہیں ہوتی اور وہ جنّات بھی اس کے اندر شامل ہیں جنھیں اعمالِ صالحہ کی توفیق نہیں ہوتی۔

اور دوسری مخلوق وہ ہے جو کبھی نیکیاں بھی کرتی ہے اور برائیاں بھی اور اس کی خمیر اور فطرت میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں اور یہ قسم (جنس)، بنی نوعِ انسان و جنّات میں سے ہے جو من حیث المجموع اچھائیاں اور برائیاں دونوں صفات سے ملی جلی اور مخلوط ہے۔

پھر تیسری مخلوق یا جنس وہ ہے، جس کی ضمیر و خمیر اور فطرت میں سوائے نیکیوں کے برائیوں اور برے کاموں کا وجود و ظہور ازل سے ہے ہی نہیں۔ خالص صالح اعمال، نیکیاں اور اچھائیاں ہی ان کی فطرت اور خمیر میں موجود ہے اور یہ فرشتوں کی جماعت ہے۔

تخلیقِ کائنات کے تنوع میں خیر و شر کی اس تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضہ جو تکوینًا ہے وہ اسی بات کا مقتضی ہے کہ نظام عالم کو جب تک قائم رکھنا منظور ہے خیر و شر کی قوتوں میں سے کوئی قوت بھی زائل نہ ہونے پائے

بلکہ موجود ہو۔ اس لیے نیکی اور بدی، ہدایت وضلالت کی حریفانہ جنگ ہمیشہ سے قائم ہی ہے اور قائم ہی رہے گی۔ جس طرح اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو مشرکین ومعاندین، منافقین ومخالفین، بے ہودہ اور فرسودہ فرمائشوں سے زک دیتے اور رنج پہنچاتے ہیں اور لوگوں کو صراطِ مستقیم اور جادۂ حق سے ہٹانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ اسی طرح اگلی اُمتوں میں ہر پیغمبر کے مدمقابل طاغوتی، شیطانی قوتیں کام کرتی رہی ہیں کہ پیغمبروں کو اُن کے پاک مقاصد اور ارادۂ ہدایتِ خلق اللہ میں رکاوٹ ڈالیں اور کامیاب نہ ہونے دیں۔ اسی ناپاک اور فاسد عزائم کی غرض کے لیے شیاطین الجن اور شیاطین الانس کی تخلیق عمل سے آئی کہ وہ آپس میں باہم تعاون کرتے رہیں اور ایک دوسرے کو فریب دہی، ملمع سازی اور دھوکہ بازی کی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے رہیں۔

پھر ان کی یہ عارضی چھوٹ وآزادی بھی دراصل اسی عام حکمت اور نظام تکوینی کے ماتحت ہے جو تخلیقِ عالم میں اللہ تعالےٰ کے منشاء وقدرت اور عام حکمت پر منحصر ہے جو یقیناً رازہائے سربستہ کی ایک اہم الہم کڑی ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ ایک جنس اپنی مخالف جنس سے ہی جانی پہچانی جاتی ہے اور "تعرف الاشیاء باضدادھا" اسی معنی میں ہے۔ لہٰذا صحیح پہچان اور قدر وقیمت تو درحقیقت مخالف جنس یا شئی سے ہی ہوتی ہے۔ جس طرح رات کی قدر و پہچان دن سے ہے اور دن کی قدر و پہچان رات سے ہوتی ہے۔ اسی طرح سردی کی قدر گرمی سے اور گرمی کی قدر سردی سے ہوتی ہے۔

غرض مرد اور عورت، دن رات، روشنی اندھیری، سردی گرمی، سفیدی سیاہی، بلندی پستی، سختی نرمی، موٹی دبلی، میٹھی کڑوی وغیرہ اضداد کی پہچان وشناخت جہاں ضروری ہے، وہیں نیکی اور بدی کا پایا جانا اور ان دونوں کا اجتماع ہونا بھی ایک ضروری اور لابدی امر ہے۔ ان کے بغیر کسی ایک کی قدر و پہچان اور صحیح شناخت نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ (تشریح ختم)

روح کی تین قسمیں

(آگے حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ روحِ مکلّف کی تعریف کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ) وہ روحِ مکلّف یا تو خالص بُری روح ہوگی جیسے شیاطین کی روح ہے (۲) اور یا وہ نیک و بد سے مختلط ہوگی (یعنے اس کے اندر نیکیاں اور برائیاں دونوں جمع ہوں گی) اور ان کی بھی دو قسم ہیں۔ (الف) ارواحِ جن اور (ب) ارواحِ بنی آدمؑ۔

۳۔ روح کی تیسری قسم یہ نیک محض کی ہے۔ (یعنے اس کی خمیر وضمیر اور فطرت میں خالص نیکیاں ہی نیکیاں ہوں گی۔) اور یہ فرشتوں کے نام سے (نام زد اور پکارے جاتے ہیں) ہیں۔ گنہ گاری، نافرمانی اور عصیاں شعاری کی ان کے اندر کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ان باتوں سے پاک ہیں۔ بَری ہیں اور اللہ تعالےٰ اسی کو فرماتے ہیں ولا یعصون اللہَ ما آمرھم ویفعلون مایؤمرون (ترجمہ: جن باتوں کا اللہ نے انھیں حکم دیا ہے وہ اس کی ذرہ برابر بھی نافرمانی اور خلاف ورزی نہیں کرتے بلکہ جن باتوں کا انھیں حکم ملا ہے ان ہی باتوں پہ وہ عمل کرتے ہیں۔)

اس طرح ان فرشتوں کے حواس و اعضاء و جوارح ان کی جان کے تابع ہوتے ہیں اور یہ تمام فرشتے حق تعالیٰ و تقدس کے مطیع و فرمانبردار ہوتے ہیں۔

فرشتوں کی پانچ قسمیں فرشتے پانچ قسم کے ہوتے ہیں۔(۱) پہلی قسم مُہیمہ کی ہے (یعنے اللہ کی ذات کے ساتھ فریفتہ، شیفتہ اور عاشقِ گم گشتہ ہوتے ہیں۔) اور انھیں جسم سے مطلق تعلق نہیں ہے۔ (کسی طرح کا بھی) تاثیری اعتبار سے بھی اور تدبیری اعتبار سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ تو خود سے اور نہ اپنے غیر سے انھیں کوئی تعلق و رشتہ ہے اور نہ عالم سے اور نہ عالم والوں سے۔ وہ کسی قسم کی خبر نہیں رکھتے۔ (گویا انہیں کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے اور وہ تمام عالم اور جہانوں سے پورے بے خبر و بے نیاز رہتے ہیں۔) اور ان کے آپس میں بھی بعض کو بعض نہیں دیکھتے اور حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے مشاہدہ میں ایسے شیفتہ اور فریفتہ اور عاشقِ گم گشتہ ہوتے ہیں کہ بس شب و روز اس کی عبادت میں مستغرق و منہمک ہو کر یا تو وہ سجدے کی حالت میں پڑے رہتے ہیں یا رکوع کی حالت میں رہتے ہیں یا قیام کی صورت میں کھڑے رہتے ہیں۔ (اور بس)

فرشتوں کی پہلی قسم کو حضرت آدمؑ کے سجدے کا حکم نہیں تھا۔ قرآن و حدیث میں فرشتوں کی اس پہلی قسم کو ملاءِ اعلیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ وہ جماعت ہے، جسے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا مکلّف نہیں بنایا گیا تھا۔ اس لیے وہ سجدے سے بَری تھے۔ اس پر عقلی دلیل یہ ہے کہ مکلّفات وہ ہوتے ہیں، جو شعور و احساس اور تمیز و ادراک کا مادہ رکھتے ہوں۔ اور جو شعور و احساس سے عاری ہوتے ہیں، وہ اس کے مکلّف نہیں ہو سکتے۔

اس پر نقلی دلیل یہ ہے کہ حق جل مجدہٗ قرآن شریف میں فرماتے ہیں: اَستَکبَرتَ اَم کُنتَ مِنَ العٰلِین؟ (بڑائی اختیار کی اور کیا تو (واقعی) بڑھ تر تھا؟) حدیث شریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان فرشتوں کی بے انتہا کثرت ہے۔

فرشتوں کی دوسری قسم ملائکہ کی دوسری قسم یہ عقولِ مجرّدہ ہے جو تاثیر کے ساتھ جسم سے تو تعلق رکھتے ہیں مگر تدبیر کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے اور انھیں ملائکۂ جبروتیہ اور ملائکۂ مسخّرہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہ بارگاہِ الوہیت کے حُجّاب (دربان) بھی ہیں۔ اور فیضِ ربوبیت کے بزرگ و بلند تر بھی اور عقول رئیس ارواح اقلام (کنایتہً حضرت جبرئیل علیہ السلام) کے صفِ اول میں اجازت یافتہ ہیں اور دنیوی حکومت و پادشاہت کی تسخیر و کنٹرول اور اس کے جمع کرنے اور قابو میں لانے اور لکھنے کا کام ان فرشتوں کے ذمہ ہے۔

روحِ اعظم، عقلِ اوّل، عقلِ کل، نورؐ، ام الکتاب اور قلمِ اعلیٰ اور انھیں اس لحاظ سے کہ وہ (مخلوق کے واسطے کے بغیر ہی) ذات (حق) کے ساتھ زندہ اور غیر ذات کو زندہ کرنے کی وجہ روحِ اعظم کہتے ہیں اور انھیں تعقّل (جاننے، سمجھنے اور سمجھ بوجھ) کے لحاظ سے مخترعِ خود (موجدِ خود) اور اپنی ذات کے بھی اور تمام اشیاء کے بھی بانی اور موجد ہونے سے عقل کہتے ہیں۔ اور اوّلیت کے اعتبار سے انھیں عقلِ اول (کنایتہً حضرت جبرئیل علیہ السلام) اور کلّیت کے اعتبار سے عقلِ کل کہتے ہیں اور انھیں اس لحاظ اور اعتبار سے کہ وہ (بغیر کسی مخلوق کے واسطے کے) خود سے ظاہر ہیں اور غیر سے مُظہر

ہیں نور کہتے ہیں اور اس لحاظ سے کہ وہ دُنیا کے تمام اشیاء کے محیط گھیرے ہوئے اور ان پرچھائے ہوئے ہیں۔ اس لیے انہیں اجمالاً اُم الکتاب کہتے ہیں۔ اور یہ لوحِ محفوظ پر صفات نقوش کے علوم کی مصوّری، نقاشی اور گلکاری کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے انہیں قلم اعلیٰ کہا جاتا ہے۔

مقام جبروت اور ملائکہ کی خدمات

عقلِ کل اور عقولِ جزئیہ فلکیہ (آسمانیہ) اور عنصریہ مرکبہ ان کے طبقات اور صف بندیاں اور درجات کے اختلاف کے ساتھ حضرات اسرافیلؑ، میکائیل اور عزرائیل اور جبرئیل علیہم الصلوٰۃ والسلام مقام جبروت میں قیام فرما ہیں۔ (اور دُنیا کے) امورِ عظام و نظام بھی اسی قسم میں داخل ہیں۔ مثلاً نفخ صور (صور پھونکنا) اور نفخ روح (روح بھرنا) جانوروں اور انسانوں اور دیگر اجسام میں اور تقدیر ارزاق و آجال (رزق اور حیات و ممات کے مقدرات) ہواؤں کا چلانا، بادلوں کا دوڑانا، برسات برسانا اور درختوں کے پتّوں، پھلوں کا اُگانا، رزق و دولت کے اسباب مہیّا کرنا اور امراض و آفات کا پہنچانا، جان نکالنا، اور شرائع میں وحی اتارنا اور (طوفانی) ہواؤں اور جنگوں کے ذریعہ فتح و شکست دینا اور ملک و دولت کو تتر بتر اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینا وغیرہ اقسام کی تدبیریں انہیں فرشتوں کے توسط اور ذریعہ سے عالم میں انجام پاتے ہیں۔ (بحوالہ تفسیر عزیزیہ)

اور وہ فرشتے جو الگ الگ خدمات پر مامور ہیں (اور جنہیں قرآن کی زبان میں اس طرح کہا گیا ہے کہ):

نٰصِرٰت یعنے اللہ کے ناموں، صفاتوں میں مومنین و تابعین اہلِ ارض کی مددیں لگے ہوئے ہیں۔ اور صٰفّٰت یعنے اطاعت و فرمانبرداری میں صف بہ صف کھڑے ہوئے ہیں۔ اور زٰجِرٰت شیاطین کو مار بھگانے والے اور شیطانوں کی ضرر رسانی سے انسانوں کو باز رکھنے والے اور تٰلِیٰت ذکرِ خداوندی میں مشغول و منہمک رہنے والے اور مرسلٰت ہواؤں کو ہنکانے والے اور عٰصِفٰت سخت اور زور سے ہنکانے والے اور فٰرِقٰت جدا کرنے والے اور نٰشِرٰت بکھیرنے اور منتشر کرنے والے۔ اور ملقیٰت ذکر کو دل میں ڈالنے والے اور نٰزِعٰت روح کو سختی سے کھینچنے والے اور نٰشِطٰت بند چھڑانے والے اور سٰبِحٰت بہت دوڑنے والے اور سٰبِقٰت فرماں برداری میں جلدی کرنے والے اور مدبّرٰت تدبیر غور و خوض کرنے والے اور مقسّمٰت بانٹنے والے (نیکیوں اور بدلیوں کے) یہ سب اسی زمرے اور قسم میں آتے ہیں۔ (بحوالہ فتوحات)

تشریح مترجم ملائکہ کی اس تقسیم میں کسی قدر تفصیل بھی ہے جو اوپر گزری تاہم مزید تشریح و توضیح کی غرض سے اس کی تسہیل کو ضروری سمجھ کر عرض کر رہا ہوں کہ "النٰصِرٰت" یہ وہ فرشتے ہیں جو اللہ کے نام لیواؤں کی نصرت کرتے ہیں، برائیوں کی ملامت کرتے ہیں، مومنین کی مدد اور توبہ کرنے والوں کی بھی مدد اور زمین والوں پر بھی ان کی نصرت اور تائید ہوتی رہتی ہے۔ "الصٰفّٰت" یہ وہ فرشتے ہیں جو صف باندھے قطار در قطار کھڑے ہوتے ہیں۔ جو حکم الٰہی کو سننے کے لیے اپنے اپنے مقام پر درجہ بدرجہ صف بہ صف کھڑے ہوئے ہیں۔ "الزٰجِرٰت" وہ فرشتے جو شیطانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگاتے ہیں یا بندوں کو ارتکابِ معاصی سے روکتے ہیں اور نیکی کی بات

سمجھاتے ہیں۔ "الثّلیٰت" وہ فرشتے جو احکامِ الٰہی سننے کے بعد پڑھتے اور یاد کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بتاتے رہتے ہیں۔ "المرسلٰت" وہ فرشتے جو نرم اور خوش گوار ہواؤں پر مسلط ہیں کہ جن کے چلنے سے لوگ بے حد مسرور و محظوظ ہوتے ہیں اور ساری مخلوق اس سے محظوظ ہو کر شکر ادا کرتے ہوئے بہت سی توقعات اور منافع کے اثرات لیتے ہیں، جو اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اور جب یا کچھ دیر بعد پھر وہی ہوا "العٰصفٰت" میں تبدیل ہو جائے تو اس وقت مخلوق پناہ مانگنے لگے۔ "العٰصفٰت" وہ فرشتے ہیں جو ہواؤں کو تیز و تند آندھی اور طوفانی شکل سے ہنکانے پر مامور ہیں اور جب وہ اس طرح ہنکانے لگیں اور غضب ڈھانے لگیں تو لوگ اس خرابی ہنگامہ سے گھبرا کر فریادی ہوتے ہیں اور بُری طرح بلبلا اٹھتے ہیں اور پناہ مانگنے لگتے ہیں۔

یہی مثال دنیا و آخرت کی ہے۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو ابتدًا مفید اور نافع سمجھے جاتے ہیں اور ان پر بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور جب یہی کام قیامت کے دن اپنی اصلی شکل وصورت اختیار کر لیں اور سخت ترین اور بدترین خوفناک، دردناک، خطرناک اور ہولناک صورت میں ظاہر ہونے لگیں تو لوگ اس سے بے اختیار ہو کر پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ "النّٰشرٰت" اور "الفٰرقٰت" وہ فرشتے جو ہواؤں کی قسم بخارات وغیرہ کو اٹھا کر اوپر پہنچاتے ہیں اور ابر کو اُبھار کر پھیلا دیتے ہیں اور جہاں جہاں پہنچانا ہے بحکمِ خداوندی اس کے حصّے کر کے بانٹتے ہیں اور بارش کے بعد بادلوں کو پھاڑ کر اِدھر اُدھر متفرق کرنا یہ کام ان ہی کے سپرد ہے۔

پھر اشیاء کی کیفیات مثلاً خوشبو، بدبو وغیرہ کو پھیلانے اور ان کے لطیف اجزاء کو جدا کر کے لے اڑانے اور ایک چیز کو اٹھا کر دوسری چیز سے جا ملانے کا کام یہ ہوا کی خاصیت میں سے ہے۔ تو یہ جمع و تفریق جو ہوا کا خاصہ ہے۔ یہ درحقیقت آخرت کا ایک نمونہ ہے۔ جہاں حشر و نشر کے بعد لوگ جدا ہوں گے اور ایک جگہ جمع ہونے کے بعد الگ الگ پہنچا دیے جائیں گے۔ "الملقیٰت" وہ فرشتے ہیں جو ہواؤں پر مامور ہیں اور القاءِ ذکر کرتے ہیں کہ وحیٔ الٰہی کی آواز کانوں تک پہنچاتے ہیں۔

غرض یہاں "المرسلٰت"، "العٰصفٰت"، النّٰشرٰت، الفٰرقٰت اور الملقیٰت سے ان پانچوں صفات کا مصداق، بعض مفسرین کے قول کے مطابق ہوائیں مراد ہیں۔ اور بعض مفسرین نے فرشتوں کو قرار دیا ہے اور بعضوں نے پیغمبروں کو اور بعض مفسرین نے پہلی چاروں صفات سے ہوائیں مراد لی ہیں اور پانچویں سے فرشتے مراد لی ہے۔ اس کی پوری تفصیل "تفسیر روح المعانی" میں موجود ہے دیکھ لیں۔

"النّٰزعٰت" وہ فرشتے جو کافروں کی رگوں میں گھس کر ان کی جان سختی سے گھسیٹ کر نکالتے ہیں۔ "النّٰشطٰت" وہ فرشتے جو مومن کے بدن سے جان کی گرہ کھول دیں تو وہ خوشی خوشی عالمِ پاک کی طرف دوڑے جس طرح کسی کا بند اور گرہ کھول دیے جائیں تو وہ آزاد ہو کر خوشی سے بھاگتا ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ یہاں بدن کا ذکر نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ روح کا ذکر چل رہا ہے۔ غرض نیک روح خوشی سے عالم قدس کی طرف دوڑتی ہے اور بُری روح پریشانی کے عالم میں بھاگتی ہے مگر اُسے گھسیٹا جاتا ہے کہ وہ عالم قدس کی طرف کہیں نہ جائے۔

"السّٰبحٰت" اور "السّٰبقٰت" یہ وہ فرشتے ہیں جو روحوں کو لے کر زمین سے آسمان کی طرف اس سرعت و سہولت سے چلتے ہیں گویا بے روک ٹوک پانی پر تیر رہے ہوں اور پھر ان ارواح کے بارے میں اللہ کا جو حکم ہوتا ہے اس کے بجالانے میں تیزی کے ساتھ دوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔

"المدبرٰت" اور "المقسّمٰت" یہ وہ فرشتے ہیں جو ان ارواح کے متعلق چاہے ثواب کا حکم ہو یا عذاب کا دونوں حکموں میں سے ہر حکم کی تدبیر و انتظام کرتے ہیں یا مطلقاً وہ فرشتے بھی مراد ہیں جو عالم تکوین کی تدبیر و انتظام پر مسلّط ہیں۔ اور ارواح نیک و بد کے لائق امور احکام کی تعیین و تقسیم بھی ان ہی کے ذمّہ مامور ہے۔ (تشریح ختم)

فرشتوں کی تیسری قسم فرشتوں کی تیسری قسم وہ نفوسِ مجردہ کی ہے جو تدبیر کے ساتھ بدن (جسم) سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں ملائکہ ملکوتیہ، ملائکہ مدبرہ، قلوبِ مجردہ اور نفوسِ ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ اور نورانی جسموں کی تدبیر اور ظلمانی جسموں کی تدبیر اور اجسام طبیعیہ اور عنصریہ بسیطہ اور مرکبہ کی تدبیر بھی ان ہی فرشتوں کے توسط اور ذریعہ سے ہوتی ہے اور کبھی دیگر اجسام میں بھی یہ اثر انگیز ہوتے ہیں بغیر کسی جسمانی آلہ کی مدد کے۔ جیسے 'معجزہ' ہے 'کرامت' ہے، جادو اور نظر بد کا اثر ہے نظرِ بد کا لگنا (اور اثر انداز ہونا) شریعت کی نگاہ میں ایک مانی ہوئی بات ہے۔ چناں چہ "ترمذی شریف" میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "العین حق"۔ نظر بد کا لگنا صحیح ہے۔

پہلی صف کے انفاس پہلی صف میں نفوس ارواح الواح اور فرشتوں کا بادشاہ تدبر کے ساتھ ہوتا ہے جسے کُلّیت کے اعتبار سے نفسِ کل کہتے ہیں اور اس کے اندر تفصیل سے اشیاء کے ظاہر ہونے کی وجہ سے اس کو "کتاب مبین" بھی کہتے ہیں۔ اور کبھی ان میں تغیّر و تبدل کے نہ ہونے کی وجہ سے اُسے "لوح محفوظ" سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ملکوتِ اعلٰی ان ہی ارواحِ ملکوتیہ میں سے وہ ارواح بھی ہیں جن کا تعلق و تصرف علویات سے ہوتا ہے۔ یعنے آسمان اور آسمانوں ہی سے ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ملکوت اعلٰی (اعلٰی فرشتے) کہلاتے ہیں اور یہ نفسِ کُل اور نفوس جزئیہ فلکیہ، جن کے طبقات اور صفوف و درجات باختلاف اسی مقام ملکوت اعلٰی میں قیام پذیر ہوتے ہیں۔

حاملانِ عرش محافظانِ کرسی، داروغان جنّت و دوزخ، ساکنانِ سدرۃ المنتہٰی اور مجاورانِ بیت المعمور سیاروں کے بھگانے والے، آسمانوں کے محرکان اور ان کے دربانان جو علوی اجسام سے تعلق رکھتے ہیں یہ سب اسی قسم (ملکوت اعلٰی) میں داخل ہیں۔ (حوالۂ تفسیر عزیزی)

ملکوتِ اسفل اور وہ ارواح جن کا تعلق و تصرف سفلیات سے ہوتا ہے یعنے

عنصر اور عنصریات میں تصرف ہوتا ہے۔ یہ ملکوت اسفل وادنیٰ (چھوٹے فرشتے) کہلاتے ہیں۔

یہ فرشتوں کی تیسری قسم نفوس جزئیہ عنصریہ بسیط و مرکبہ جو اپنے طبقات، صفوف و درجات کے اختلاف کے ساتھ اسی مقام ملکوت اسفل (وادنیٰ) میں قیام کئے ہوئے ہیں۔

ہواؤں اور ابر کے فرشتے، بارش اور اس کی بوندوں کے پہنچانے والے، دریاؤں اور پہاڑوں، درختوں اور پتوں اور بنی آدم کی نگہبانی اور حفاظت کرنے والے اور ان کے اعمال کی کتابت کرنے والے

اور اللہ کو دل سے یاد کرنے اور ذکر و ارادہ کرنے والوں کی مدد و اعانت کرنے والے فرشتے جو اجسام سفلی سے تعلق رکھتے ہیں یہ اسی قسم اسفل و ادنیٰ (کے مقام) میں ہیں۔ (بحوالہ تفسیر عزیزی)

ہر چیز کا ایک فرشتہ حدیث شریف میں آتا ہے پہاڑوں کا بھی فرشتہ ہے، ہواؤں کا بھی فرشتہ ہے۔ گرج کا بھی فرشتہ ہے، بجلی کا بھی اور بادلوں کا بھی فرشتہ ہے۔ اور دوسری حدیث میں اس طرح آتا ہے ینزل مع کل قطرۃ ملک ہر ایک قطرہ کے ساتھ ایک ایک فرشتہ اترتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ہر مؤمن پر ایک سو ساٹھ ۱۶۰ فرشتے موکل ہیں۔ (یعنی ان کے سپرد کچھ کام کئے گئے ہیں کہ وہ آدمی کے خیال، وہم، عقل اور دل کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور پیدا ہونے والی بری صورتوں اور خطرات اور برے خیالات و خواہشات اور بری راہ و چلن سے اس کی حفاظت کرتے رہیں۔) جو شیطانوں کو اس مومن سے دور ہٹاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک مکھی کو بھی شہد کے پیالہ سے بھگاتے ہیں۔

اور صاحب کشف کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ جب تک سات فرشتے نہ ہوں گے شاخ (ڈالی) سے ایک پتہ کا وجود بھی نہیں ہو سکے گا۔ (محققین نے یہاں سات فرشتوں سے قوائے سبعہ جسمانیہ مراد لیا ہے۔)

محافظ فرشتوں کا ثبوت قرآن اور انبیاء کی زبان سے اور سورۂ "رعد" میں عام محافظ فرشتوں کا بیان موجود ہے کہ وہ ہر مومن و کافر (مرد و عورت) کو جسمانی آفات و تکالیف سے حفاظت کرتے ہیں اور سورۂ "انعام" میں ہر شخص کی جان کی حفاظت کا بیان آیا ہے۔ (جو ان فرشتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔) اور سورۂ "انفطار" میں ایسے دوسرے فرشتوں کا تذکرہ ہے۔ جو انسانوں کے نیک و بد اعمال کے لکھنے پر مامور و مقرر ہیں۔ اور سورۂ "قاف" میں ایسے فرشتوں کا ذکر موجود ہے جو انسان کے ہر لفظ و جملہ اور ہر حرف پر مقرر اور نگران ہیں اور انہیں یمین (سیدھے) و شمال میں شمار کیا گیا ہے، جو برابر نامۂ اعمال لکھنے پر مامور ہیں۔ اور انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم السلام کے فرمودات و کلمات میں آیا ہے کہ ان لکل شیئ ملکا۔ (ترجمہ: بے شک ہر چیز کے لیے ایک ایک فرشتہ مقرر ہے)

تشریح مترجم حضرت قطب ویلور قدس سرہ نے اوپر سورۂ "رعد"، سورۂ "انعام" سورۂ "انفطار" اور سورۂ "قاف" کے حوالوں سے محافظ فرشتوں کی مختصر تفصیل پیش فرمائی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسی کی مزید تفصیل و تشریح بھی عرض کردوں۔ چنانچہ سورۂ "رعد" کی آیت یہ ہے: لہ معقبٰت من بین یدیہ ومن خلفہ

یحفظونہ من امر اللہ ۝ (سورۃ رعد)

(ترجمہ: اس کے پہرے والے ہیں۔ بندے کے آگے سے اور پیچھے سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں اللہ کے حکم سے)۔ یعنی ہر بندہ کے ساتھ خدا کے فرشتے مامور ہیں۔ جن میں بعض اس کے سب اگلے پچھلے اعمال لکھتے ہیں اور بعض خدا کے حکم کے مطابق اُن بلاؤں کو دُور کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، جن سے اللہ تعالےٰ بندہ کو بچانا چاہتے ہیں۔ جس طرح اس عالم میں عام عادت اللہ یہی ہے کہ جو چیز پیدا کرنا چاہے۔ اس کے ظاہری اسباب و ذرائع مہیّا کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس نے کچھ باطنی اسباب بھی پیدا کر دیے ہیں جو بظاہر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔

اور سورۃ "انعام" کی آیت یہ ہے: وھو القاھر فوق عبادہٖ ویرسل علیکم حفظۃً حتی اذا جاء احدکم الموت توفتہ رُسُلنا وھم لا یفرطون ۝ (سورۃ انعام)

(اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان، یہاں تک کہ جب آ پہنچے تم میں سے کسی کو موت تو قبضہ میں لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اور وہ کوتاہی اور لاپرواہی نہیں کرتے۔

یہاں "حفظۃ" سے وہ فرشتے مراد ہیں جو تمہاری اور تمہارے اعمال کی نگہبانی اور حفاظت کرتے ہیں اور لا یُفرطون سے وہ فرشتے مراد ہیں جو روح قبض کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں اور یہ اس معاملہ میں حکم عدولی اور کوتاہی نہیں کرتے۔ بلکہ حکم الٰہی کی پوری تابعداری اور فرماں برداری میں لگے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔

اور سورۃ "انفطار" کی آیات یہ ہیں: وانّ علیکم لحٰفظین ۝ کراما کاتبین ۝ یعلمون ما تفعلون ۝ (سورۃ انفطار)

(ترجمہ: اور تم پر نگہبان مقرّر ہیں۔ عزت والے، عمل لکھنے والے۔ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ یعنی یہ فرشتے نہ تو خیانت کرتے ہیں اور نہ کوئی عمل لکھے بغیر چھوڑتے ہیں۔ نہ اس سے تمہارے اعمال پوشیدہ ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ جب سب عمل ایک ایک کر کے اس اہتمام و انصرام سے لکھے جا رہے تو کیا یہ سب دفتر یوں ہی بیکار و بے سود چھوڑ دیا جائے گا؟ اور بفحوائے آیت: افحسبتم انما خلقنٰکم عبثاً؟ (کیا تم یہ گمان کرنے لگے ہو کہ تمہیں یوں ہی بیکار پیدا کیا گیا ہے؟) ہرگز نہیں! پھر تو یہ بات بھی ذہن نشین رہے اور یاد رکھیں کہ یقیناً ہر شخص کے اعمال اس کے آگے لائے جائیں گے اور اس کا اچھا یا بُرا پھل اسکو چکھنا پڑے گا۔ سچ ہے: ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو ‌ ‌ ‌ ‌ از مکافاتِ عمل غافل مشو

اور سورۂ قاف کی آیتیں ہیں، اذ یتلقی المتلقیٰن عن الیمین وعن الشمال قعید ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیبٌ عتیدٌ ۝ (ترجمہ: جب لیتے جاتے ہیں دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھا۔ نہیں بولتا کچھ بات جو نہیں ہوتا اس کے پاس ایک راہ دیکھنے والا تیار۔ یعنی دو فرشتے خدا کے حکم سے ہر وقت اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں جو لفظ و جملہ اس کے منہ سے نکلے فوراً وہ لکھ لیتے ہیں نیکی داہنے والا فرشتہ لکھتا ہے اور بدی بائیں والا۔ (تشریح ختم۔) (جاری)

نقوشِ طاہر

کمسنی کے علمی کمالات

حضرتِ مولانا ابوالحسن صدرالدین سیّد شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمہ سابق ناظم دارالعلوم لطیفیہ ویلور

حضرت مولانا ابوالحسن صدرالدین سیّد شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمہ سابق ناظم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان، ویلور کا یہ مختصر مضمون سالنامۂ اللطیف ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ قارئینِ کرام کی معلومات کے لیے اس شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے بعض علماء کی کم عمری اور کم سنی کے علمی واقعات کو قلمبند کیا ہے جو مفید اور پُراز معلومات ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ایک حقیقت یہ آشکار ہوتی ہے کہ بزرگی علم سے ثابت ہوتی نہ کہ عمر سے اور آدمی کے فضل و کمال کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب کہ وہ نطق و گویائی میں سلیقہ اور قوت رکھتا ہو۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

جب تک آدمی بات نہیں کرتا اُس وقت تک اُن کا عیب و ہنر پوشیدہ رہتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو کم سنی اور کم عمری میں اسلامی علوم و فنون سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ دارالعلوم لطیفیہ، مکانِ حضرت قطب ویلور کی یہ خصوصیت ہے کہ اکثر و بیشتر طلبا اپنی کم عمری ہی میں مولوی عالم، مولوی فاضل کی سندیں حاصل کر لیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یونیورسٹی کے امتحانات میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے امتحانات میں شرکت کی عمر کم از کم پندرہ سال ہوتی ہے۔ اس عمر میں انٹرنس امتحان دینے کے دو سال بعد پریلمنیری امتحان ہوتا ہے۔ اسی طرح سے انگریزی دانوں کے لیے S.S.L.C امتحان میں شرکت کی عمر پندرہ سال رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد P.U.C کی ایک سال تعلیم ہوتی ہے۔ بعد ازاں B.A کی تعلیم اسی طرح کوئی انیس (۱۹) سال کی عمر میں تعلیم پوری ہوتی ہے۔ B.A کے امتحان کے بعد کل ہند I.A.S امتحان کے مقابلہ

میں شرکت کرتے ہیں۔ اس امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد انتخاب ہوتا ہے۔ انھیں دو سال کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ٹریننگ کے بعد انھیں کسی ڈویژن کا سب کلکٹر یا کمشنر بنا دیا جاتا ہے۔ جہاں اس وسیع علاقہ پر اس کم عمری میں اس کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یہ صرف محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے کہ صلاحیتیں اُجاگر ہو جاتی ہیں۔ اس کم سنی میں علم و دانش کے متعلق مولانا احمد بن الفضل جو ایک زبردست عالم و فاضل گزرے ہیں، اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں :

"ابھی میری کم عمری کا زمانہ تھا۔ خلیفۂ بغداد کے دربار میں ایک روز جانے کا اتفاق ہوا۔ میں وہاں پہنچ کر دیکھا کہ بہت سے معمّر باکمال علماء موجود تھے۔ میں نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے گفتگو شروع کی۔ خلیفہ یہ دیکھ کر غضب ناک ہوا کہ ان علماء اور میری موجودگی میں ایک بچّہ کو بولنے کی اتنی جرأت! خلیفہ کی ڈانٹ سے مرعوب ہوئے بغیر میں نے کہا: "اے امیر المؤمنین! میں ہُدہُد سے چھوٹا نہیں اور آپ حضرت سلیمان علیہ السلام سے بڑے نہیں۔ ہُدہُد نے کہا کہ میں وہ خبر جانتا ہوں جو آپ نہیں جانتے! میں ملکِ سبا سے آپ کے لیے ایک خوش خبری لایا ہوں،" آپ نے مزید فرمایا: اے امیر المؤمنین کیا آپ کو معلوم نہیں کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالےٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک نکتہ کا حل سمجھا دیا جو آپ کے والدِ بزرگوار حضرت داؤد علیہ السلام کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اگر علم و عقل معمر لوگوں کا ہی حصّہ ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے بڑھ کر حق دار ان کے والد حضرت داؤد علیہ السلام ہوتے۔"

خلیفۂ وقت اور علمائے حاضرین اس برجستہ جواب سے متأثر ہو کر محوِ حیرت ہو گئے۔

حضرت امام محمد شافعی علیہ الرحمہ نے اپنی کم عمری میں ایک زبردست و ناممکن مسئلہ کا حل پیش فرمایا ہے :

یہ خلیفۂ بغداد ہارون رشید کا زمانہ تھا۔ ہارون رشید جب اپنی بیوی سے گفتگو کر رہا تھا کہ بے تکلّفی کے عالم میں کچھ ایسی گفتگو ہو گئی کہ ان کی بیوی زبیدہ خاتون سے کہا کہ تم جہنمی ہو۔ بادشاہ کی زبان سے ان کلمات کا نکلنا ہی تھا کہ اُن دونوں کے ہوش ٹھکانے لگے اور زبیدہ خاتون نے ہارون رشید سے فوراً پردہ کیا۔ دونوں رنج والم میں مبتلا ہوئے۔

خلیفہ نے دربار منعقد کیا اور جیّد علماء کو طلب کیا۔ اور اُن کے سامنے یہ مسئلہ پیش کرتے ہوئے ان سے اس مسئلہ کا حل طلب کیا۔ علماء فقہ کی کتابوں کی اوراق گردانی میں سرگرداں رہے۔ لیکن اس مسئلہ کا حل نہ مل سکا۔ خلیفہ نے جب دریافت کیا تو انھوں نے اپنی مایوسی اور مجبوری کا اظہار کیا۔ آخر میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے کہا: بتاؤ آپ نے کہا: ایسے نہیں ہو سکتا۔ آپ کو یہاں اور مجھ کو وہاں ہونا چاہیے۔ خلیفہ سمجھ دار تھا۔ تخت سے نیچے اُتر آیا اور آپ کو تخت پر جلوہ افروز کیا۔ پھر از سرِ نو معاملہ پیش کیا۔ سماعت کے بعد آپ نے دریافت کیا۔ پھر کہا: اے خلیفہ کیا آپ باوجود گناہوں پر قدرت رکھنے کے محض اللہ کے خوف سے باز رہے ہیں؟ ہارون رشید نے کہا: قسم ہے اُس خدائے قدوس وحدہٗ لاشریک کی میں نے گناہ کے کاموں پر باوجود قدرت رکھنے کے محض اللہ تبارک و تعالےٰ کے خوف سے گناہوں سے باز رہا ہوں۔ تو آپ نے کہا: الحمدللہ! اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے، جو شخص باوجود

قدرت رکھنے کے محض اللہ تبارک و تعالیٰ کے خوف سے گناہوں سے باز رہا ہوں۔ تو آپ نے کہا: الحمد للہ! اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، جو شخص باوجود قدرت رکھنے کے گناہوں کے کاموں سے محض میرے خوف و ڈر سے باز رہتا ہے، میں اس کو جنّت کی بشارت دیتا ہوں۔ آپ نے مزید فرمایا: میں فیصلہ دیتا ہوں کہ ہارون رشید جنّتی ہیں۔ میں اس مسئلہ کی نوعیت کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کیا۔ اگر ہارون رشید جہنمی ہوتے تو طلاق واقع ہوتی۔ چوں کہ یہ جنّتی ہیں اس لیے طلاق واقع نہیں ہوی۔

اہلِ دربار اور علماء کرام اس فیصلہ کو سُن کر انگشت بدنداں ہو گئے۔ آپ اس فیصلہ کو صادر فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف پچیس برس کی تھی۔

خلیفۂ بغداد اپنے دورِ حکومت میں قاضی یحییٰ بن اکثم کو اُن کے علم و عقل سے متاثر ہو کر، جب کہ ان کی عمر بیس۲۰ برس کی تھی بصرہ کا قاضی بنا کر بھیجا۔ وہاں کے لوگوں نے دیکھا کہ یہ بالکل کم عمر ہیں۔ تو اُن کو کم عمر قاضی پکارنا شروع کیا۔ ایک کثیر مجمع میں کسی منھ پھٹ نے آپ سے سوال کیا کہ: قاضی صاحب آپ کی عمر کیا ہے؟ آپ نے جواب میں کہا: کہ حضرت عباس بن اسید سے بڑا ہوں، جن کو حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد مکۂ مکرمہ قاضی بنایا تھا۔ اور میں معاذ بن جبل سے بھی بڑا ہوں، جن کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا اور حضرت کعب بن مسعود سے بھی میری عمر زیادہ ہے، جن کو امیر المؤمنین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی بصرہ کا قاضی بنایا تھا۔ قاضی یحییٰ بن اکثم کا یہ جواب سُن کر لوگوں نے آپ کو کم عمر قاضی پکارنا چھوڑ دیا۔ اور اہلِ بصرہ کی نظروں میں معزّز و مکرم ہو گئے۔

ایاس بن معاویہ نے اپنی کم عمری کے زمانہ میں ایک روز قاضیٔ دمشق کے سامنے ایک معمر آدمی کے خلاف اپنے حق کا دعویٰ کیا اور کہنے لگا کہ اس بڈھے نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور میرا مال کھا لیا ہے۔ قاضیٔ دمشق نے ایاس بن معاویہ کو ڈانٹ کر کہا: کہ تم اس معمر آدمی کے مقابلہ میں کم عمر لڑکے ہو اور اس زور سے کلام کرتے ہو؟ ایاس بن معاویہ نے جواب میں عرض کیا کہ قاضی صاحب! اگرچہ میں چھوٹا ہوں، مگر "حق" مجھ سے، ان سے آپ سے اور سب سے بڑا بنا دیا ہے۔ قاضیٔ دمشق نے پھر ڈانٹ کر کہا: کہ تم چپ ہو جاؤ۔ ایاس بن معاویہ نے کہا کہ حضرتِ والا! اگر چپ ہو جاؤں تو میں اپنے دعویٰ کو کس طرح ثبوت تک پہنچاؤں گا! قاضیٔ دمشق نے غصّہ سے کہا: اچھا تم بولو مگر قسم ہے خدا کی کہ تم اچھی بات نہیں کہو گے۔ اس پر ایاس بن معاویہ نے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْـدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ پڑھا اور کہا کہ قاضی صاحب آپ کی قسم ٹوٹ گئی لیجیے میں جو یہ بات کہا ہوں یہ کلمۂ حق ہے، اس سے اچھی اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔ آپ اپنی قسم کا کفارہ ادا کیجیے۔ قاضیٔ دمشق لاجواب ہو کر خاموش رہ گئے۔

خلیفۂ دمشق کو جب اس واقعہ کی خبر پہنچی تو ایاس بن معاویہ کو دمشق کا قاضی مقرر کر دیا۔ آدمی میں اگر علم و دانائی کا

کمال موجود ہو تو ایک کم عمر آدمی بھی بڑے عہدے پر فائز ہو سکتا ہے۔ اور ترقی جاہ کی بڑی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ ؎

طاقت ہو تو موکی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

ایک مرتبہ ابو القاسم حضرت جُنید بغدادی علیہ الرحمہ نے بھی اپنی کم عمری کے زمانے میں شُکر کی لاجواب تعریف بیان کرتے ہوئے علماء حاضرین سے دادِ تحسین حاصل کی ہے۔

جُنید علیہ الرحمہ اپنے ماموں حضرت سرّی سقطی علیہ الرحمہ کے ساتھ مکۂ معظّمہ گئے اور حج کے مراسم سے فارغ ہونے کے بعد چار سو مسلمان علماء ایک جگہ جمع ہوئے اور ہر ایک نے شُکر کی تعریف پیش کرنی شروع کی۔ اختتام پر حضرت سرّی سقطی علیہ الرحمہ نے کہا: اے جنید تم بھی کچھ کہو۔ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ اس کے احکامات کی پابندی کی جاے۔ تمام علماء نے ایک زبان ہو کر کہا۔ کہ اس سے بڑھ کر اور اس سے بہتر کوئی تعریف نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے سمندر کو کوزہ میں سما دیا۔ کہ حق تعالےٰ کی نعمتوں کا شُکر یہی ہے کہ اس کے احکامات کی جائے نہ کہ خلاف ورزی۔

بزرگی کا دارو مدار سن و سال پر نہیں ہے بلکہ علم و عقل کا کمال ہی درحقیقت انسان کی بزرگی کا معیار ہے۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا مشہور مقولہ ہے:

سخاوت بہ دل است نہ بہ مال و بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال۔

حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفۂ دمشق نے کہا کہ علم سیکھو کیوں کہ کوئی شخص ماں کے پیٹ سے علم لے کر نہیں آتا۔ اور علم والا اور جاہل دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

کم سنی میں علمی کمالات تب ہی پیدا ہو سکتے ہیں جب کہ اپنی عقلِ سلیم کو حرکت میں لاتے ہوئے حصولِ علم میں کوشاں رہیں اور طاقتِ گویائی میں کمال پیدا کرنے کی سعیٔ بلیغ کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ کی نعمتوں کا شُکر تب ہی باقاعدہ ادا ہو سکتا ہے۔ ؎

علم ہی جب نہیں تم میں تو عمل کیا ہوگا
جس خیاباں میں شجر نہیں پھل کیا ہوگا

وما علینا الا البلاغ

دار العلوم لطیفیہ ویلور کے مایۂ ناز

استاذ حضرت مولانا سید حمید اشرف کچھوچھوی علیہ الرحمۃ

ادارہ

مولانا سید حمید اشرف کچھوچھہ شریف میں پیدا ہوے۔ غالباً ۱۹۳۰ء کے آس پاس تاریخ پیدائش ہوگی۔ والد کا نام سید حبیب اشرف ہے۔ سید حبیب اشرف تقویٰ اور کردار کی بلندی میں کچھوچھہ شریف میں ممتاز ترین تھے۔ تحصیل علم و عبادت اور ریاضت سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ انھوں نے اپنے سبھی بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔

سید حمید اشرف نے ابتدائی تعلیم مقامی مکتب میں پائی۔ پھر کچھوچھہ شریف میں مدرسہ جامعہ اشرفیہ میں درس نظامی کی تحصیل میں لگ گئے۔ شرح جامی تک پڑھا تھا کہ یہاں سے چھوڑ کر مدرسہ اشرفیہ مبارک پور چلے گئے۔ وہاں دوبارہ شرح جامی پڑھی۔ پھر وہاں سے بھی نکل کر جونپور آے۔ یہاں کا قدیم شہرت یافتہ مدرسہ حنیفیہ اب بھی اپنی دیرینہ روایات پر چل رہا تھا اور یہاں کے مشہور عالم دین مولانا عبد القیوم محمد قائم فرنگی محلی تنہا استاد تھے۔ یہ مدرسہ نواب جونپور کی سرپرستی میں آگیا تھا اور وہی اس کے کفیل تھے۔ مولانا حمید اشرف نے یہاں مشکوٰۃ شریف ختم کی۔ مولانا عبد القیوم محمد قائم کی بینائی بہت کم زور ہوگئی تھی اور عزیز اور ہونہار شاگرد مولانا حمید اشرف کو پڑھانے کے لیے مطالعہ کرنا اور تیاری کرنا ضروری تھا۔ بینائی کی کم زوری کے سبب استاد نے شاگرد سے کہا کہ تمہاری استعداد کسی منتہی طالب علم سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ اس لیے اب تمہاری دستار بندی کر دی جاے اور سند فضیلت دے دی جاے۔ لیکن مولانا سید حمید اشرف کو یہ منظور نہ ہوا۔ مولانا نظام الدین الٰہ آبادی کی شہرت سن کر چند ماہ اُن کے آگے بھی زانوے تلمذ تہ کیا۔ لیکن چند ماہ بعد وہاں سے بھی واپس آگئے۔ انھوں نے مولانا ابراہیم اور مولانا اعزاز علی کی شہرت سن رکھی تھی۔ یہ دونوں استاد دیوبند میں تھے۔ ان کی شہرت سن کر مولانا سید حمید اشرف دیوبند گئے اور آخر کار وہاں سے سند فراغت حاصل کی۔

سند فراغت حاصل کرنے کے بعد کئی جگہ درس دیا۔ ناگپور، بہرائچ، گونڈہ وغیرہ آخر میں ویلور پہنچ گئے۔ اور دار العلوم لطیفیہ، مکان حضرت قطب ویلور میں منصب درس و تدریس پر فائز ہوگئے۔ یہ بیسویں صدی عیسوی کا وسطی دور تھا اور اس وقت دار العلوم لطیفیہ کی زمام نظامت حضرت مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ بی۔ اے۔ کے ہاتھوں میں تھی۔ جن کی سرپرستی میں شمال و جنوب کے لائق و فائق علماء و فضلاء درس دے رہے تھے۔ جن میں مولانا مولوی عبد الواحد جونپوری اور حضرت مولانا مولوی محمد طیب الدین اشرفی مونگیری، حضرت مولانا مولوی ابو المعالی علوی ملیباری نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا سید حمید اشرف کو درسِ نظامیہ کی کتب متداولہ میں مہارتِ تامّہ حاصل تھی اور آپ حدیث، فقہ اور عربی و فارسی ادب کا درس دیا کرتے تھے۔ آپ کو فنِ تصوف سے ذاتی شغف اور خاندانی وابستگی تھی۔ جس کے باعث نصوص الحکم، تحفۂ مرسلہ اور حضرت قطبؒ ویلور کی عرفانی تصانیف کی تدریس و تعلیم بھی آپ کے ذمہ تھی۔ اس طرح آپ نے تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ تزکیہ اور تطہیر کا کام بھی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

مولانا حمید اشرف ایک بہترین مصنف اور مترجم بھی تھے۔ آپ نے بزرگانِ مکان کی فارسی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ جن میں "انشائے عقائد ذوقی" بھی ہے۔ آپ کی نوکِ قلم سے بے شمار علمی و فقہی اور تحقیقی مضامین نکلے اور "اللطیف" کی زینت بنے۔ اگر ان کی تدوین کی جائے تو مولانا کی ایک بہترین تصنیف قرار پائیں گے۔

مولانا جب تک دار العلوم لطیفیہ میں مدرس رہے۔ اس وقت تک "اللطیف" کی ادارت آپ کے تحویل رہی اور آپ نے ادارت کے فرائض کو بڑی خوبی و عمدگی اور پورے خلوص کے ساتھ انجام دیا۔ اور اسی کے ساتھ آپ نے طلباء اندر تحریری ذوق اور ان کے اندر انشاء پردازی کی قابلیت پیدا فرمائی۔ اور افراد سازی کا عظیم الشان کام انجام دیا۔ جس کا فیضان ہے کہ آپ دار العلوم لطیفیہ سے علاحدہ ہونے کے بعد بھی یہاں کی دُنیائے تصنیف بارونق اور آباد ہے۔

آپ کے فیض یافتگان اور خوشہ چینوں میں مولانا مولوی ابو المکارم سید مصطفیٰ احسین بخاری لطیفی اور مولانا مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی لطیفی ایم۔ اے، کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جن کے ذریعہ دار العلوم لطیفیہ میں علمی و ادبی اور تحریری و تصنیفی عمل جاری رہ سکا۔

مولانا کو افتاء میں بھی بصیرت حاصل تھی۔ دار العلوم کی جانب سے صادر ہونے والے تمام فتاویٰ آپ کی نظر سے گزرتے تھے اور اصلاح و ترمیم فرماتے اور تصدیق و تصویب فرماتے تھے۔ چناں چہ فتاویٰ کے دفتروں میں آج بھی آپ کی دستخط موجود ہیں۔

مولانا ایک خلیق اور باکردار شخصیت کے مالک تھے۔ تمام اساتذہ کرام کے ساتھ آپ کے تعلقات خوش گوار تھے۔ طلباء کے ساتھ بڑی شفقت اور محبت کا برتاؤ تھا۔ انتظامیہ بھی آپ کی صلاحیتوں اور آپ کے کردار کی بلندیوں سے بہت متاثر اور بڑا قدردان تھا۔

مدرسی کے زمانہ ہی میں انھوں نے انگریزی زبان بھی سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ درس نظامیہ کے علاوہ انھوں نے الہ آباد سے درسِ عالیہ کی بھی سندیں حاصل کیں۔ جو یہاں یو پی گورنمنٹ اور بعض یونیورسٹیوں سے بھی تسلیم شدہ ہیں۔ اس بنیاد پر انھوں نے ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ اور بی، اے، کے انگریزی امتحانات پاس کئے۔ ان امتحانات میں انگریزی کا انگریزی کا Advanced Course ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو انگریزی میں اچھی استعداد حاصل کرنی پڑی۔ پھر علی گڈھ یونیورسٹی سے عربی میں ایم، اے، اور ایم، فل، کیا۔

مولانا نے لوگوں کے اصرار پر تھوڑے دنوں یعنی چند ماہ پیری مریدی بھی کی۔ ہمارے گھر میں پیری مریدی تو تھی لیکن اسے کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا گیا۔ جگہ جگہ تقریر کرنے کے لیے جلسوں کے انعقاد کا بھی کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ گھر کی حیثیت خانقاہ کی تھی اور خانقاہی زندگی تھی۔ چناں چہ اسی گھر میں امیرِ ملّت مولانا سید امیر اشرف کی تربیت ہوئی۔ جو آگے چل کر بالکل تارک الدنیا ہو گیے۔ زبان میں وہ اثر تھا کہ جو منہ سے نکل جائے وہ پتھر کی لکیر تھا۔ مولانا حمید اشرف نے چند ماہ پیری مریدی کا تجربہ کیا۔ مریدوں سے جو کچھ حاصل ہوا وہ وہیں غریبوں میں تقسیم کر دیا اور خود خالی ہاتھ گھر واپس آگئے۔ پھر اُسے مطلق چھوڑ دیا۔

انگریزی اور عربی زبانوں میں جو انھیں استعداد حاصل تھی وہ علماء میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کی اس استعداد کو دیکھ کر کسی نے انھیں سعودی عرب میں جگہ دلادی۔ جہاں انھیں عربی سے انگریزی میں ترجمہ کا کام مل گیا۔ چند سال وہاں رہے۔ وہاں کی آمدنی سے انھوں نے اپنی غریب بہنوں کی مدد کی۔ اس کے بعد واپس آگئے۔

بمبئی کے پاس ایک جگہ مُمبرا ہے۔ وہاں کسی مدرسہ میں عارضی طور پر درسِ حدیث کے لیے انھیں بلایا گیا۔ بڑے اصرار کے بعد انھوں نے قبول کر لیا۔ جلسۂ دستار بندی کے وقت انھیں طلباء سے خطاب کرنے کو کہا گیا۔ تقریر وخطابت سے اُن کو دلچسپی نہ تھی۔ سینہ بھی کمزور تھا۔ بڑے اصرار پر آمادہ ہوئے۔ اور کہا جب مجھے عربی کے طلباء کو خطاب کرنا ہے تو عربی زبان ہی میں خطاب کرنا چاہیے۔ پھر ایک گھنٹہ عربی زبان میں تقریر کی۔ بعد میں اردو میں بھی خلاصہ پیش کر دیا۔ وہاں کسی مولوی کو عربی زبان میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں نے پہلی بار دیکھا۔ چوں کہ وہ ایم، اے، اور ایم، فل، بھی تھے، اس لیے مہاراشٹر کالج بمبئی کے لوگوں نے اپنے کالج میں عربی پڑھانے کے لیے مقرر کرنا چاہا۔ لیکن کالجوں میں عربی تعلیم مدارس کی طرح نہیں ہوتی۔ کالجوں میں چند کتابیں کے چند انتخابات ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ کالج والوں نے کہا کہ آپ کو گورنمنٹ سے منظور شدہ تنخواہ ملے گی، جو کسی مدرسہ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب میری زندگی کا مقصد روپیہ کمانا نہیں ہے بلکہ حدیث کی خدمت کرنا ہے اور وہ آپ کے کالج میں رہ کر نہیں ہو سکتی۔

مُمبرا کے مدرسہ کے بعض طلباء کا بیان ہے کہ مولانا سید حمید اشرف جب بخاری شریف کا درس دیتے تھے تو طلباء سے کہتے تھے کہ وہ جتنے صفحات چاہیں پڑھیں دوسرے یہ کہ ہر حدیث کی لغات، سلسلۂ روایت، راوی کا ثقہ یا غیر ثقہ ہونا، نحوی و صرفی مسائل اور اس سے متعلق تمام مسائل پر فی البدیہہ بحث کرتے تھے۔ حدیث پر ایسا ملکہ اس زمانہ میں دیکھا نہیں گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ درسِ نظامی کے ہر مضمون پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ سننے والا یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ مضمون میں اختصاص رکھتے ہیں۔ فلسفہ ومنطق، صرف ونحو، علم حدیث، عربی ادب غرض کہ متداول علوم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جس میں وہ کامل دستگاہ نہ رکھتے ہوں۔

مولانا کے مزاج میں حد سے زیادہ کسرِ نفسی اور درویشی تھی۔ انھیں اپنے وفورِ علم کا احساس تھا۔ علم کا احساس آدمی میں بڑائی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ نفس کی اس علّت کو توڑنے کے لیے کچھ دنوں چھوٹے بچوں کو پڑھانے کی نوکری کی۔

ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر الف با وغیرہ پڑھاتے تھے ۔ لوگ دیکھ کر ہنستے اور مذاق اڑاتے تھے۔ ظاہر ہے زمانہ کا مزاج ایسا ہی ہوتا ہے ۔

خاندانی وجاہت کا لباس کبھی نہیں پہنا ۔ اکثر کرتے کا بٹن کھلا ہی رہتا ۔ گھر میں دوسروں کے کھانے کا اہتمام کرتے اپنے لیے چنے کی روٹی اور چٹنی پسند کرتے ۔ سارا رمضان شریف میں بھی اکثر یہی کھاتے تھے ۔

مولانا سے میں نے بھی چند کتابیں پڑھیں ۔ اُن کے ساتھ رہنے کا اتنا موقعہ نہ ملا کہ میں اُن سے پوری تعلیم حاصل کر سکتا ۔ علم الصیغہ اور ایک کتاب فقہ میں پڑھی ۔ میں نے درسِ نظامی میں پڑھانے کے طریقہ پر بعض اعتراضات کیے بحثیں بھی کیں ۔ آخر میں انھوں نے یہ جواب دیا کہ اگر اس طرح نہ پڑھائیں تو ہمیں ناقابل سمجھا جائے ۔ درسِ نظامیہ میں تدریس کا یہی اسلوب ہے ۔ میں نے کہا کہ اس طرح وقت بہت ضائع ہوتا ہے ۔ زمانہ اتنی ترقی کر گیا کہ کم وقت میں آدمی زیادہ حاصل کر سکتا ہے ۔

گھر سے ایک روز صبح کو فیض آباد یا لکھنؤ کے لیے نکلے ۔ بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ انھیں جانے سے منع کیا ۔ ایک صاحب نے کہا : چچا! آپ کے جانے سے یہ درخت اُداس نظر آرہے ہیں ۔ لیکن مشیّتِ ایزدی کو جو منظور ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے ۔ غالباً واپسی میں جیپ بے راہ ہو گئی اور کسی درخت سے ٹکرا گئی ۔ یہ حادثہ جان لیوا ثابت ہوا ۔ شرعی اعتبار سے یہ موت شہادت کا درجہ رکھتی ہے ۔ ••

آیندہ صفحات میں

قدوۃ السالکین حضرت مولانا غلام محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری ذوقی علیہ الرحمہ

کی تصنیف "انشاءِ عقائدِ ذوقی" (فارسی)

کا اردو ترجمہ

حضرت مولانا سید حمید اشرف کچھوچھوی ، سابق استاذ

نے پیش کیا ہے ۔!

○ انشائے عقائدِ ذوقی

چھبیسواں ۲۶ مکتوب

ان آیات کے ذکر میں جو صحابہ رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی شان میں نازل ہوئیں

مشفق ومکرم فاضل صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ!

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ جو آیات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں نازل ہوئیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے بعض تحریر کی جاتی ہیں۔ پہلی آیت کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ہے۔

- پہلی آیت: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں صحابہ کی فضیلت وبرتری کو بقیہ تمام اُمتوں پر ثابت کیا ہے۔
- دوسری آیت: وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے خبر دیا کہ اس نے صحابہ کو عادل اور بہتر بنایا ہے تاکہ وہ بقیہ اُمتوں پر گواہ رہیں۔
- تیسری آیت: یوم لا یخزی اللہ النبی والذین معہ نورھم یسعی بین ایدیھم وبایمانھم۔ اللہ نے صحابہ کو قیامت کی رسوائی اور ذلت سے مامون ومحفوظ کر دیا ہے اور قیامت کی رسوائی سے وہی لوگ مامون ہو سکتے ہیں، جن کا انتقال ایسی حالت میں ہوتا ہو کہ اللہ اور اس کا رسول ان سے راضی ہوں۔ پس ان کا قیامت کی رسوائی سے مامون رہنا دلیلِ صریح ہے کہ اُن وفات کمال ایمان پر ہوی۔
- چوتھی آیت: لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایونک تحت الشجرہ: اس آیت میں حق تعالےٰ نے صحابۂ کرام سے اپنی رضامندی وخوشنودی کی تصریح کی ہے۔ صحابہ کی تعداد کل چودہ سو ۱۴۰۰ تھی اور جس سے اللہ تعالےٰ راضی ہو اس کی موت کفر پر ممکن نہیں ہے۔
- پانچویں آیت: والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین ابتعوھم باحسان و رضوا عنہ۔
- چھٹویں آیت: یاایھا النبی حبک اللہ ومن ابتعلک من المؤمنین۔
- ساتویں آیت: للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً مین اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ھم الصادقون۔
- آٹھویں آیت: محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً

سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانہ

- نویں آیت: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناہ
اسی طرح صحابہ کی فضیلت میں اور بھی بہت آیات ہیں۔ پس صحابہ کی شان میں طعن و تشنیع کرنے والا آیات قرآنی کی تکذیب کرنے والا ہے۔ اور آیاتِ قرآنی کی تکذیب کرنے والا کافر ہے۔ غرض روافض کے لیے کسی طرح بھی ضلالت و غوایت کے پھندے سے رہائی متصور نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ ان گمراہوں کے شر و فتنہ سے ہمیں محفوظ رکھے اور ہمیں اپنے فضل و کرم، لطف و احسان سے سیدھے راستہ پہ قائم رکھے۔ آمین۔

ستائیسواں ۲۷ مکتوب

ان احادیث کے بیان میں جو صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فضائل میں وارد ہوئیں اور صحابۂ کرام سے عناد و عداوت رکھنے والوں کی مذمت میں ہیں

مشفق و مخلص محمد ابوبکر سلمہٗ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ جو احادیث صحابہ کرام کے فضائل میں وارد ہوئیں وہ تعداد و شمار سے باہر ہیں۔ ان میں بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محاملی، طبرانی سے حاکم عویم ابن ساعدہ رضی اللہ عنہٗ سے راوی:

- حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حق سبحانہٗ تعالیٰ نے تمام لوگوں میں مجھ کو منتخب کیا اور میرے لیے صحابہ کو منتخب کیا۔ ان صحابہ میں سے میرے لیے معاون مددگار اور رشتہ دار بنایا۔ پس جس نے اُن کو گالی دیا اس پہ اللہ کی، تمام فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ اس سے نہ فرض قبول کرے گا اور نہ نفل۔

- خطیب حضرت انس رضی اللہ عنہٗ سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حق تعالےٰ نے مجھ کو منتخب کیا اور میرے لیے اصحاب کو منتخب کیا۔ ان صحابہ میں سے میرے لیے رشتہ دار و مددگار بنایا۔ پس جو شخص میرا لحاظ رکھے گا صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ اس کا لحاظ رکھے گا۔ اور جو شخص مجھ کو ایذا دے گا صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ اس کو ایذا دے گا۔

- حضرت جابر، حسن ابن علی اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخر زمانہ میں ایک قوم ہوگی جس کا نام رافضہ ہوگا۔ وہ اسلام کو ترک کردیں گے۔ ان کو قتل کردو کیوں کہ وہ مشرک ہیں۔

- دارقطنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریب ہے کہ میرے بعد ایک قوم پیدا ہوگی، جس کا لقب رافضہ ہوگا۔ اے علی جب تم انھیں پاؤ تو قتل کردو کیوں کہ وہ مشرک ہیں۔ حضرت علی نے کہا: یا رسول اللہ ان کی علامت کیا ہے؟ فرمایا: تمہاری نسبت ایسی چیزوں کی طرف کریں گے جو تم میں نہیں ہے۔ اور وہ اسلاف یعنی شیخین پر طعن کریں گے۔

- طبرانی: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص میرے صحابہ کو سبّ و شتم کرے گا، اس پر خدا، تمام فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔
- طبرانی: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص انبیاء علیہم السلام کو بُرا کہے گا وہ قتل کیا جائے گا اور جو شخص میرے صحابہ کو بُرا کہے گا کوڑا مارا جائے گا۔
- ویلمی: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حق سبحانہ تعالےٰ اُمّت میں سے کسی کے ساتھ بہتری کا ارادہ کرتا ہے تو میرے اصحاب کی محبت اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔
- ترمذی: حضرت عبداللہ ابن نوفل رضی اللہ عنہ سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ سے ڈرتے رہو۔ میرے اصحاب سے میرے بعد ہدفِ ملامت مت بناؤ، جو شخص اُن کو دوست رکھے گا وہ میری وجہ سے اُن کو دوست رکھے گا اور جو شخص اُن کو دشمن رکھے گا، وہ مجھ سے عداوت کی وجہ سے اُن سے دشمنی رکھے گا۔ جو اُن کو ایذا دے گا تو اس نے مجھ کو ایذا دیا اور جس نے مجھ کو ایذا دیا اس نے درحقیقت خدا کو ایذا دیا۔ اور جس نے خدا کو ایذا دیا، قریب ہے کہ وہ اس کو پکڑ لے۔
- خطیب حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی: نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو بُرا کہتے ہیں تو تم کہو خدا کی لعنت ہو تمہارے شر پر۔
- بخاری، مسلم، ابوداؤد و ترمذی: حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب کو بُرا مت کہو۔ خدا کی قسم کہ جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے اگر تم سے کوئی اُحد کے پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ اُن کے ایک مُد[1] بلکہ نصف مُد کے برابر بھی نہیں ہوگا۔
- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری خاطر میرے اصحاب سے درگزر کرو، خدا کی قسم اگر تم اُحد کے پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو پھر بھی اُن کے درجۂ اعمال تک نہ پہونچ سکو گے۔
- طبرانی: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو میرے اصحاب کو بُرا کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر لعنت بھیجتا ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم کے حق میں اس قدر احادیث وارد ہیں جو تحریر سے زائد ہیں۔
بڑی کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

والسلام.

---

[1] ایک پیمانہ ہے اہلِ عراق کے نزدیک، دو رطل کا ہوتا ہے۔

اٹھائیسواں ۲۸ مکتوب

روافض کے اہل بدعت ہونے کے ثبوت اور اُن کی مذمّت میں۔

محبّ صادق عبدالقادر چیدہ سلمہ اللہ

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ روافض کی دو قسمیں ہیں۔ کافر اور فاسق اور ہر صورت میں ان کے بدعتی ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

- خطیب بغدادی نے اپنی جامع میں روایت کیا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت فتنے یا بدعتیں ظاہر ہوں اور میرے صحابہ کو بُرا بھلا کہا جائے پس چاہیے کہ عالم اپنے علم کو ظاہر کرے۔ جو عالم ایسا نہ کرے گا' اُس پر اللہ تعالےٰ تمام فرشتوں اور انسانوں کی لعنت ہے اور اللہ تعالےٰ اس کا فرض اور نفل کچھ بھی قبول نہ کرے گا۔
- حاکم: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم سے راوی: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اہلِ بدعت میں سے جب بھی کوئی رونما ہوا اللہ تعالےٰ نے اسی وقت اپنے منتخب بندہ کی زبان سے حجت نازل فرمائی۔
- ابو نعیم راوی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہلِ بدعت تمام مخلوق میں سب سے بدتر ہیں۔ خلق اور خلیقہ ہم معنی ہیں۔ ایک قول کے مطابق خلق سے مراد چوپایے اور بہائم ہیں اور خلیقہ سے مراد انسان ہیں۔
- ابو حاتم خزاعی راوی ہیں: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہلِ بدعت دوزخی ہیں۔
- روایت ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنّت کے مطابق تھوڑا عمل' بدعت کے کثیر عمل سے بہتر ہے۔
- طبرانی راوی ہیں: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے بدعتی تعظیم کی تو گویا اس نے اسلام کے ڈھا دینے میں اسکی مدد کی۔
- خطیب دیلمی راوی ہیں: حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت کوئی بدعتی مرتا ہے تو اسلام میں کوئی نئی فتح کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔

اہلِ بدعت کے حق میں حدیثیں بہت زیادہ ہیں مختصر یہ کہ اہلِ بدعت کی صحبت سے کوئی فائدہ نہیں ہے ان سے بالکلیہ پرہیز کرنا چاہیے۔

شعر

اگر تمہاری رفیق اژدھا ہو تو یہ کسی گمراہ و جاہل کی مصاحبت سے بہتر ہے۔

والسلام

انتیسواں ۲۹ مکتوب

اُن فضائل کے بیان میں جو شیخین اور دیگر صحابہ کی شان میں وارد ہوئے ہیں۔

محبِّ صادق علی دلخان سلمہٗ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ دار قطنی نے سالم ابن ابی حفصہ سے روایت کی ہے: وہ اہلِ تشیع سے ہے لیکن معتبر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے ابو جعفر محمد ابن علی اور جعفر ابنِ محمد سے شیخین کے متعلق دریافت کیا، تو انھوں نے کہا کہ اے سالم ان کو دوست رکھو اور اُن کے دشمن سے بیزار رہو۔ کیوں کہ وہ دونوں حضرات ہدایت کے پیشوا اور امام تھے۔

- دار قطنی نے اسی شخصِ مذکور سے روایت کیا ہے: اس نے کہا کہ میں ابی جعفر کے پاس آیا۔ راوی کہتا ہے کہ میرا خیال ہے کہ انھوں نے مجھے سنانے کے لیے کہا: اے خداوندا! میں ابوبکر و عمر کو دوست رکھتا ہوں۔ اے خداوندا! اگر میرے دل میں اس کے علاوہ کچھ اور ہو تو قیامت میں مجھے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب نہ ہو۔
- اسی سالم ابن ابی حفصہ سے روایت۔ کہ جعفر ابن محمد نے اس سے کہا: آیا کوئی شخص اپنے دادا کو بُرا بھلا کہتا ہے ابوبکر میرے دادا ہیں۔ مجھے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اگر میں ان کو دوست نہ رکھوں اور ان کے دشمن سے بیزاری نہ کروں۔
- روایت ہے کہ بعض لوگوں نے جعفر ابنِ محمد سے کہا۔ کہ فلاں شخص کا خیال ہے کہ آپ ابوبکر اور عمر سے بیزار ہیں۔ حضرت جعفر ابن محمد نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص سے بیزار ہو۔ مجھ کو تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے حضرت ابوبکر کی قرابت سے فائدہ پہونچائے گا۔ حضرت ابوبکر سے دوستی و محبت کا یہ حال ہے کہ جب میں بیمار پڑا تو میں نے اپنے ماموں عبدالرحمٰن ابن قاسم کو (جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ کے پرپوتے ہیں) انھیں کو اپنے معاملات میں وصیت کیا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین
- دار قطنی و حافظ عمر ابنِ شیبہ راوی ہیں کہ علامہ کثیر نے حضرت ابو جعفر ابن محمد ابن علی سے کہا کہ مجھے بتایئے کہ کیا ابوبکر، عمر اور عثمان نے آپ کے خاندان والوں پر کچھ ظلم کیا۔ انھوں نے کہا: قسم ہے اللہ رب العزّت کی جس نے اپنے بندہ پر قرآن نازل کیا، انھوں نے ہمارے حق میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ظلم نہیں کیا۔ علامہ کثیر نے پوچھا: تو میں ان حضرات کو دوست رکھوں۔ فرمایا: ہاں! اے کثیر انھیں دنیا و آخرت میں دوست رکھو اور اپنی گردن پہ ہاتھ مار کر کہا: اگر اس بارے میں تمہیں کوئی ضرر پہونچے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مغیرہ ابن سعید اور بیان سے بیزار ہوں انھوں نے ہم اہلِ بیت پر جھوٹا الزام رکھا۔
- ابو جعفر باقر رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے: آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا اہلِ بیت میں کوئی ایسا تھا، جو ابوبکر و عمر کو بُرا کہتا رہا ہو؟ آپ نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ بلکہ سب اُن کو دوست رکھتے تھے اور اُن کے لیے مغفرت اور نزولِ رحمت کی دعا کرتے تھے۔

• مروی ہے کہ امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ کے والد علی ابنِ حسین رضی اللہ عنہم نے ایک ایسی جماعت سے جو ابو بکر، عمر اور عثمان کے بارے میں جرح وقدح کر رہی تھی۔ اس جماعت سے حضرت علی ابن حسین رضی اللہ عنہم نے فرمایا کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ کیا تم مہاجرین اولین ہو جن کے متعلق آیت مذکورہ الذین اُخرجوا من دیارھم واموالھم الی آخرہ نازل ہوی ہے۔ اس جماعت نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہیں حضرات انصار ہو؟ جنھوں نے مہاجرین کو اپنے وطن میں ٹھکانا دیا جن کے بارے میں آیتِ مذکورہ یحبون من ھاجر الیھم (الی آخرہ) نازل ہوی۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: ان دونوں گروہوں میں سے تم کسی گروہ میں نہیں ہو اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اُن لوگوں میں سے بھی نہیں ہو، جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے یہ آیت: والذین جاؤامن بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا: (الی آخرہ) نازل فرمایا: لہٰذا ان پاک حضرات کی شان میں بدگوئی کرنا خود اپنے کو دروغ گو ثابت کرنا ہے۔

• حسن ابنِ محمد حنیفہ سے مروی ہے: انھوں نے کہا: اے اہلِ کوفہ اللہ سے ڈرو اور ابو بکر و عمر کو ایسی باتیں مت کہو جو اُن کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہٗ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار تھے اور آیتِ کریمہ ثانی اثنین اذھما فی الغار انھیں کے بارے میں نازل ہوی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے دین کو معزز وسربلند فرمایا۔

• جندب اسدی سے مروی ہے کہ محمد ابنِ عبداللہ ابنِ حسن کے پاس اہلِ کوفہ وجزیرہ کی ایک جماعت آئی۔ اس نے آپ سے ابو بکر و عمر کے حال کے متعلق دریافت کیا۔ جندب اسدی کہتے ہیں کہ آپ میری طرف متوجّہ ہوے اور کہا کہ اپنے اہلِ وطن کو دیکھو مجھ سے ابو بکر اور عمر کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ وہ لوگ میرے نزدیک علی رضی اللہ عنہٗ سے افضل و برتر ہیں۔

• عبداللہ ابن الحسن رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے: انھوں نے کہا خدا کی قسم اللہ عزوجل اس بندہ کی دعا قبول نہ کریگا جو ابو بکر اور عمر سے بے زار ہو، وہ لوگ میرے دل پر پیش کئے جاتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اللہ رب العزّت کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں۔ اللہ عزوجل کے حضور اس دعا سے تقرب حاصل کرتا ہوں۔

• فضیل ابنِ مرزوق سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عمر ابنِ علی ابن حسن ابن علی رضی اللہ عنہم سے کہا کیا آپ کے خاندان میں کوئی ایسا امام ہے۔ جس کی اطاعت فرض ہو۔ لوگ اس کے اس حق کو پہچانیں اور جو اُن اس حق کو نہ پہچانے۔ پس وہ جاہلیت کی موت مرا۔ انھوں نے جواب دیا ایسی بات نہیں ہے۔ جو شخص ایسا کہے وہ جھوٹا ہے۔

• عبدالجبار ہمدانی سے مروی ہے امام جعفر صادق علیہ السلام ایک جماعت کے پاس آے۔ وہ جماعت مدینہ سے کوچ کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ آپ نے اُن سے فرمایا: تم انشاء اللہ مصر کے صلح اور نیک لوگوں کے پاس پہونچو گے۔ اس وقت ان کو میرا یہ پیغام پہنچاؤ۔ کہ جو شخص یہ گمان کرے کہ میں ایسا امام ہوں جس کی اطاعت فرض ہے، تو میں اس سے بے زار ہوں۔ اور جو شخص یہ گمان کرے کہ میں ابو بکر اور عمر سے بے زار ہوں تو یقیناً وہ مجھ سے بے زار ہے۔

• عبدالجبار ہمدانی سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق سے حضرتِ شیخین کے متعلق دریافت کیا گیا۔ آپ نے

فرمایا جو شخص ان کا تذکرہ خیر کے علاوہ کسی چیز سے کرے تو میں اس سے بے زار ہوں ۔اس وقت آپ سے کہا گیا: شاید آپ ایسا لوگوں کے خوف سے کہہ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر ایسا ہو تو میں مشرکین میں شمار کیا جاؤں اور مجھ کو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب نہ ہو۔

- امام جعفرِ صادق سے مروی ہے آپ نے فرمایا: جو شخص حضرت ابوبکر اور عمر کی فضیلت کا اعتراف نہ کرے۔ وہ سنّتِ رسولؐ سے غافل ہے۔
- حضرت امام جعفر صادق اپنے والد سے راوی ہیں: انھوں نے کہا کہ لوگوں نے حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب سے کہا کہ ہم آپ کو خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں (اے اللہ تو ہماری اصلاح و درستگی فرما، جس طرح تو نے خلفائے راشدین کی اصلاح و درستگی فرمائی) تو وہ کون حضرات ہیں؟ یہ سن کر آپ کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور فرمایا کہ وہ میرے دوست ابوبکر و عمر ہیں، جو امام ہدیٰ اور شیخ الاسلام ہیں اور قریشی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ سب کے مقتدا ہیں۔ جو اُن کی اقتداء کرتا ہے وہ مامون و محفوظ ہو جاتا ہے اور جو اُن کے اقوال و افعال کی اتباع کرتا ہے اس کو صراطِ مستقیم کی جانب ہدایت کی جاتی ہے اور جو اُن سے وابستہ رہتا ہے وہ خدا کے گروہ سے ہے۔
- دار قطنی عبداللہ محض سے جو کہ بنی ہاشم کے شیخ اور ان کے سردار تھے۔آپ کے والد کا لقب نفس زکیہ تھا، روایت کرتے ہیں کہ آپ سے مسح خفین کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے سائل سے فرمایا: موزوں پر مسح کرو۔کیوں کہ حضرت عمر نے مسح کیا ہے۔ سائل نے کہا میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ مسح کرتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ بڑا احمق ہے۔میں تمہیں حضرت عمر کا طرزِ عمل بتاتا ہوں اور تم میری رائے کے متعلق سوال کرتے ہو۔ عمر مجھ سے بہتر ہیں بلکہ اگر تمام روئے زمین پر میرے جیسے لوگ ہوں جب بھی عمر سب سے بہتر ہیں۔ پھر آپ سے کہا گیا: آپ کا یہ قول ڈر اور خوف کی وجہ سے ہے؟ آپ نے فرمایا: میں روضۂ انور اور منبرِ مبارک کے درمیان ہوں اور میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہی میرا قول ہے۔ اعلانیہ بھی اور خفیہ بھی۔ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی بات پہ کان نہ دھرو۔
- دار قطنی عبداللہ محض کے فرزند سے راوی ہیں کہ ایک موقع پر آپ سے حضرات شیخین کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ حضرات میرے نزدیک علی سے افضل ہیں۔
- امام باقر سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ اولادِ فاطمہ نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ وہ شیخین کے بارے میں سب سے بہتر قول کہیں۔
- حضرت جعفر صادق اپنے والد محمد باقر سے راوی کہ ایک شخص نے آپ کے والد امام زین العابدین علی ابنِ حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے ابوبکر کے حال سے آگاہ کیجیے۔ آپ نے فرمایا: کیا صدیق کا حال پوچھتے ہو؟ اس شخص نے کہا آپ اُن کو صدیق کہتے ہو؟ آپ نے فرمایا: تجھ کو تیری ماں روئے۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام انصار و مہاجرین

رضوان اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین نے اُن کو صدیق کہا ہے اور جو آپ کو صدیق نہ کہے تو اللہ تعالےٰ اس کے قول کو دُنیا اور آخرت میں درست نہ کرے۔ پس تو یقیناً ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم کو دوست رکھتا ہوں۔

- حافظ عمر ابن شیبہ سے روایت ہے کہ امام زید سے سوال کیا گیا کہ حضرت ابو بکر نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے باغِ فدک زبردستی چھین لیا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہٗ بہت ہی مہربان تھے۔ وہ اس چیز کو ناپسند کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو چھوڑا ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل کریں۔ اس کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس تشریف لے گئیں اور کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے باغ فدک عطا فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے۔ پس حضرت فاطمہ کے حق میں حضرت علی اور حضرت امّ ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے گواہی دی۔ پس حضرت صدیق نے فرمایا کہ کیا ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی سے آپ کا حق ثابت ہو جائے گا۔ حضرت زید کہتے ہیں: اگر میرے پاس یہ مقدمہ آتا تو میں بھی حضرت ابو بکر صدیق کے مطابق فیصلہ کرتا۔ ●●

والسلام

○ دیوان شاہ خاموش

مولانا سید شاہ معین الدین حسینی المعروف شاہ خاموش قدس اللہ سرّہٗ العزیز

جب تک وہ دلربا مرے بر میں آئے گا
صبر و قرارِ دل مرا ہرگز نہ پائے گا

ایسا ہے وہ مقام جو قاصد نہ آ سکے
افسانہ مرا کون اوسے جا سنائے گا

ہر چند سیلِ اشک بہاتی ہیں چشم تر
پر سوزِ ہجر اون سے بجھایا نہ جائے گا

رنج و محن سے عشق کے آزردہ دل نہ ہو
جیسے رولائے گا تجھے ویسا ہنسائے گا

اس وقت ہو نصیب اے خاموش وصلِ یار
پروانہ سا تن اپنا تو جس دم جلائے گا

بیمار مرا دل ہے یہ اچھا نہیں ہوتا
جب تک کہ معالج وہ مسیحا نہیں ہوتا

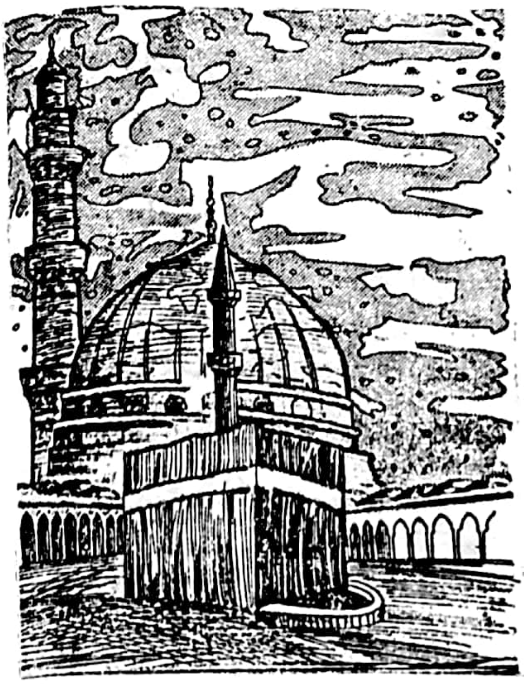
آئینۂ دل مرا مُصفّا نہیں ہوتا
وہ شکل نظر آنے کا نقشہ نہیں ہوتا

اعمال کی شامت سے مرے مجھ پر ستم ہے
جو اُوس کا ستم ہوتا ہے بیجا نہیں ہوتا

بازارِ محبت میں فقط مں نہیں سرگرم
ہے کون جسے عشق کا سودا نہیں ہوتا

خاموش رہو سولی چڑھو بولو انا الحق
منصور سا تم چاہو تو رتبہ نہیں ہوتا

پیش کش: سید محمد گیسو دراز قادری عرف محسن - حیدرآباد۔



معرفت ربّی بفسخ العزائم

ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ عثمان پاشاہ قادری
ناظم دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

مجھے "اللطیف" کے لیے مضمون تیار کرنا تھا۔ لیکن اس مضمون کے لیے کوئی موزون عنوان نہیں مل رہا تھا کہ اس اثناء میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ کہ اُن کا ایک کام ادھورا رہ گیا تھا۔ جسے وہ اور ہم سب مل کر پورا کرنا چاہتے تھے مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا اور اس پر انہوں نے افسوس ظاہر کی تو انھوں نے کہا افسوس کی کیا بات ہے؟ زمانہ میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ کبھی بندوں کے ارادوں کے مطابق کام ہو جاتا ہے اور کبھی ہو نہیں پاتا ہے۔ اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مقولہ پیش فرمایا: عرفت ربی بفسخ العزائم اپنے ارادوں کے ٹوٹنے پر میں نے اپنے رب کو پہچانا کہ ہمارے ارادوں، ہماری خواہشوں کے پیچھے ایک اور ارادہ اور خواہش بھی ہے۔ اس کے بغیر بندوں کی طاقت، ارادے اور خواہشات ہیچ ہوتے ہیں اور اس طرح ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال است کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے کہ ہماری طاقت کے آگے ایک اور طاقت بھی ہے اور ہمارے ارادہ کے آگے دوسرا ارادہ بھی ہے جو سب سے قوی اور طاقتور ہے۔ غرض ان صاحب کی گفتگو نے مجھے اپنے "اللطیف" کے لیے ایک بہترین موضوع فراہم کر دیا۔

رہی یہ بات کہ اللہ کی ذات ہے یا نہیں؟ اس کو ثابت کرنے کے لیے کئی باتیں پیش کی گئی ہیں اور اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اللہ بے شک موجود ہے۔ اور اللہ موجود ہے' اس بات کے ثبوت میں جو جو دلائل پیش کئے گئے ہیں؛ ان میں سے کچھ دلیلیں قارئینِ "اللطیف" کی نگاہوں سے گذارنا ضروری سمجھتا ہوں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں اور اس کی تکمیل کے لیے لاکھ کوشش کرتے ہیں۔ باوجود اس کے وہ کام سر انجام نہیں ہوتا۔ بعد ازاں ہم کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اللہ موجود ہے۔ فلاں کام کرنے کی ہماری مرضی تھی۔ لیکن اس میں شاید اللہ کی مرضی نہیں، اس لیے یہ کام مکمل نہیں ہو رہا ہے۔ اس کو انگریزی میں یوں کہا گیا ہے: مَین پرپوزس گاڈ ڈسپوزس "MAN PROPOSES GOD DISPOSES" سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا یہ قول بالکل صحیح

ہے کہ "عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ الْعَزَائِم" اپنے ارادوں کے ٹوٹنے پر میں نے خدا کو سمجھا۔

یہ حقیقت ہے اور روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ہر کام کے لیے ایک ضرورت اور ہر ضرورت کے لیے ایک موزوں وقت بھی ہوتا ہے۔ پھر اس کے اندر بھی مشیّتِ الٰہی اور قدرتِ خداوندی کارگر ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ کام، وہ ارادہ اور وہ خواہش پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی، چاہے انسان لاکھ کوشش کرلے اور ایڑی چوٹی کا زور لگالے۔ ساری دنیا اور دنیا کی ساری طاقتیں مل جائیں کچھ نہیں ہوتا۔ اسی اسلامی نظریے اور عقیدے کو اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ فیض ترجمان سے سنئے فرماتے ہیں: اَللّٰھُمَّ لَامَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَامُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ۔ (ترجمہ: اے اللہ جسے آپ نوازنا چاہیں دُنیا کی کوئی طاقت اُسے روکنے والی نہیں اور جسے آپ روک دیں دُنیا کی ساری طاقتیں مل کر دینا چاہیں نہیں دے سکتیں۔)

غرض وجودِ باری تعالےٰ کے افہام وتفہیم کے لیے ہمارے بزرگوں نے نقلی دلائل سے زیادہ عقلی دلائل کا سہارا لیا ہے اور اسی کو زیادہ کارگر اور موثر سمجھا ہے۔ کیوں کہ زمانہ آج ہر بات اور ہر چیز کو عقل کے دائرے میں رہ کر سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے نزدیک وہی بات زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے جو عقل کے قریب و نزدیک ہو۔

اور جب یہ بات قرونِ اولیٰ میں چل پڑی تھی تو خود ہی سوچو آج کے اس دور میں اس کا اور زیادہ خیال ولحاظ رکھنا پڑے گا۔ کیوں کہ پہلے کی بہ نسبت آج کے دور میں آزادی، آوارگی اور آزاد خیالی ہزار درجہ بڑھ کر ہے۔

یہ قرونِ اولیٰ کی بات ہے شہر بغداد اپنی پوری تابانی و رعنائی کے ساتھ علم و تہذیب، عمل و تقویٰ، تعلیم و تربیت کی آماجگاہ ہے۔ مدارس و خوانق میں مشہور زمانہ اور گہوارۂ روزگار ہے۔ بڑے بڑے چوٹی کے علماء اور نامور مشائخ کا گڑھ ہے جہاں شہبازِ آسمانی قطبِ ربانی شیخ لاثانی محبوب سبحانی سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز جیسی ذات و شخصیت ہے۔ وہیں مقبولِ بارگاہِ یزدانی، قطبِ سبحانی حضرت سیدنا جنید بغدادی جیسی مُوربین و نکتہ رس ذات و شخصیت بھی ہے۔

چناں چہ آپ کے دور میں ایک دہریہ جو خدا کی ذات اور وجود باری تعالےٰ کا منکر تھا بغداد میں وارد ہوا۔ چوں کہ شہر بغداد اس زمانہ میں سب سے زیادہ علم کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور جہاں بہت سارے علماء اور مشائخ کا وجود منصۂ شہود پر جلوہ افروز تھا۔ اس لیے اس نے اسی شہر کو مرکز بنا کر اپنا اعتراض کر بیٹھا۔ یہ اس وقت کے علماء سے مناظرہ کی دعوت دیتا تھا۔ علماء اس کے معقول سوالات سے گھبراتے اور کتراتے تھے۔ انھیں پوری طرح سے اس دہریہ کو مطمئن کرنا نہ ہوتا تھا نہ ہوا۔ خود علماء بھی پریشان تھے۔ بالآخر سب مل کر حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اول تو حضرت نے انکار کیا کہ میں اس لائن کا آدمی نہیں ہوں۔ مناظرہ بازی یہ آپ جیسے مولویوں کا شیوہ ہے۔ ہم فقیروں کو گوشہ نشینی سے مطلب ہے، مناظرہ بازی سے نہیں۔ مگر علماء نے اصرار کیا کہ حضرت یہ اسلام کی ساکھ ہے، لاج ہے ورنہ بدنامی کا کلنگ ہمارے ماتھے پہ لگے گا۔ بلکہ وہ دہریہ تو اب یہی کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں میں میرے مقابلہ کا کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے۔ حق میرے ساتھ ہے۔ یہ لوگ دیکھنے میں بظاہر بڑے بڑے جبے، عبے پہنے ہوئے ہیں اور اندر سے خالی ہیں، کچھ نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ باتیں کر رہا ہے۔

یہ سُننا تھا حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ کے دل میں جوشِ ایمانی اور غیرتِ اسلامی اُبھری اور فرمایا کہ اچھا چلو ہم اس دہریہ سے مناظرہ کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔ ادھر لوگوں کے دلوں پر خوشیوں اور جذبوں کے آثار نمودار ہونے لگے۔ مقام اور دن خود ہی مقرر فرما دیا کہ جمعہ کے دن رُصافہ کی جامع مسجد میں مناظرہ ہوگا۔

مناظرہ جو دراصل جھگڑے کی دعوت دیتا ہے اور جھگڑا تخریبی ذہنیت کا داعی ہے، تعمیری ذہنیت کا نہیں اور تخریب کاری ہر عامی کا محبوب مشغلہ ہے۔ جہاں جھگڑے کی بات ہوگی وہیں لوگوں کا ازدحام بھی ہوگا۔ کیوں کہ یہ اُن کی ذہنیت کی چیز ہے اور پسندیدہ شغل ہے۔ اور جہاں تعمیری بات ہوگی اچھی اور نیک بات ہوگی وہاں لوگ بہت کم آئیں گے۔ کیوں کہ یہ اُن کے دل و دماغ سے دُور کی بات ہے۔

غرض مناظرہ کی بات اور وہ بھی حضرت جنید بغدادیؒ جیسی ذات و شخصیت کے ساتھ ایک گوشہ نشین خموش اور چُپ سادہ رہنے والی ذات سے مناظرہ کرانا بڑے ہی تعجب اور حیرت کی بات ہوی، اس لیے لوگوں کا اشتیاق اندازہ سے بڑھ گیا، رُصافہ کی جامع مسجد لوگوں کے ہجوم سے کھچا کھچ بھر گئی۔ تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر ٹکٹکی باندھے منتظر ہی تھے کہ اتنے میں عین وقت پر حضرت تشریف فرما ہوگئے۔ آتے ہی دہریہ سے حضرت نے فرمایا: کہ آپ کا کیا اعتراض ہے۔؟

دہریہ: حضرت یہ بتائیے کہ خدا کی ذات بھی کوئی ہے؟

حضرت: ہاں! بے شک خدا تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات موجود ہے۔

دہریہ: اگر موجود ہے تو پھر کہاں ہے؟

حضرت: کیا آپ اس کو دیکھنا چاہتے ہیں؟

دہریہ: جی ہاں! وہی تو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر خدا ہے اور واقعی موجود ہے تو میں اس کو دیکھ لوں اور پھر یہ جھگڑا کاہے کو رہے گا؟ ختم ہو جائے گا۔

اب حضرتؒ نے فرمایا کہ الحمدللہ! جو بات میں سمجھانا چاہتا تھا وہ تو آپ نے ہی کہہ دی۔ اب آگے مجھے کچھ کہنے سُننے کی ضرورت ہی نہیں رہی کہ آپ خود اللہ کے وجود کے قائل ہوگئے ہیں۔

دہریہ: (گھبرا کر) یہ کیسے میں قائل ہوگیا۔ ابھی تو بات چھڑی ہی نہیں، بحث و مناظرہ کی نوبت ہی نہیں آئی کہ اتنے میں آپ فرما رہے ہیں کہ بات ختم ہوگئی، وہ کیسے؟

حضرت: سُنئے پنڈت جی! ہر چیز کا ایک اصول، قانون اور زاویہ ہوتا ہے۔ اور اس کے سمجھنے کے لیے بھی وہی اصول، قانون اور زاویہ اپنانا پڑتا ہے۔ چناں چہ آنکھ کا کام دیکھنا ہے سُننا نہیں ہے اور کان کا کام سُننا ہے دیکھنا نہیں ہے۔ زبان کا کام چکھنا ہے، ذائقہ معلوم کرنا ہے، دیکھنا اور سُننا نہیں ہے۔ جس طرح زبان سے دیکھنے اور سننے کا کام نہیں لیا جاتا

بلکہ چکھنے، ذائقہ معلوم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح آنکھ سے دیکھنے اور کان سے سننے اور سُن کر معلومات حاصل کرنے کا کام ہی لیا جائے گا۔ جس زاویہ سے کسی چیز کی پہچان ممکن الوقوع ہے اسی زاویہ سے اس کو پہچانا جائے گا۔

چناں چہ آواز کو کبھی کسی نے دیکھنے، چکھنے اور سونگھنے کی خواہش نہیں کی۔ خوشبو کو کبھی کسی نے دیکھنے یا سننے کی خواہش نہیں کی، کیوں؟ اس لیے کہ یہ ناممکن الوقوع ہے۔ جس طرح آواز دیکھنے کی چیز نہیں بلکہ سننے کی چیز ہے اور اسی زاویہ سے اس کو سُنا اور پرکھا جائے گا۔ خوش بو سونگھنے کی چیز ہے، دیکھنے یا سننے کی چیز نہیں ہے۔ اس لیے اس کو اسی زاویہ سے سونگھا اور پرکھا جائے گا۔

غرض ان تمثیلات سے آپ کا قلب و دماغ کبھی بھی آواز کو دیکھنے، سونگھنے یا چکھنے کی طرف ہرگز مائل نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ خلافِ عقل و حکمت ہے۔ آپ آواز کو کان سے سننے کی کوشش کریں گے، آنکھ سے دیکھنے، ناک سے سونگھنے یا زبان سے چکھنے کی خواہش نہیں کریں گے اور ایسا ناممکن ہے۔ اسی طرح خوشبو کو سونگھنے کی بجائے آپ اسے آنکھ سے دیکھنے یا کان سے سننے کی کبھی کوشش نہیں کریں گے، کیوں کہ یہ خلافِ واقعہ اور ناممکن الوقوع ہے۔

جب آپ ان تمثیلات کو اچھی طرح سمجھ چکے تو اب آپ خود ہی بتاؤ کہ آپ کا دل خدا کو دیکھنے کا خواہش مند ہے یا نہیں؟

دہریہ: بے شک خواہش مند ہے۔

حضرت: آپ کی یہ خواہش اور ارادہ کہ خدا کو دیکھا جائے، یہ خود باور کرا رہا ہے کہ خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ممکن الوقوع ہے۔ آواز کو سننے کی ہی خواہش ہوتی ہے، خوش بو کو سونگھنے کی ہی خواہش ہوتی ہے، اس کے خلاف نہیں ہوتی۔ جو چیز ممکن ہے اسی کا داعیہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ تو آپ نے عقلاً خدا کے موجود ہونے کا اقرار کر لیا ہے۔ اب نقلاً عرض ہے کہ ہمارے آقا سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نیک بندے گو اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں اللہ کی دیدار سے مشرف ہوں گے۔ دنیا میں اس لیے نہیں کہ ہم سفلیات سے تعلق رکھتے ہیں اور سفلیات کا علویات کے ساتھ جوڑ نگیٹیو اور پازیٹیو کے جوڑ سے مترادف ہے اس لیے مشکل ہے۔

غرض مناظرہ ختم ہوا اور دہریہ تائب ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اور پورے شہر بغداد میں دھوم اور ہلچل مچ گئی کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک دہریہ کو رام کر دیا اور اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرا لیا۔

یہ حقیقت ہے کہ بزرگانِ دین اصل ضمیر کو پکڑتے ہیں اور ضمیر سے اپیل کرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت جنید بغدادی نے اپیل کی جب کہ علمائے ظاہر بین صرف الفاظ اور زبان سے اپیل کرتے ہیں۔ اس لیے وہ آگے نہیں بڑھ سکے۔ اور وہ دہریہ کو رام کرنے میں ناکام رہے۔

موقعہ کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا قاری ڈاکٹر حکیم سید افسر باشاہ صاحب مدظلہٗ کی کتاب

"امام المحدثین سیدنا امام اعظم ابوحنیفہؒ" سے ص ۱۰۲ تا ص ۱۰۵ کا مضمون بعینہٖ یہاں آپ کے سامنے رکھ دوں۔

یہ وہ مشہور واقعہ ہے، جسے متعدد حضرات نے اپنی تاریخی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ علامہ کفویؒ علامہ خوارزمیؒ اور علامہ محمد بن یوسف دمشقیؒ نیز سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحبؒ نے بھی اپنے رسالہ میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہیکہ:

روم کے بادشاہ نے ایک پادری کو بہت سا مال واسباب دے کر بغداد بھیجا کہ وہ وہاں پہنچ کر علماء سے مباحثہ کرے۔ وہ پادری بغداد آیا اور اس طرح اعلان کیا کہ:
جو کوئی ہمارے چار سوالوں کا جواب دے گا ہم اس کا دین اختیار کریں گے اور یہ سارا مال بھی اس کے حوالہ کریں گے۔ اور جو اس کا جواب نہ دے وہ ہمارا دین اختیار کرے اور ہمیں خراج ادا کرتا رہے۔ گویا پورے بغداد کے لئے یہ ایک چیلنج تھا۔

غرض وہ سر راہ ایک ممبر زنگار بچھایا اور اس پر بیٹھ گیا، عوام و خواص کا ہجوم ہے، پادری کی دھوم ہے، مسلسل تین دن سے وہ للکارتا ہے لیکن علماء سے کوئی تشفی بخش جواب نہیں مل پاتا ہے۔ اس اجلاس میں ایک سات سالہ طالب علم بھی اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔ یہ تماش بین کی حیثیت سے یہاں آیا تھا، دیکھا کہ کسی سے جواب بن نہیں پڑتا ہے، اپنے ابا جان سے کہا کہ ابا جان مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سوالوں کے جواب دوں۔ والد محترم نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ رہے ہیں۔ تم کیا جواب دو گے؟ خاموش رہ یہ تیرے بس کی بات نہیں، پھر بچے نے اصرار کیا، باپ نے ڈانٹا کہ یہ کیا بکواس کرتا ہے؟ علماء کے سامنے تیری حقیقت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ بالآخر بچے نے دیکھا کہ باپ اجازت نہیں دے رہے ہیں اسلئے کھڑے ہو کر زور سے آواز دی اور پادری سے مخاطب ہوا کہ میں جواب دیتا ہوں۔

اس کم سن بچہ کی آواز نے سارے عالم کو اور خود پادری کو حیران و مبہوت بنا دیا اور کچھ دیر کے لئے سارا مجمع چپ سادھ ہو کر رہ گیا۔

رومی پادری صاحب: برخوردار آپ ہمارے سوالوں کا جواب دیں گے؟

بچہ: بیشک میں جواب دوں گا۔ مگر قاعدہ یہ ہے کہ پوچھنے والے سے بتانے والے کا مرتبہ زیادہ ہوتا ہے اسلئے تم نیچے اتر آو اور کھڑے ہو کر سوال کرو۔ میں اوپر چڑھوں گا، ممبر پر بیٹھ کر جواب دوں گا۔

پادری صاحب: اچھا ہم نیچے اترتے ہیں اور کھڑے ہو کر سوال کرتے ہیں اور تم ممبر پر بیٹھ کر جواب دو۔

بچہ: اوپر چڑھتا ہے اور ممبر پر اطمینان سے بیٹھ کر کہتا ہیکہ کہو تمہارے سوال کیا ہیں؟

پادری صاحب: بتاؤ خدا سے پہلے کیا تھا؟

بچہ: تمہیں گنتی یاد ہے؟ اگر یاد ہے تو گنو تو سہی؟

پادری صاحب: ایک، دو، تین، چار، پانچ...

بچہ: پھر سے گنو۔

پادری صاحب: ایک، دو، تین، چار، پانچ...

بچہ: ایک سے پہلے گنو

پادری صاحب: ایک سے پہلے کچھ نہیں۔ ایک ہی سے گنتی شروع ہوتی ہے۔

بچہ: جب اعداد مجازی میں ایک سے پہلے کچھ نہیں تو خداوند حقیقی سے پہلے کیا ہو سکتا ہے؟

پادری صاحب: (لاجواب ہو کر کہتے ہیں) ٹھیک ہے۔

بچہ: تمہارا دوسرا سوال کیا ہے؟

پادری صاحب: بتاؤ خدا کہاں ہے؟

بچہ: کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ تمہارے جسم میں روح کہاں ہے؟ جبکہ تمہارے اندر خود وہ موجود ہے۔

پادری صاحب: روح کا ایک مقام نہیں وہ جسم میں ہر جگہ موجود ہے۔

بچہ: روح جو خدا کے حکم سے پیدا ہے اور ہر جاندار میں موجود ہے، تم اس کو بتا نہیں

سکتے تو صاحب روح کا خاص مقام و مرتبہ کوئی کیا بتا سکے گا؟ وہ تو ہر جگہ موجود ہے۔
پادری صاحب: (لاجواب ہوکر) ہاں سچ ہے، بیشک تمہارا کہا بجا ہے اور حقیقت ہے۔
بچہ: تمہارا تیسرا سوال کیا ہے؟
پادری صاحب: بتاؤ خدا کا منہ کس طرف کو ہے؟
بچہ: شمع جب روشن ہوتی ہے تو بتاؤ اس کا منہ کس طرف ہوتا ہے؟
پادری صاحب: اس کا منہ سب طرف ہوتا ہے، اسکی کوئی خاص جہت نہیں ہے۔
بچہ: جب ایک فنا ہونے والی شمع کا منہ سب طرف ہے اور وہ ہر طرف اور ہر گوشہ کو اپنے نور سے منور کرتی ہے تو خود ہی سوچو حق تعالی کا منہ جو واجب الوجود ہے اور "اللہ نور السموت والارض" کے بقول زمین و آسمان اس نور سے روشن اور منور ہیں تو اس کا منہ کیوں اور کیسے کسی خاص جانب ہوگا؟
پادری صاحب: یہ جواب سن کر لاجواب ہوگئے اور خاموش اس بچہ کا منہ تکتے رہ گئے۔
بچہ: پادری صاحب! تمہار چوتھا سوال کیا ہے؟
پادری صاحب: بتاؤ خدا اس وقت کیا کرتا ہے؟
بچہ: اس وقت خدا یہ کرتا ہیکہ تم جیسے عمر رسیدہ، توریت و انجیل کے ماہر اور تثلیث کے قائل کو ممبر سے نیچے اتار دیا۔ اور مجھ جیسے کم عمر موحد، ایک خدا کے ماننے والے طالب علم بچے کو ممبر پر بٹھا دیا۔ اور آپ کو ذلت دی اور مجھ کو عزت بخشی۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء. رومی پادری اپنے وعدہ کے مطابق کلمہ پڑھ رہا ہے۔

لا اله الا الله محمد رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم)

اور سارا مجمع اس پر شاہد و گواہ بنتا ہے اور حیرت و استعجاب میں پڑتا ہے کہ اس بچہ کی اتنی کم عمری میں یہ بے پناہ زیرکی و ہوشمندی، چالاکی و عقلمندی اور خداداد صلاحیت و قابلیت پر جہاں بڑے بڑے علماء و دانشمند داد تحسین دیتے ہیں کہ اس بچہ نے پورے شہر بغداد کی لاج رکھ لی، ساکھ رکھ لی اور پادری کے دل و دماغ پر دھاگ بٹھادی۔ وہیں بعض حساد و جہال بھی نکلتے ہیں اور ہر ممکن حربے استعمال کرتے ہیں۔
کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ بچہ کون تھا؟... یہ وہی بچہ ہے جو آگے چل کر سارے

علماء و محدثین کا سرخیل و سرتاج ،ملجا و ماویٰ امام المحدثین سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ تابعی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

برسبیلِ تذکرہ یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا ایک اور واقعہ بھی گوش گذار کرتا ہوں کہ آپ کے دور میں ایک دہریہ منکرِ خدا نکلا اور وہ لوگوں میں غلط تبلیغ کرنے لگا۔ اس کی اس بے ہودہ باتوں اور غلط تاویلوں سے لوگ عموماً اور علمائے زمانہ خصوصاً پریشان تھے۔ بالآخر سب مل کر حضرت امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس دہریہ کے چیلنج کا دندان شکن جواب دینے کے لئے ملتجی ہوئے تو حضرت الامام نے مجبوراً ایک ترکیب سوچی اور فرمایا کہ: اچھا چلو! ہم دہریہ کا مقابلہ اور مناظرہ کرتے ہیں۔ وقت مقرر ہوگیا اور مقام بھی ایسا طے کیا ۔جو دریا کے اس پار تھا۔ بغیر کشتی کی مدد کے وہاں تک رسائی ناممکن تھی۔

اب وقتِ مقرّرہ پر سب لوگ جمع ہوگئے۔ پادری (دہریہ) اور اس کے حواری بھی ہیں مسلمانوں کا جم غفیر ہے۔ پادری کی دھوم ہے کہ دیکھو مسلمانوں کا نمائندہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔ وہ آئے گا کیسے؟ اس میں اتنی ہمت اور جرأت کہاں ہے؟ وہ ہم سے مقابلہ کیا کرے گا؟ ہمارے شاگردوں سے بھی بات میں بازی نہیں لے جائے گا۔ اسی لیے وہ چھُپ گیا ہے۔ اب وہ آئے گا نہیں۔ اسی نے تو یہ وقت اور مقام کا انتخاب کیا، پھر کیا ہوگیا؟ روپوشی کس لیے ہوی؟ یہ روباہ مزاجی اور بے حوصلگی کیسی؟ کیا اب بھی اس کو اپنا امام مانتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ وغیرہ وغیرہ باتیں کر رہا ہے۔
اِدھر مسلمان ہراسان و پریشاں ع: گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کے دلدل میں پھنسے دہریہ کا منہ تاکتے بیٹھے رہے اسی پیچ و تاب اور عالمِ اضطراب میں دفعتہً سراج الامت، امام الائمۃ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دُور سے آتے دیکھ کر مسلمانوں کی جان میں جان آئی۔ ہمت بندھی اور تسلّی ہوی۔ (ایسی تاخیر اور بلاوجہ لوگوں کو پریشانی اور انتظاری میں رکھنا یہ امام صاحب نے عمداً کیا تھا۔)
اب مناظرہ کے میدان میں امام صاحب جلوہ افروز ہوتے ہی اپنی اس غیر معمولی تاخیر کی وجہ بیان کرنے سے پہلے پبلک سے معذرت چاہی اور فرمایا کہ بڑی دیر سے آپ لوگوں نے میری انتظاری میں جو تکلیف برداشت کی ہے۔ اس کا میں شرمندگی کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔ وجہ یہ ہوئی کہ میں اپنے مقررہ وقت پر حاضر ہوگیا تھا مگر افسوس ہے کہ دریا کے ساحل پر اس وقت کوئی کشتی موجود نہ تھی۔ میں پریشانی کے عالم میں کھڑا شدّت سے انتظار کرتا رہا کہ کوئی کشتی آجائے تو اس پر سوار ہو کر حاضر ہو جاؤں۔ مگر یہ شومئی قسمت کہیے یا عجیب اتفاق کہ کسی کشتی کو نہ آنا تھا نہ آی۔ بالآخر دُور سے ایک تختہ نظر پڑا جو موجوں کے تھپیڑوں سے بہتے چلا آ رہا تھا۔ پھر دیکھتا کیا ہوں کہ ایک دوسری سمت سے ایک اور تختہ اسی طرح بہتے ہوئے آ رہا ہے پھر تیسری جانب سے بھی ایک اور تختہ آ لگا۔ اور دیکھتے کے دیکھتے یہ تینوں تختے آپس میں خود سے اس طرح جڑنے لگے کہ گویا انھیں کسی بڑھائی (کارپینٹر) نے ٹھیک ٹھاک کر دیا ہو اور کشتی کی صورت دیدی ہو۔ اس کے بعد یہ تختے کشتی کی

صورت میں بدل گئے اور یہ کشتی بغیر کسی ملاح کے خود سے چلنے لگی اور میرے قریب آلگی اور میں اسے بروقت ایک تائید غیبی سمجھ کر اس پر سوار ہوگیا۔ پھر یہ ہواؤں کے زوروں میں مجھے یہاں لاکر چھوڑ گئی۔ اس طرح میرے آنے میں تاخیر ہوگئی یہ کہہ کر حضرت امام ابو حنیفۃ النعمان التابعیؒ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

اتنا سُننا تھا، دہریہ صاحب کو شہ مل گئی اور وہ اس کا بتنگڑ بنا کر وہ زوروں میں بولنا شروع کر دیے۔ کہ بھئی سنو تو سہی آپ کے امام صاحب کی یہ بہکی بہکی باتیں لوگوں کو اُلّو بنانے کی بڑی اچھی چال چلی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی ممکن ہے کہ تختے آپ خود سے آپس میں مل جائیں اور کشتی کی صورت اختیار کر جائیں۔ پھر بغیر کسی آدمی یا ملاح کے آپ خود سے چلنے بھی لگے۔ واہ جناب کیسی منطق ہے اور کیسے بے ہودہ خیالات ہیں۔ یہ الٹی منطق کسی سنجیدہ اور عقل مند انسان کے حلق نہیں سکتی۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ کوئی بڑے آدمی ہوں گے! بڑی بڑی باتیں عقل ونقل کی سنائیں گے۔ مگر افسوس ہزار افسوس کہ یہاں تو ع: "من چہ می گویم طنبورۂ من چہ می سرایدہ" والا جھول جھول نظر آتا ہے۔

اس طرح خوش ہو کر دہریہ بکواس کر رہا تھا اور امام صاحب خاموش اس کی بکواس کو سُن رہے تھے۔ جب وہ بیٹھ گیا تو امام صاحب اٹھے اور فرمایا کہ الحمد للہ! اب میدان ہمارا ہے۔ جیت ہمیں ہوی ہے۔ خوشی ہماری ہے۔ مناظرہ ختم ہوگیا ہے۔ جو بات میں کہنا چاہتا تھا، اسی کو اب اللہ ہمارے پنڈت جی کی زبان سے پوری شد و مد کے ساتھ ظاہر فرما رہے ہیں۔

یہ سُننا تھا دہریہ نے کہا کہ ابھی مناظرہ شروع ہی کب ہوا، جو آپ ختم ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ کیا بات ہے میں اسے ماننے کے لیے تیار نہیں۔

اب اس پر امام صاحب نے فرمایا کہ: پنڈت جی سنو! جو بات آپ کہہ رہے ہیں، یہی ہم بھی کہتے ہیں۔ اگر آپ اس کو نہیں سمجھ سکے تو سنو: جب ایک تختہ دوسرے تختہ سے بغیر کسی بڑھائی کے نہیں جڑ سکتا اور ایک کشتی بغیر ملاح کے آپ خود سے چل نہیں سکتی تو پھر بتاؤ یہ اتنی ساری کائنات بغیر کسی صانع کے کیسے قائم ہوگئی؟ ایک معمولی تختہ محتاج ہے بڑھائی (کارپینٹر) کا۔ ایک کشتی محتاج ہے ملاح کی تو ساری دنیا کیا خالقِ کائنات کی محتاج نہیں ہے؟ اب بات سمجھ میں آ گئی ہر طرف سے مرحبا و آفریں کی صدائیں گونجیں اور پنڈت جی کی گردن سر تسلیم کے لیے خم ہوگئی اور وہ شرف قبول اسلام ہوے۔

قرآنِ حکیم کے کئی ایک واقعات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جہاں کہیں اللہ کی مرضی تھی وہاں ہر ایک کام کامیاب ہوا، اور جہاں ہیں اللہ کی مرضی نہیں، تمام انسانوں کی لاکھ کوشش کرنے کے باوجود، ہر قسم کی طاقت کے باوجود وہ کام مکمل نہ ہوتے پایا۔

سورۂ فیل کا واقعہ سے یہ بات اچھی طرح ہمارے سامنے ظاہر ہوتی ہے کہ ابرہہ کی پوری طاقت، اس کی پوری فوج مل کر بھی کعبۃ اللہ کو گرا نہ سکی۔ ابرہہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکا۔ کیوں کہ اللہ کا ارادہ کچھ اور تھا اور

اللہ نے ابابیل نامی چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعہ سے ابرہہ اور اس کی فوج کو تباہ و برباد کر دیا۔ ابرہہ کی اس ناکامی سے یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ارادے و مرضی کے مقابلہ میں ابرہہ کی پوری قوت اور اس کی کثیر فوج اور طاقت کچھ نہ کر سکی۔

نمرود جو ظالم بادشاہ تھا اور خدائی کا دعویٰ کرتا تھا، جب حضرت ابراھیم علیہ الصلوۃ والسلام نے اس کے سامنے یہ دلیل رکھی کہ میرا خدا تو وہ ہے جو مشرق سے سورج کو نکالتا ہے اور مغرب میں ڈبوتا ہے اگر تو اپنے خدائی کے دعویٰ میں سچا ہے تو سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا۔ یہ دلیل سن کر نمرود لاجواب ہو گیا۔ وہ مبہوت ہو گیا۔ اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ پھر اس نے اپنی طاقت و اختیار کے بل بوتے پر آپ علیہ السلام کو آگ میں پھنکوایا۔ لیکن یہی آتش نمرود آپ علیہ السلام کو نقصان پہنچائے بغیر گلزار بن گئی اور کچھ نہ کر سکی۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کامیاب ہو گئے اور نمرود ناکام ہوا۔ آخر کیوں نمرود ناکام ہوا۔ جب کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام اکیلے تھے اور آپ کے مقابل نمرود تھا، جو اس وقت کا بادشاہ تھا، بہت زیادہ طاقت رکھتا تھا، کثیر فوج تھی، اس کے باوجود وہ ناکام ہوا اور برباد ہوا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نمرود اللہ کی مرضی اور ارادے کے خلاف چل رہا تھا اور حضرت ابراھیم اللہ کی مرضی اور ارادے کے مطابق چل رہے تھے۔ جہاں اللہ کی مرضی اور ارادہ ہوتا ہے، وہ کام کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ اور جہاں اس کی مرضی اور ارادہ نہ ہو وہ ناکام رہتا ہے۔

اسی طرح شدّاد نے بھی اللہ کی مرضی و ارادوں کے سامنے اپنی مرضی اپنے ارادوں کو پورا کرنا چاہا۔ اس نے اللہ کی جنّت کے مقابل دُنیا میں ایک جنّت بنای اور لوگوں کو دعوت دی کہ آؤ دیکھو میں نے بھی اللہ کی طرح جنّت بنای ہے۔ میں بھی جو چاہے کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر ایک سانس بھی نہیں لے سکتا۔ جب وہ اپنی خود ساختہ جنّت میں داخل ہونے کی کوشش کیا تو وہ اپنا ایک قدم بھی اس جنّت میں نہیں رکھ سکا اور وہیں ہلاک ہو گیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات موجود ہے۔ اس کے حکم اور مرضی کے بغیر ایک پتّا بھی ہل نہیں سکتا۔ اللہ کی ذات اگر کسی کو بچانا اور کامیاب کرنا چاہے تو دُنیا کی کوئی طاقت نہ اُسے ختم کر سکتی ہے اور نہ ناکام کر سکتی ہے۔ اگر اللہ کسی کو برباد و ناکام کرنا چاہے تو کوئی بھی طاقت اور قوت اسے بربادی اور ناکامی سے نہیں بچا سکتی۔

آقائے دوجہاں سرورِ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفّارِ عرب کے سامنے جب صدائے حق بلند کی تو انھوں نے آپ کی مخالفت کی۔ اور خود آپ کے چچا ابولہب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر طرح کی تکلیف دی۔ بُرا بھلا کہا۔ جب آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابولہب کو اللہ کے عذاب سے آگاہ کیا تو ابولہب کہنے لگا: میرے پاس بہت دولت ہے، مجھے کوئی چیز ہلاک نہیں کر سکتی۔ میں اپنی دولت کے ذریعہ ہلاکت و بربادی سے

سے بچ جاؤں گا۔ لیکن جب اللہ نے ارادہ کیا (ما اغنی عنہ مالہ وما کسب) تو ابولہب بیماری میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوا۔ اس کی دولت اس کے کچھ کام نہ آئی۔ پورے کفّارِ عرب کی کوشش اس کے کام آئیں۔ پورے کفّارِ عرب کی کوشش آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کامیاب ہونے سے روک نہ سکی۔ کیوں کہ اللہ کی مرضی اور مدد و نصرت آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہی اس لیے اتنی مخالفتوں مصیبتوں اور بے سروسامانی کے باوجود کامیاب ہوے۔

محترم قارئین غور و خوض کیجیے کہ جنگِ بدر میں مسلمان صرف تین سو تیرہ (313) تھے اور کفّارِ مکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن کامیاب تین سو تیرہ ہوے اور ہزاروں کی ناکامی ہوی۔ یہ اللہ تعالےٰ کی مرضی تھی کہ صرف تین سو تیرہ کامیاب ہوجائیں۔ اگر اس وقت مسلمانوں کی اس مختصر جماعت کے سامنے کروڑوں کی تعداد میں بھی کفارِ مکہ ہوتے تب بھی مسلمانوں کی جیت ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مرضی کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔

حاصلِ تحریر!

مندرجہ بالا واقعات سے یہ بتانا مقصد ہے کہ اللہ کی ذات موجود ہے۔ ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اپنے حبیب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے سے اور اپنے حبیب ومقبول کے طفیل اپنی معرفت عطا فرمائے اور اپنے محبوب حضرت محمدؐ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

نعتِ شریف

ڈاکٹر حکیم سید افسر پاشاہ افسر شفا ڈسپنسری۔ گڑیا تم

سب مدینے کو گئے ہم رہ گئے
ہجر کے غم کو بھی سہتے رہ گئے

لوگ ہم کو چھوڑ کر کیوں چل دیئے
ہم تڑپتے روتے روتے رہ گئے

ہم مدینہ جاتے جاتے رہ گئے
تھا اشارہ یہ اُدھر سے رہ گئے

تھا یہی قسمت میں آخر بالیقیں
ورنہ ہم بھی ہوتے آگے بڑھ گئے

یاد میں آقا کی آنسو بہہ گئے
قطرے قطرے سے بھی دریا بہہ گئے

لاکھ کوشش کی مگر پہنچے نہیں!
اک لبِ بام ہم تو پیچھے رہ گئے

اب مدینہ جائیں گے افسر حکیم
ہے مقدّر سوچ کر یہ رہ گئے



فیضانِ اولیاءِ کرام

حضرت مکان مولانا ابوالحسن محمد رمضان القادری کلیان پوری استاذ دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ جس نے نوعِ انسان کو لَقَدْ کَرَّمْنَا بنی آدم کے تاج زرّین سے سرفراز فرما کر لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم کا مصداق بنایا اور عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے اس کی ترکیب فرمائی۔ پھر انہی عناصر اربعہ کا اس کو محتاج بھی بنایا کہ وہ ان میں سے کسی ایک سے بھی برطرف ہو کر اپنی زندگی قائم نہیں رکھ سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو خلقی طور پر محتاج بنایا تو ایسی صورت میں بندہ اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ عالی سے کس طریقہ سے اپنی فریاد یا حاجات، استمداد اور استعانت طلب کرے، نیز اس کے خاص اور برگزیدہ بندے انبیاءِ کرام اور اولیاءِ کرام سے فریاد، حاجات، استمداد اور استعانت طلب کرنا شرعی طور پہ جائز ہے یا نہیں؟ یا ان بزرگ اور مقتدر ہستیوں کو اپنے اوپر قیاس کر کے انھیں بے بس یا مجبور محض تصوّر کرے؟ یا ان مقربانِ حق کو بارگاہِ الٰہیہ سے کچھ اختیارات و تصرّفات بھی عطا کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے بندہ انہیں اپنا معین و مددگار سمجھ سکے! درجِ ذیل مضمون میں قرآن و احادیث کی روشنی میں انہیں باتوں پر اہل سنت والجماعت کے موقف کا سرسری طور سے اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

ے
طوفان نوح لانے سے کیا فائدہ ایک بوند ہی بہت ہے گر کچھ اثر کرے
اثر تو کرے یا نہ کرے سُن تو لے میری فریاد نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

ایک اصول

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حقیقی مدد کرنے والا وہی پاک پروردگار عالم ہے اور اس کے سوا ناصر حقیقی واقعی دوسرا کوئی نہیں ہے۔ مگر یہ انبیائے کرام اور اولیاءِ کرام اللہ ہی کے مدد و نصرت کے مظاہر ہیں۔ اللہ کی مدد و نصرت کا ان کے ذریعہ سے اظہار ہوتا ہے اور ہم جو ان کی مدد چاہتے ہیں یا حاجت روا جانتے ہیں، انہیں ناصرِ حقیقی سمجھ کر نہیں بلکہ مظہرِ عونِ الٰہی سمجھ کر۔ ان سے مدد چاہنا دراصل اللہ ہی سے مدد حاصل کرنا ہے۔ غیر اللہ کو ناصر حقیقی تصوّر کرنا بھی شرک ہے۔ لیکن اہل اللہ کو ناصر مجازی سمجھ کر مدد طلب کرنا عین توحید اور اسلام کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مقربان حق کو بڑی

زبردست اختیار واقتدار سے نواز کر ہم جیسے گنہ گار اور سیہ کار بندوں کی رشد وہدایت کے لیے اس فرشِ گیتی پر جلوہ افروز فرمایا ہے ۔ یہ حضرات ہم جیسوں سے حد درجہ ممتاز و بالاتر ہیں ۔ انہیں اپنے اوپر قیاس کرنا اور انھیں مجبورِ محض تصوّر کرنا بد دینی گمراہی اور ہلاکت وتباہی ہے ۔ جیساکہ قرآن واحادیث اور کتب تصوّف کے مطالعہ سے ظاہر اور واضح ہے ۔

امتیازی کیفیت

قرآنِ شریف میں ہے : تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۔ یہ رسول ہیں ان میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو اللہ نے شرفِ ہم کلامی سے مشرف فرمایا اور بعض وہ ہیں جن کو اللہ نے درجوں بلند کیا ہے ۔ ایک دوسری آیتِ کریمہ ہے : هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ : یعنی علم والے اور بے علم والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے ہیں ۔ ایسے ہی ارشاد فرمایا : لَا يَسْتَوِي أَصْحٰبُ النَّارِ وَأَصْحٰبُ الْجَنَّةِ : جنّتی اور دوزخی برابر نہیں ہو سکتے ۔

فضیلت اور اہمیت کے اعتبار سے رسول رسول میں فرق ، نبی نبی میں فرق ، انسان انسان میں فرق وَقِس عَلٰی هٰذِهِ الآیات : مومن مومن میں فرق ، علم علم میں فرق ، جنّتی اور دوزخی میں فرق الغرض خطِ امتیاز کی یہ کڑی ایک لمبی کڑی ہو سکتی ہے ۔! لہٰذا انبیاء ومرسلین ، صدیقین ، شہدا اور صلحا کو ہم جیسے گنہ گار اور سیہ کار بندوں سے حد درجہ ممتاز سمجھنا چاہیے اور ماننا چاہیے ۔ کیوں کہ وہ حضرات ہر اعتبار سے ممتاز و بالاتر ہیں ۔ اور ہم ان کے محتاج ہیں اور ہر اعتبار سے محتاج ہیں ۔ ان کی ضرورت ہمیں ہر گھڑی ہے ۔ انبیاء اور مرسلین ، صدیقین ، شہداء کی عظمت و حرمت سر اور آنکھوں پر ہیں ۔ ان بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر جن گروہِ اولیاء وصلحاء نے اللہ کی نزدیکی اور اس کا قرب حاصل کی ہے ان صلحاء اور اولیاء کی ضرورت اور اہمیت تو ہماری زندگی کے گوشے گوشے اور چپّے چپّے میں ہے ۔ کسی شاعر نے یہ غلط نہیں کہا ہے : ؎

جب تک نہ لوگے آسرا اولیاء اللہ کا
سخت مشکل ہے پتہ ملنا رسول اللہ کا

دنیا نمونۂ آخرت

دنیا آخرت کا نمونہ ہے اور یہاں کا کاروبار اُس عالم کے کاروبار کا پتہ دیتے ہیں ۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے حشر ونشر اور رب کی الوہیت کو دنیاوی مثالوں سے ثابت فرمایا ہے ۔ مثلاً فرمایا کہ خشک زمین پر بارش پڑتی ہے تو پھر سبزہ زار بن جاتی ہے ۔ اسی طرح بے جان جسموں کو دوبارہ حیات دی جائی گی ۔ نیز فرمایا ۔ کہ تم گوارا نہیں کرتے کہ تمہارے غلاموں میں کوئی اور شریک ہو ۔ ہماری ملکیت میں بتوں وغیرہ کو کیوں شریک مانتے ہو ۔ غرض کہ دنیا آخرت کا نمونہ ہے اور دُنیا میں تو یہ دیکھا گیا ہے کہ یہاں کے بادشاہ یا حاکم ہر کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتے ۔ بلکہ سلطنت کے کاموں کے لیے محکمہ بنا دیتے ہیں اور ہر محکمہ میں مختلف حیثیت کے لوگ رکھتے ہیں ۔ کوئی افسر اور کوئی ماتحت ۔ پھر ان تمام محکموں کا حاکم یا مختار ، یا حاکم اعلیٰ وزیرِ اعظم کو منتخب کرتے ہیں ۔ یعنی

ہر کام بادشاہ کی مرضی اور اس کے منشاء سے ہوتا ہے۔ لیکن بلاواسطہ اس کے ہاتھ سے نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بادشاہ مجبوری کی وجہ سے اپنا عملہ رکھتا ہے۔ بلکہ رعب کا تقاضا ہے کہ ہر کام خدام سے لیا جائے اور رعایا کو ہدایت ہوتی ہے کہ اپنی ضروریات کے وقت اُن کے مقرر کردہ حکام کی طرف رجوع کرو۔

یہی طریقہ سلطنتِ الٰہیہ کا ہے کہ وہ قادر ہے کہ دُنیا کا چھوٹا بڑا ہر کام اپنی قدرت سے خود ہی پورا فرمادے۔ مگر ایسا نہیں کرتا بلکہ انتظام عالم کے لیے ملائکہ وغیرہم کو مقرر فرمایا اور ان کے علاحدہ علاحدہ محکمے کر دیے۔ جان نکالنے والوں کا ایک محکمہ، جس کے افسرِ اعلیٰ حضرت عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح انسان کی حفاظت، ماؤں کے پیٹ میں بچے بنانا، ان کی تقدیر لکھنا۔ مدفون میّتوں سے سوالات کرنا، صور پھونک کر مُردوں کو زندہ کرنا اور قیامت قائم کرنا پھر قیامت میں جنّت و دوزخ کا انتظام کرنا۔ الغرض دُنیا اور آخرت کے سارے کام ملائکہ میں تقسیم فرمادیے۔

اسی طرح اپنے مقبول انسانوں کے سپرد بھی عالم کا انتظام کیا اور ان کو اختیارات خصوصی عطا فرمائے۔ قرآن و احادیث اور کتبِ تصوّف کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اولیاء اللہ کے کتنے طبقے ہیں اور کس کے ذمہ کون سے کام ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ رب تعالیٰ ان کا محتاج ہے۔ نہیں بلکہ آئینِ سلطنت کا یہی تقاضا ہے۔ پھر ان حضرات کو خصوصی اختیارات بھی دیے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ یہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ کر سکتے ہیں۔ یہ محض ایک قیاسی بات نہیں ہے بلکہ اس پر قرآن و احادیث شاہد ہیں۔ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت مریم علیہا السلام سے کہا: قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ اے مریم میں تمہارے رب کا قاصد ہوں آیا ہوں تاکہ تم کو پاک فرزند دوں۔ معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل بیٹا دیتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: وَاَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ: میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ حضرت مسیح باذنِ الٰہی بے جان کو جان بخشتے ہیں۔ رب تعالیٰ اپنے حبیب کی شان میں فرماتا ہے: وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۝ ہمارے محبوب ان کو پاک فرماتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتے ہیں۔ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۝ ان کو اللہ و رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر گندگی سے پاک بھی فرماتے ہیں اور فقیروں کو غنی بھی کرتے ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کہے کہ ہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عزت دیتے ہیں۔ مال اور اولاد دیتے ہیں تو صحیح ہے۔ کیوں کہ آیات نے یہ بتایا ہے۔ لیکن مقصود یہی ہوگا کہ یہ حضرات حکومتِ الٰہیہ کے حکام ہیں۔ رب تعالیٰ نے ان کو دیا ہے، یہ ہم کو دیتے ہیں۔ اسی طرح مصیبت کے وقت اولیاء اللہ یا انبیاءِ کرام سے مدد مانگنا بھی اسی طرح ہوا۔ جس طرح کہ بیماری اور مقدمہ میں بادشاہ کی رعایا ڈاکٹر یا حکیم سے مدد مانگتی ہے

ایک اور آیت کریمہ ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ اگر یہ گنہ گار اپنی جانوں پر ظلم کر کے اے محبوب تمہارے پاس آجاتے اور پھر اللہ سے مغفرت مانگتے اور اے محبوب آپ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت فرماتے تو یہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔

حکیم الامت مفتی احمد یار خاں صاحب علیہ الرحمہ جاء الحق وزھق الباطل میں فرماتے ہیں کہ عالمگیری کتاب الحج باب آداب زیارت قبر النبی میں ہے کہ اب بھی جب زائر روضۂ پاک پر حاضر ہو تو یہ آیت پڑھے۔ یہ تو دنیا میں تھا۔ قبر میں تین سوال نکیرین کرتے ہیں، اول تو مَنْ رَّبُّكَ تیرا رب کون ہے؟ بندہ کہتا ہے کہ: اللہ پھر پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ بندہ کہتا ہے، اسلام ان سوالوں میں اسلام کی ساری باتیں آگئیں۔ مگر ابھی پاس نہیں ہوا۔ بلکہ آخری سوال ہوتا ہے کہ اس سبز گنبد والے آقا کو تو کیا کہتا ہے؟ جب یہ صراحتاً کہلوا لیا کہ ہاں ان کو میں پہچانتا ہوں، یہ میرے نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تب سوال ختم ہوتا ہے۔ تو قبر میں ان کے نام کی امداد سے نجات ہوئی۔ حاصلِ کلام یہ ہوا کہ انبیاء واولیاء سے فیض یا مدد مانگنا یا اُن کو حاجت روا جاننا نہ شرک ہے اور نہ خدا کی بغاوت۔ بلکہ یہ عین قانونِ اسلامی اور منشاءِ الٰہی کے بالکل مطابق ہے۔

ابدالِ شام

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضور سید عالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے کوئی نبی پیدا ہو نہیں سکتا۔ ہاں حضور کی امت میں حضور کے صدقے میں اولیاء کرام پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے اور یہ کہ دُنیا کا بقاء اور استحکام انہیں اللہ والوں کے طفیل ہے۔ چناں چہ ایک حدیث پاک میں وارد ہے کہ شام میں ابدال ہوں گے۔ ان کی تعداد چالیس ہوگی۔ ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو اس کی جگہ اللہ تعالےٰ دوسرے کو مقرر فرما دیتا ہے اور یہ چالیس کی تعداد پوری رہے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: يُسْقَى بِهِمُ الْغَيْثُ وَيُنْتَصَرُ بِهِمْ عَلَى الْاَعْدَاءِ وَيُصْرَفُ عَنْ اَهْلِ الشَّامِ بِهِمُ الْعَذَابُ ۔ (مشکوٰۃ شریف: ۵۸۲) اُن کے طفیل مینھہ برستا ہے اور انکی طفیل دشمنوں پر فتح ونصرت ملتی ہے اور انھیں کے طفیل اہلِ شام سے عذاب ٹلتا ہے۔ دیکھ لیجیے کس وضاحت سے بیان فرما دیا گیا ہے۔ کہ ان اللہ والوں کے طفیل مینھہ بھی برستا ہے اور انھیں کے طفیل فتح ونصرت بھی ملتی ہے اور عذاب بھی ٹلتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا انکار حقیقت کا انکار ہے۔ ہم سب ان اللہ والوں کے رہین منت ہیں یہ اللہ والے اللہ تعالےٰ کے مقرب اور مقبول بندے ہوتے ہیں۔ ان کے صدقہ میں اللہ تعالےٰ عوام کی بلائیں دفع فرما دیتا ہے

خود حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی یہ تعلیم بھی ہے کہ جنگل میں اگر کسی کا جانور گم ہو جائے تو وہ یوں پکارے: اَعِيْنُوْنِيْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ: اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔ گویا فرمایا گیا کہ مشکل کے وقت اللہ کے بندوں سے طلب امداد

کرنے پر اللہ کے بندے بہرِ امداد پہنچ جاتے ہیں اور مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔

اولیاء اللہ کے فیضان اور اُن کے تصرفات عوام کے فہم وادراک سے بالاتر ہیں۔ یہ بات مسلّم الثبوت ہے۔ کہ جو چیز نبی سے بطور معجزہ صادر ہو سکتی ہے، ولی اللہ سے اس کا ظہور بطور کرامت ہو سکتا ہے۔ چناں چہ علامہ ابن حجر مکی فرماتے ہیں: اِنَّ کُلَّ مُعْجِزَۃٍ وُجِدَتْ لِنَبِیٍّ یَجُوْزُ اَنْ تَقَعَ کَرَامَۃً لِوَلِیٍّ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ہ علم لدنی اس علم کو کہتے ہیں جو اللہ کریم اپنے خاص فضل و کرم سے اپنے خاص بندوں کو اپنی طرف سے سکھا دے۔ علامہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیخ توشی نے کہا کہ:

"علم لدنی اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں جنھیں وہ اپنے خاص اکابرین اولیاءِ کرام اور خاص بندوں کو سماع اور تعلیم کے بغیر عطا فرماتا ہے۔ یہ وہ اسرار ہیں، جن سے صرف خواص ہی آشنا ہوتے ہیں۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ علم ایک پوشیدہ خزانے کے مانند ہے۔ جس سے علمائے ربانی ہی واقف ہوتے ہیں۔ جب وہ علم کی باتیں بیان کرتے ہیں تو مغرور انسان کے سوا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ولایت کے لیے علم ضروری اور لابدی ہے۔ علم کے بغیر ولایت نہیں مل سکتی۔ علم چاہے کسی انسان سے حاصل کرے یا اللہ تعالیٰ اُسے علم لدنی عطا فرما دے۔

جاہل ولی نہیں ہو سکتا۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

مَنْ تَزَهَّدَ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَقَدْ مَاتَ فِی الْکُفْرِ۔ جو علم کے بغیر زہد کرتا ہے اس کا خاتمہ ایمان پہ ہونا مشکل ہے۔

باطنی نظام کا محکمہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا واقعہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ پروردگارِ عالم کا ایک مکمل باطنی نظام مقرر فرمایا ہوا ہے۔ یہ نظام مقبولانِ بارگاہِ الٰہی چلاتے ہیں اس باطنی نظام کی بڑی تفصیل ہے۔ اس مقام پہ اشارۃً اور اختصاراً محض حصولِ برکت کے لیے قارئین بزمِ "اللطیف" کی خدمت میں پیش ہے۔

علامہ زرقانی علیہ الرحمہ نے "شرح مواہب لدنیہ" میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے:

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہٗ قال قال رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اِنَّ للہ تبارک وتعالیٰ فی الارض ثلث مائۃ رجلٍ قلوبھم علیٰ قلبِ آدم علیہ السلام ولہ اربعون قلوبھم علیٰ قلب موسیٰ علیہ السلام ولہٗ سبعۃٌ قلوبھم علیٰ قلب ابراھیم علیہ السلام ولہ خمسۃ قلوبھم علیٰ قلب جبرئیل علیہ السلام ولہٗ ثلثۃ قلوبھم علیٰ قلب میکائیل علیہ السلام ولہ واحدٌ

قلبه على قلب اسرافيل عليه السلام فاذا مات الواحد أبدل الله مكانه من الثلاثة واذا مات من الثلاثة ابدل الله مكانه من الخمسة واذا مات من الخمسة ابدل الله مكانه من السبعة واذا مات من السبعة ابدل الله مكانه من الاربعين واذا مات من الاربعين ابدل الله من ثلث مائة واذا مات من ثلثة مائة ابدل الله مكانه من العامة فبهم يحيى ويميت ويمطر وينبت ويرفع الله بهم البلاء من هذه الامة۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالے عنہما سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلے اللہ تعالے علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالے کے لیے مخلوق میں تین سو اولیا رہیں ان کے دل آدم علیہ السلام کے دل پر ہیں۔ اور چالیس کے دل موسیٰ علیہ السلام کے دل پر اور سات کے دل ابراہیم علیہ السلام کے دل پر اور پانچ کے دل جبرئیل علیہ السلام اور تین کے دل میکائیل علیہ السلام اور ایک کا دل اسرافیل علیہ السلام پر ہے۔ جب ان میں سے ایک فوت ہوجاتا ہے تو تین میں سے کوئی اس کا قائم مقام ہوتا ہے اور ان میں سے جب کوئی فوت ہوتا ہے تو پانچ میں سے اس کا قائم مقام ہوتا ہے اور جب ان میں سے کوئی انتقال کرجاتا ہے تو سات میں سے اس کا قائم مقام کردیا جاتا ہے اور جب سات میں سے کسی کا انتقال ہوجاتا ہے تو چالیس میں سے کوئی اس کا قائم مقام کردیا جاتا ہے اور جب چالیس میں سے کوئی مرتا ہے تو تین سو میں سے اس کے قائم مقام کردیا جاتا ہے اور جب تین سو میں سے کوئی فوت ہوجائے تو عوام سے لیا جاتا ہے۔ انہیں سے حیات موت مینہ کا برسنا، نباتات کا اگنا، بلاؤں کا دفع ہونا ہوا کرتا ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تین سو چھپن (۳۵۶) اولیاء اللہ ہیں جو اس نظام کو چلاتے ہیں۔ نیز مصیبتوں کا دور ہونا، بارش کا برسانا، موت و حیات الٰہی اولیاء اللہ کی وساطت سے ہوا کرتی ہے۔

روض الریاحین میں حضرت خضر علیہ السلام سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ثَلٰثُمِائَةٍ هُمُ الْأَوْلِيَاءُ وَسبعون هم النجباءُ واربعون اوتاد الارض وعشرة هم النقباءُ سبعة هم العرفاء وثلثة هم العرفاء وواحد منهم الغوث: تین سو اولیاء ہیں اور ستر نجباء ہیں اور چالیس اوتاد ہیں اور دس نقباء ہیں اور سات عرفاء ہیں اور تین مختار ہیں اور ان میں سے ایک غوث ہے۔

زرقانی شرح مواہب لدنیہ صفحہ ۳۹۶ میں ہے کہ اولیاء کرام سے چار اوتاد ہوتے ہیں زمین پر۔ ایک مشرق دوسرے مغرب، تیسرے شمال اور چوتھے جنوب کا انتظام فرماتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں کہ شاہ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے مرید کو شہر کے گورنر نے بلا وجہ سزا دی۔ اس مرید نے شاہ بوعلی قلندر کی خدمت میں شکایت کی۔ آپ نے ہندوستان کے شہنشاہ کو خط لکھا۔ اس کے مضمون کا ترجمہ علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں کہ: ؎

بانگیر ایں عامل بدگوہرے ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے

اس گورنر کو واقعی سزا دی جائے اس نے میرے مرید کو بلاوجہ مارا ہے۔ اگر تو نے سزا نہ دی تو تیرا ملک کسی اور کو بخش دوں گا ملک کا دینا اور چھین لینا اللہ کا کام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: وتؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء: جس کو چاہے ملک بخش دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ اولیاءِ کرام اللہ تعالیٰ کے مظہر ہوتے ہیں ان کا ہر فعل درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ مگر وہ اولیاء جن کے سپرد یہ انتظام کیا جاتا ہے کبھی کبھی ان کی طرف بھی نسبت کر دی جاتی ہے۔ اس نسبت کو نسبتِ مجازیہ کہتے ہیں۔

اولیاء کا تصرف

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے یہ بزرگانِ دین ہر چیز پر حکومت فرماتے ہیں۔ چناں چہ واقعاتی سطح پر مضمون کی مناسبت سے دو واقعات درج کئے جا رہے ہیں۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا عام دستور تھا کہ وہ دریائے دجلہ پر مصلّے بچھاتے اور مصلّےٰ تیرتا ہوا پار گزر جاتا۔ کبھی کبھی آپ دیر تک دریا کے درمیان مصلے پر کھڑے رہتے تھے۔ ایک دن ایک آدمی نے دُور سے دیکھا اور سمجھا کہ کوئی ملاح کشتی لیے جا رہا ہے۔ اس نے آواز دی کہ اے ملاح! مجھے بھی پار لے جانا۔ آپ نے جواباً فرمایا: جلدی آجاؤ۔ ہم اس کائنات میں اسی لیے آئے ہیں۔ اس آدمی نے قریب آکر دیکھا کہ مصلّے پر کھڑے ہیں اور مصلّےٰ پانی پر تیر رہا ہے۔ اس نے عرض کیا: حضور! میں نے سمجھا شاید ملاح ہوگا۔ آپ نے فرمایا: تجھے دریا کے اس پار گزر جانے سے تعلق ہے۔ تجھے کشتی اور ملّاح سے کیا واسطہ۔ اس نے عرض کیا: حضور! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: میرے مصلے پر کھڑے ہو جاؤ اور یا جنید! یا جنید! کہتے چلو۔ اس نے مصلے پر قدم رکھا اور ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں ڈوب نہ جاؤں۔ آپ نے فرمایا۔ خوف مت کھاؤ اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اس نے اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیا اور مصلے پر کھڑا ہو گیا۔ مصلے پانی پر تیرنے لگا اور وہ "یا جنید" کہتا ہوا چلا جا رہا تھا اور مصلے پانی میں تیرتا جا رہا تھا۔ جب دریا کے درمیان پہنچے تو اس نے "یا جنید" چھوڑ کر "یا اللہ" کہنا شروع کیا۔ جونہی اس نے وسیلہ ترک کیا تو ڈوبنے لگا۔ آپ نے پکڑ کر باہر نکالا اور فرمایا کہ تم ابھی جنید تک بھی نہیں پہنچ پائے۔ اللہ تعالیٰ تک کیسے پہنچ سکتے ہو! معلوم ہوا کہ وسیلہ کے بغیر اللہ تعالیٰ تک پہنچنا مشکل ہے۔ مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر ہست پر از آفت و خوف و خطر

دوسرا واقعہ

فتوحِ الشام میں ہے کہ دریائے دجلہ کی وادی میں کفر و اسلام کی جنگ ہو رہی تھی۔ یہودی لشکر تعداد کے لحاظ سے لشکرِ اسلام سے کئی گنا زیادہ تھا۔ سامانِ حرب بھی اُن کے پاس بکثرت موجود تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگر انھیں شکست بھی ہو جائے تو دریائے دجلہ پار کرنے کے لیے ان کے پاس کشتیوں اور جہازوں کا وافر انتظام تھا اور دریا کے دوسرے کنارے مدائن کا قلعہ ایک مضبوط قلعہ تھا۔ جو یہودی لشکر کو

پورے طریقے پر پناہ دے سکتا تھا۔

جنگ زوروں پر تھی۔ زخمیوں کی چیخوں، گھوڑوں کی ہنہناہٹ نے آسمان کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ایک دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ قریب تھا کہ لشکر اسلام شکست سے دوچار ہو جائے۔ مگر لشکر کے سپہ سالار اعظم حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ولولہ انگیز تقریر نے مجاہدین کے حوصلے بڑھا دیے اور پھر لشکر اسلام نے تعاقب کیا۔ یہودیوں کے پاس دریائے دجلہ پار کرنے کا مکمل انتظام تھا۔ چناں چہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے دریا سے پار گزر گئے۔ اتنے میں لشکر اسلام دریا کے اس کنارے پر پہنچ گیا۔ ساٹھ ہزار گھوڑے کنارۂ دریا پہ کھڑے اپنے سپہ سالار کے حکم کے منتظر تھے۔ دریا اپنی طغیانی اور موجوں سے بہہ رہا تھا۔ کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　　کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

تھوڑی دیر میں حضرت سعد آ گئے۔ فرمایا: سپاہیو! کیوں کھڑے ہو گئے ہو؟ کیا دریائے دجلہ کی لہروں سے ڈر گئے ہو؟ مجاہدین نے کہا: صرف اور صرف آپ کے حکم کا انتظار ہے۔ آپ حکم دیں تو ہم اپنے گھوڑے دریا میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا: سب سے پہلے میرا گھوڑا جائے گا۔ آپ نے اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈالتے ہوئے فرمایا:

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ط ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

حضرت سعد کا گھوڑا پانی کی سطح پر سوار ہو گیا تو تمام لشکر اسلام نے اپنے اپنے گھوڑے دریا کی سطح پر ڈال دیے۔ سب کی زبان پر جاری تھا: بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖھَا وَمُرْسٰھَا۔ فاضل بریلوی نے کیا ہی خوب فرمایا کہ: ؎

آنے دو یا ڈبو دو اب تو تمہاری جانب　　　کشتی تمہیں پہ چھوڑی لنگر اٹھا دیے ہیں

لشکر اسلام کے گھوڑے دریا کی سطح پر دوڑے جا رہے تھے اور دریا سے چھینٹوں کی بجائے گرد اڑتی نظر آتی تھی۔ لشکر اسلام دریا پار کر گیا۔ مگر کسی کے گھوڑے کی زین تک بھی نہیں بھیگی تھی۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے　　　بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

معلوم ہوا کہ مقبولان بارگاہِ الٰہی کا پانی پر پورا پورا تصرف ہے۔ پانی بھی ان کا احترام کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

لشکرِ اسلام دریا کو پار کر گیا تو سپہ سالار نے کہا: اگر کسی سپاہی کی کوئی چیز دریا میں گر گئی ہو تو بتائیں میں دریا سے واپس لے کر دوں گا۔ ایک سپاہی نے کہا: اگر دریا میں کوئی چیز گر گئی ہو تو اس کا بہاؤ اسے بہا لے گیا ہوگا۔ اب واپس کیسے مل سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر تمہاری کوئی چیز گر گئی ہو تو بتاؤ۔ اس نے عرض کیا: حضور میرا لکڑی کا پیالہ گر گیا ہے۔ آپ نے دریا کو حکم دیا کہ میرے سپاہی کا پیالہ واپس کر دے۔ پیالہ پانی سے بہہ کر دور

نکل گیا ہے۔ دریا کے پانی میں ایک چکر سا بنتا ہے، وہ بنتا ہی گیا اور پیالہ دریا کی اوپر کی سطح کی طرف آتا گیا۔ آخر دریا نے پیالہ اچھال کر باہر پھینک دیا۔

پروردگارِ عالم کی عطا سے اولیاء اللہ سب کچھ دیتے ہیں۔ اُن کی نگاہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہوتی۔ عارفِ رومی فرماتے ہیں: ؎

لوحِ محفوظ است پیشِ اولیاء　　　ہر چہ محفوظ است محفوظ از خطا

حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ اپنی زبانِ حق ترجمان سے فرماتے ہیں: ؎

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللہِ جَمْعًا　　　کَخَرْدَلَۃٍ عَلٰی حُکْمِ اتِّصَالٖ

میں اللہ تعالیٰ کے تمام شہروں کو اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح ہتھیلی پر رائی کا دانہ ہو۔

نگاہِ ولی کی تاثیر امامِ اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے "الملفوظ" میں درج ایک واقعہ گوشِ گزار فرمائیں:

کسی دور کے ایک بزرگ تھے۔ جن کی ولایت و کرامت کی شہرت بہت دُور دراز تک پھیلی ہوئی تھی۔ چناں چہ خوش عقیدہ مسلمانوں کا دستور رہے کہ جب اور جہاں کہیں ایسے بزرگوں کا ذکر سنتے ہیں سر کے بل حاضر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی اس وقت کے دو عالم بھی حاضر ہوئے۔ ممدوح بزرگ کی اقتدا میں ان دونوں عالموں نے بھی جمعہ کی نماز پڑھی۔ نماز جہری تھی۔ قرأت سن کر دونوں مولانا صاحبان کے دل میں خطرہ گزرا کہ یہ ولی و بزرگ تو ہوسکتے ہیں مگر قرأت ان سے اچھی تو ہم پڑھتے ہیں۔ دل کی بات تھی۔ آئی گئی ہو کر رہ گئی۔

صبح خانقاہ میں ناشتہ کے لیے دسترخوان بھی بچھ گیا۔ سارے مہمان حاضر مگر وہ دونوں مولانا غائب! اللہ کے ولی نے فرمایا: ارے بھئی! میرے وہ دونوں مولانا کہاں گئے؟ متوسلین نے عرض کیا: حضرت! اُن کے ساتھ بڑا غضب ہوگیا۔ فرمایا: وہ کیا؟ متوسلین نے عرض کیا: وہ لوگ تالاب میں نہانے گئے تھے۔ سارے کپڑے اتار کر کنارے رکھ دیے۔ اسی اثنا میں شیر آیا جو ان کپڑوں کو گدّا بنائے بیٹھا ہے۔ شیر اس انتظار میں ہے کہ میری خوراک باہر آئے تو جاؤں اور مولانا لوگ اس انتظار میں ہیں کہ خطرے کا سگنل ڈاؤن ہو تو نکلیں۔

آخر انھیں بلایا کیسے جائے؟ حضرت پر جلال طاری ہوا۔ فرمایا: میرے مہمانوں کے ساتھ ایسا حادثہ کیوں پیش آیا؟ چناں چہ اسی کیفیت میں وہاں پہنچے تو سچ مچ دیکھا۔ کہ شیر کپڑوں پر بیٹھا ہوا ہے اور مولانا صاحبان پانی میں ڈبکی لگا رہے ہیں۔ اللہ کے ولی نے شیر کے رخسار پر دو طمانچے مارے اور ڈانٹ لگائی۔ اتنے میں شیر دُم دبا کر آگے بھاگا۔ اب آپ نے فرمایا: آپ لوگ باہر تشریف لائیے۔ خطرہ کی گھنٹی جاتی رہی۔ دونوں مولانا باہر نکلے اور ناشتے کے لیے چل پڑے۔ چلتے چلتے اللہ کے ولی نے فرمایا: یہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن آپ لوگ مجھ سے اچھا پڑھتے ہیں۔ لیکن ہمارا اور آپ کا فرق یہ ہے،

کہ آپ لوگوں نے زبان سیدھی کی ہے اور میں نے اپنا دل سیدھا کیا ہے۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ جس نے زبان سیدھی کی وہ شیر سے ڈرتا ہے میں نے دل سیدھا کیا اس لیے شیر مجھ سے ڈرتا ہے۔

یہ ایک کیفیت ہے جو غیر مرئی، اَن دیکھی شئے ہے جسے آنکھ کسی حال میں دیکھ نہیں پاتی۔ مگر اللہ کا ولی جو محسوسات و مدرکات کے ماورئی ہے اسے بھی نورِ باطن سے دیکھ لیتا ہے۔ حواس ظاہر اور عقل کے پردے میں وہ قوت ہے جو مغیبات پر مطلع ہوتی ہے۔ جب ان اولیاءِ کرام اور صلحاءِ کرام کی نگاہِ فیضان کا یہ عالم ہے تو اس مالکِ دارین کی نگاہِ فیض کرم کی پرواز کی کوئی کیسے حد بن متعین کرسکتا ہے۔

فاضلِ بریلوی علیہ الرحمہ کا یہ شعر عرض ہے: ؎

مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں ۔۔۔ دوجہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

نتیجۂ تحریر!

ان ارشاداتِ، آثار اور واقعات سے بخوبی واضح اور روشن ہوگیا کہ یہ دُنیا آخرت کا نمونہ ہے یہاں کا کاروبار اُس عالم کے کاروبار کا پتہ دیتے ہیں۔ انبیاءِ کرام اور اولیاءِ کرام اللہ تعالےٰ کی قدرت اور عطاء سے صاحبِ اختیارات و تصرّفات ہوتے ہیں۔ نیز اُن سے امداد و استعانت دراصل مالکِ حقیقی ہی سے امداد و استعانت ہے۔ ان مقربانِ حق کو اپنے اوپر قیاس کرنا قرآن و احادیث کے خلاف ہے۔ ان اولیاءِ اللہ کی بارگاہ میں حاضری دینا بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ وہ بزرگانِ دین اللہ کے مقربِ خاص اور برگزیدہ بندے ہیں۔ ان کی ضرورت و اہمیت ہماری زندگی کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں ہے۔ انھیں کی وجہ آج دنیا کے نظام کا شیرازہ منتشر ہونے سے مامون اور محفوظ ہے۔ انکے آداب و احترام کرنا، اُن سے نسبت و تعلق پیدا کرنا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھنا چاہیے، تاکہ ان کی روحانیت کی سوغات کا فیضان حاصل ہوکر اللہ اور اس کے پیارے حبیب صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی میسّر ہوسکے۔

اللہ تعالےٰ حق بات قبول کرنے کی توفیق رفیق عطا فرمائے: آمین یارب العٰلمین۔

وما علینا الا البلاغ

وصلے اللہ تعالےٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔۔۔

علمِ فقہ کی ضرورت واہمیت

مولوی قاری ایم بی الشیخ فضل اللہ لطیفی جنحی ایم اے، استاذِ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

فقہ کی تعریف لغت میں فقہ کے معنی ہیں الشق والفتح یعنی شق کرنا اور کھولنا۔ "شرح مسلم الثبوت" میں فقہ کی تعریف یہ کی گئی ہے: الفقۃ حکمۃ شرعیۃ فرعیۃ یعنی فقہ اس حکمتِ شرعیہ کا نام ہے جس کا تعلق عقائد سے نہیں بلکہ احکام سے ہے۔

عام فقہائے کرام سے فقہ کی تعریف یوں منقول ہے: العلم بالاحکام الشرعیۃ عن ادلتھا التفصیلیۃ۔ یعنی احکام شرعیہ کو معلوم کرنا اور ان کے تفصیلی دلائل کے ذریعہ۔

صاحب مسلم الثبوت کی صراحت کے مطابق عہد قدیم میں علم فقہ کا اطلاق وسیع مفہوم میں ہوتا تھا۔ یعنی اس کے دائرۂ بحث میں علمِ شریعت کے علاوہ علمِ الٰہیات اور علمِ طریقت کے مسائل بھی شامل تھے۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

ان الفقہ فی الزمان القدیم کان متناولا لعلم الحقیقۃ وھی الالٰھیات من مباحث الذات والصفات وعلم الطریقۃ وھی مباحث المنجیات والمھلکات وعلم الشریعۃ الظاھرۃ: یعنی علمِ فقہ زمانۂ قدیم میں شامل تھا علمِ حقیقت کو بھی جسے علمِ الٰہیات بھی کہتے ہیں اور جس میں خدا کی ذات وصفات سے بحث ہوتی ہے اور شامل تھا علمِ طریقت کو بھی جس میں نجات دینے والے اور ہلاک کرنے والے امور سے بحث ہوتی ہے اور شامل تھا علمِ شریعتِ ظاہرہ کو بھی جس میں احکام سے بحث ہوتی ہے۔

جس عہد میں فقہ کے مباحث کا دائرہ اتنا وسیع تھا اس وقت فقہ کی تعریف یہ کی جاتی تھی: الفقہ معرفۃ النفس مالھا وما علیھا: یعنی انسان کے فرائض وحقوق اور منافع ومضار کو جاننا علم فقہ کہلاتا ہے۔

ایک عرصۂ دراز تک علم فقہ کا اطلاق اسی مفہوم میں ہوتا رہا لیکن اسلامی فتوحات کے نتیجے میں جب دنیا کی مختلف اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات قائم ہوئے تو علوم وفنون کے تبادلے کا ایک نیا دور شروع ہوا اس دور میں یونانی فلسفہ کے اثرات بھی دینی مباحث میں داخل ہوگئے اور جب وقت کے تقاضے کے مطابق عقائد وایمانیات کو عقلی دلائل سے مسلح کرنے کی جدوجہد شروع ہوئی تو عقائد کے مباحث نے "علمِ کلام" کے نام سے ایک مستقل فن کی

حیثیت اختیار کرلی۔ اس کے بعد فقہ کا مفہوم "علمِ شریعتِ ظاہرہ" میں محدود ہوگیا۔

لیکن حجۃ الاسلام سیدنا امام غزالی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں ایک فقیہ کے جو اوصاف بیان کئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہزار انفرادیت کے باوجود فقہ پر علم طریقت کو اثر انداز رہنا چاہیے۔ ایک فقیہ کے اوصاف کے سلسلہ میں امام غزالی کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے:

فقیہ وہ ہے جو دُنیا سے دل نہ لگائے اور آخرت کی طرف ہمیشہ راغب رہے۔ دین میں کامل بصیرت رکھتا ہو۔ طاعات پر مداومت اپنی عادت بنالے کسی حال میں بھی مسلمانوں کی حق تلفی برداشت نہ کرے۔ مسلمانوں کا اجتماعی مفاد ہر وقت اس کے پیشِ نظر ہو۔ مال کی طمع نہ رکھے۔ آفاتِ نفسانی کی باریکیوں کو پہچانتا ہو۔ عمل کو فاسد کرنے والی چیزوں سے بھی باخبر ہو۔ راہِ آخرت کی گھاٹیوں سے واقف ہو۔ دُنیا کو حقیر سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس پر قابو پانے کی قوت بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ سفر و حضر اور جلوت و خلوت میں ہر وقت دل پر خوفِ الٰہی کا غلبہ ہو۔ (احیاء العلوم جلد ۱)

فقہ کی بنیاد قرآن میں فقہ کا فن عقلی علوم و فنون کی طرح خود ساختہ نہیں ہے۔ بلکہ قرآن و حدیث میں اس کی بنیادیں موجود ہیں۔ قرآن کے ساتھ علم فقہ کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ فقہ کا لفظ بھی قرآن ہی سے لیا گیا ہے۔ ویسے تو جگہ جگہ قرآن میں تدبّر، تفکّر، تعقّل اور شعور و ادراک کی دعوت عام ہے۔ لیکن ایک آیتِ کریمہ میں قرآن نے نہایت صراحت کے ساتھ اہلِ ایمان کو تفقہ کی دعوت دی ہے۔ وہ آیتِ کریمہ یہ ہے: فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین: (پ ۱۱: ع ۴) یعنی پس ایسا کیوں نہ ہو کہ مومنین کے ہر طبقے سے ایک جماعت نکلے تاکہ دین میں تفقہ حاصل کرے۔

واضح رہے کہ جس علم سے دین میں تفقہ پیدا ہوتا ہے اسی کا نام علمِ فقہ ہے۔ کیوں کہ فقہ ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق بے شمار علوم و فنون سے ہے۔ ایک حدیث کے مطابق قرآن کی اس آیتِ کریمہ میں بھی فقہ کی بنیاد ہمیں ملتی ہے۔ ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا (پ ۳: ع ۴) یعنی جو حکمت دیا گیا وہ خیرِ کثیر سے مالامال ہوا۔

حدیث میں فقہ کی بنیاد حضور اکرم سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین۔ (بخاری) یعنی اللہ تعالےٰ جس کے بارے میں خیر کا ارادہ فرماتا ہے۔ اُسے دین میں تفقہ عطا فرماتا ہے۔

دوسری حدیث مشکوٰۃ المصابیح، باب کتاب العلم میں ہے کہ ایک موقع پر حضور پُر نُور صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ان رجالا یاتونکم من الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیرا۔ یعنی زمین کے مختلف خطوں سے لوگ تمہارے پاس آئیں گے تاکہ دین میں تفقہ حاصل کریں۔ جب وہ تم سے ملیں تو تم انہیں خیر کی وصیت کرو۔

فقہ کی ضرورت ویسے تو قرآن و حدیث کے مذکورہ بالا نصوص ہی اس امر کے ثبوت کے لیے بہت کافی ہیں کہ مسلمانوں کو فقہ کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اگر ضرورت نہ ہوتی تو دین میں تفقہ حاصل کرنے کی دعوت کیوں دی جاتی۔ لیکن چوں کہ ایک طبقہ شدت کے ساتھ فقہ کی ضرورت کا منکر ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ذرا تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو منقح کر دوں۔

منکرین کا کہنا ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور احادیث خدا کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کا مجموعہ۔ قرآنی احکام میں جو اجمال ہے اس کی تفصیلات احادیث میں ہیں۔ جہاں تک شریعت کے احکام سے باخبر ہونے کا تعلق ہے تو اس کے لیے قرآن و حدیث کے بعد اب ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

فقہ چند انسانوں کے اقوال کا مجموعہ ہے۔ بندہ اور امتی ہونے کی حیثیت سے ہم صرف خدا اور رسول کے احکام کے پابند ہیں۔ اسی طرح امت کے چند افراد کی اطاعت ہمارے اوپر قطعاً مسلط نہیں کی جاسکتی۔ شارع کی حیثیت سے بندوں پر یا تو خدا کا قول نافذ ہو سکتا ہے یا رسول اللہ کا۔ امت کے چند افراد کے لیے تشریعی منصب تسلیم کرنا اسلام کا نہیں شرک کا تقاضا ہے۔

اس استدلال کے جواب میں سب سے پہلے ہم اس خیال فاسد کی تردید ضروری سمجھتے ہیں کہ اللہ و رسول کے علاوہ کسی اور کی اطاعت اسلام میں شرک ہے۔ خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا صاف و صریح فرمان موجود ہے

یاایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (پ۵ ع۶)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول اللہ کی اطاعت کرو اور تم میں جو صاحب امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ اولی الامر سے مراد خلفائے اسلام ہوں یا علمائے امت۔ دونوں طبقے میں سے کوئی بھی نہ خدائی کا منصب رکھتا ہے اور نہ رسالت اور نبوت کا۔ لیکن اس کے باوجود از روے فرمان خداوندی ان کا حکم ہمارے لیے واجب الاطاعت ہے یہ آیت کریمہ واضح طور پر اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ ائمۂ مجتہدین کے اقوال کی اطاعت ہی دراصل اولوالامر ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت ہے۔ کہ اللہ ہی کے حکم سے ہم ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ جس طرح آیت کریمہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ (پ۵ ع۸) میں رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے کہ اللہ ہی نے اپنے رسول کو اپنا نائب اکبر اور مطاع الکل بنا کر بھیجا ہے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ زندگی کے بے شمار احوال و ظروف میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لیے ہمیں قرآن و حدیث کے علاوہ بھی کسی اور چیز کی ضرورت ہے یا نہیں۔ تو اس سلسلہ میں ایک بنیادی نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مصدر احکام اور منبع قانون ہونے کی حیثیت سے قرآن و حدیث ہی اصل ہیں۔ قانون وضع کرنے کا حق صرف اللہ و رسول کا ہے۔ ائمۂ مجتہدین کو ہم شارع کی حیثیت سے نہیں بلکہ قانون کے شارح کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ فقہ ان

مسائل و جزئیات کے مجموعہ کا نام ہے، جو ایک مسلمان کو اپنی شخصی زندگی میں پیش آتے ہیں اور جنہیں ائمۂ مجتہدین نے قرآن و حدیث کے اصول و کلیات سے اخذ کیا ہے۔

امت پر ائمۂ مجتہدین کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے صحابۂ کرام کے فقہی احکام قضایا اور روزمرہ پیش آنے والے مسائل میں ان کے اجتہادات کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ طریقہ اخذ کیا کہ نئے نئے حوادث میں قرآن و حدیث کے اصول و کلیات سے احکام کا استخراج کس طرح کیا جاتا ہے۔ کون سا لفظ کتنے معنوں میں مستعمل ہے۔ قرآن کے نصوص سے مفہوم اخذ کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ زمان و مکان، احوال و ظروف اور اشخاص و طبائع کے اختلاف کا احکام پر کیا اثر پڑتا ہے؟ کیوں پڑتا ہے اور کب پڑتا ہے؟ تعبیرات اور اندازِ بیان سے حکم کی نوعیت معلوم کرنے کا ضابطہ کیا ہے؟ اسناد و رجال کے اعتبار سے حدیث کی قوت و ضعف کا احکام پر کیا اثر پڑتا ہے؟ اور کس نوعیت کے احکام کس حدیث سے ثابت ہوتے ہیں؟

اس طرح کی بے شمار اصول و ضوابط ائمۂ مجتہدین نے سالہا سال کی عرق ریزی، غور و فکر اور چھان بین کے بعد مرتب فرمائے جو اصولِ فقہ کے نام سے ایک مستقل فن کی صورت میں آج بھی ہماری درس گاہوں میں داخلِ درسیات ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ فقہ اور اصولِ فقہ ان دونوں فن کی کتابیں منکرین کے مدرسوں میں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔

فقہ کی ضرورت کے سلسلہ میں بحث کا یہ گوشہ بھی ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ قرآنِ حکیم میں چوں کہ احکام کے صرف اصول و کلیات ہیں۔ اس لیے قرآنی احکام کی تفصیل و تشریح کے لیے یہاں احادیث کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن احادیث کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ فرائض و احکام کی تعمیل کے سلسلہ میں ایک ایک فرد کو جو احوال و واقعات پیش آتے ہیں ان ساری تفصیلات کے لیے ان میں صریح احکام موجود ہیں۔ شریعتِ محمدی قیامت تک کے لیے مسلمانوں پر نافذ ہے۔ اس لیے زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور زندگی کے مختلف ظروف و احوال میں انھیں شریعت کی طرف سے واضح ہدایت چاہیے۔ یہیں سے شخصی زندگی کے ان مسائل میں جن کے متعلق کتاب و سنت میں صریح و منصوص احکام موجود نہیں ہیں۔ اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس طرح کے حالات میں اجتہاد کا حق علمائے امت کو خود رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیا ہے۔ اور قرآن بھی مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے تم واقف نہیں ہو، واقف کاروں سے پوچھ لو: فسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون۔ (رع ۱۴ع۱۱)

ظاہر ہے کہ پوچھنا عمل ہی کے لیے ہے۔ اس لیے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ از روئے قرآن بتانے والوں کے بتائے ہوئے مسائل پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور نہ پوچھنا لغو ہو جائے گا۔ اور بغیر علم کے یا تو آدمی اپنے خواہش نفس کی پیروی کرے گا یا بے عمل رہے گا۔

جب کتاب و سنت سے اجتہاد کی ضرورت اور اس کا جواز ثابت ہو گیا تو اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اجتہادی مسائل کے مجموعہ کا نام ہی فقہ ہے۔

دعا ہے کہ پروردگارِ عالم سنی حنفی مسلک پر ہمیں قائم رکھے اور اس کی برکتوں سے دونوں جہاں میں سرخرو فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ●●●

عصری دکنی کی چند لسانی خصوصیات

ڈاکٹر مظفر شہمیری۔ شعبۂ عربی، فارسی، اردو۔ شری وینکٹیشورا یونیورسٹی۔ تروپتی

عصری دکنی کی چند لسانی خصوصیات ہیں، جو اردو اور قدیم دکنی سے بڑی حد تک جدا ہیں۔ اس مقالہ میں ان ہی امتیازی خصوصیات کے تعین و تجزیے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقالہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّہ میں عصری دکنی پر مقامی زبان تلگو کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے میں دکنی کی بعض دوسری خصوصیات کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ دونوں سطحوں پر صرفی و نحوی تجزیہ کرنے کے علاوہ دکنی زبان میں پیدا ہونے والی صوتی تبدیلیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز ہر حصہ کے آخر میں نمونتاً دو چار خالص دکنی محاورے اور ضرب الامثال پیش کیے گئے ہیں۔ یہ لسانی مطالعہ آندھرا پردیش کے علاقہ رایل سیما کے چار اضلاع کرنول، اننت پور، کڑپہ اور چتور میں بولی جانے والی دکنی پر مبنی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ میں نے عمداً دکنی پر انگریزی اثرات کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ کیوں کہ اس کا اثر ہندوستان کی تمام زبانوں پر یکساں پڑا ہے۔

دکنی نے دراوڑی زبانوں سے اثر قبول کیا ہے۔ بعینہ ویسے ہی دراوڑی زبانوں نے اردو اور دکنی سے استفادہ کیا ہے۔ عصری دکنی پر تلگو، کنڑا، تامل اور ملیالم کے اثرات پڑے ہیں۔ الفاظ کے دادوستہ سے لے کر جملوں کی بندش و ساخت تک اس کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ ذیل میں دکنی پر تلگو کے اثرات کا جائزہ پیش ہے۔

عصری دکنی میں ضمائر موصول اور چند ایک متعلقات فعل کا استعمال تلگو کے قواعدِ زبان کے مطابق ہوتا ہے۔ اردو میں ضمائر موصول 'جو'، 'جن'، 'جسے'، 'جنھیں' اور متعلقاتِ فعل 'جوں' / 'جوں'، 'جوں' / 'جہاں جہاں' وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ تلگو میں ان کی جگہ 'یے ی' "یجڑا" اور "یورو" اور بعض اوقات تکرارِ لفظی کے ساتھ "یکڑا یکڑا" اور "یورو یورو" استعمال ہوتے ہیں۔ جن کا مطلب بالترتیب 'کیا'، 'کہاں'، 'کون'، 'کہاں کہاں' اور 'کون کون' ہے۔ لہذا دکنی میں اردو کے حرفِ موصول "جو" کی بجائے تلگو کے حرف موصول 'کیا' اور 'جن' کے بجائے 'کن'، 'جسے' کی بجائے 'کسے'، اور 'جہاں' کے بجائے 'کہاں'، "جہاں جہاں" کی بجائے 'کہاں کہاں' اور 'جوں جوں' کی بجائے 'کیوں کیوں'، استعمال ہوتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

تم جو کہنا چاہتے ہو، کہو (اردو)

تمے کیا بولتیں کی بولو۔ (دکنی)

نو یے می چپتاؤ چیبو۔ (تلگو)

جن

تم جن کے ساتھ گئے تھے۔ (اردو)

تمے کن کے ساتھ گئے تھے کی۔ (دکنی)

نو یورو تو پوتاؤ۔ (تلگو)

جسے/جنھیں

تم جسے/جس کو بُلانا چاہتے ہو بلالو۔ (اردو)

تمے کسے بلاتیں کی بلالو۔ (دکنی)

نو یورو نی پلیچیتاؤ پلچی کو (تلگو)

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'جو' کی جگہ کیا، جن کی جگہ کن اور جسے کی جگہ کسے استعمال ہوا ہے جو تلگو کا اثر ہے۔ اب آئیے کچھ متعلقاتِ فعل کی مثالیں دیکھیں۔

جہاں

تم جہاں جانا چاہتے ہو، جاؤ (اردو)

تمے کاں جاتیں کی، جاؤ (دکنی)

نو یکڑ کی پوتاؤ، پو (تلگو

جب یہ متعلقاتِ فعل اور ضمائرِ موصول تکرار لفظی کے ساتھ بولی جاتی ہیں تب بھی یہی طور روا رکھا جاتا ہے۔ مثلاً

جہاں جہاں

تم نے جہاں جہاں قدم رکھا...... (اردو)

تمے کاں کاں پاؤں رکھے کی.... (دکنی)

نو یکڑا یکڑا کال پیٹّتاؤ... (تلگو)

جوں جوں

تم نے جوں جوں محنت کی...... (اردو)

تمے کیوں کیوں محنت کرے کی.... (دکنی)

نو بیٹلا بیٹلا کشٹا پڑتاؤ (تلگو) وغیرہ

زبان کے ان نمونوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دکنی پر تلگو کا اثر کس قدر بھرپور رہے۔

دکنی میں "کتے" اور "کتو" کا استعمال بھی عام ہے۔ یہ بھی تلگو کا اثر ہے۔ دکنی کے بعض جملے ہو بہو تلگو جملوں کی طرح تشکیل پاتے ہیں۔ تلگو میں "کتے" کی جگہ "انٹا" استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب "کہا یا کہتا ہے اور جو" "الو" بمعنی "کہو" سے مشتق ہے۔ "کتے" کہتے کی مسخ شدہ صورت ہوسکتی ہے۔ ذیل میں اس کا نحوی تجزیہ ملاحظہ کریں۔

انھوں نے کہا کہ وہ آئیں گے۔ (اردو)

انو آئیں کتے۔ (دکنی)

واڑلو وستارو انٹا (تلگو)

اگر "کتے" کو کہنے یا کہتے کی بگڑی ہوئی شکل مان لیں تو تلگو کا انٹا اور دکنی کا کتے ہم معنی ٹھہریں گے ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

ان کے دل میں یہ ہے کہ ..... (اردو)

ان کے دل میں کیا ہے کتو ..... (دکنی)

واڑلہ منسولو یم اونڈے انٹے .... (تلگو)

یہاں "کتے" "کتو" میں تبدیل ہوگیا ہے۔ کبھی "کتو" اگر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

ان سے ملنا کتو...

مطلب یہ کہ اگر ان سے ملنا ہو تو ..... تلگو میں یہ جملہ بالکل اسی طرح ادا کیا جاتا ہے۔

دکنی میں کر کے یا کرکو کا استعمال دکنی اور تلگو کی ہم نشینی کا نتیجہ ہے۔ اردو میں جہاں حرفِ علت "کہ" استعمال کر کے دو جملوں کو ملایا جاتا ہے وہاں دکنی میں کرکو یا کرکے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم دکنی جملوں کی تقدیم و تاخیر الگ طرح سے ہوتی ہے۔ اردو میں جو جملہ "کہ" کے بعد آتا ہے وہ دکنی میں "کرکو" سے پہلے آتا ہے۔ اور یہی قاعدہ تلگو میں بھی ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

انھوں نے کہا کہ وہ گھر آئیں گے۔ (اردو)

انو گھر کو آئیں کرکو بولیں (دکنی)

واڑلو انٹی کو وستار انی چینپاڑو (تلگو)

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ تلگو اور دکنی کا اسلوب ایک جیسا ہے اور وہ اردو سے الگ ہے۔

تلگو کے اثر کی وجہ سے دکنی میں "نی" اور "نا" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ "نہیں" کے مخففات ہیں۔ تلگو میں ان کی جگہ "لیدا" اور "لیا" مستعمل ہیں جو حروف نفی ہیں۔ ان الفاظ کا محلِ استعمال اردو سے قطعی الگ ہے اور تلگو سے قریب۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں:

کیا میں نے نہیں کہا تھا؟ (اردو)

میں بولیا نیں کیا؟ (دکنی)

نے نو چیپّا لیدا؟ (تلگو)

یہ استفہام اقراری کی مثال ہے اور یہ جملہ من وعن تلگو جملہ کی طرح تشکیل ہوا ہے۔

تلگو کے بعض مہمل الفاظ دکنی میں جوں کے توں بولے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک لفظ "لے" ہے۔ جس کا استعمال اردو میں ندارد ہے۔ یہ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

جاتا ہے تو جانے دو (اردو)

گیا تو جاندے لے (دکنی)

پوتے پونی لے (تلگو)

دکنی گفتگو اس لفظِ مہمل کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھتی۔

دکنی اعداد پر اکثر لوگوں نے لکھا ہے کہ یہ تلگو کا اثر ہے۔ کہ اہل دکن بیس پر ایک (21)، چالیس پر دو (42) یا نود پر پانچ (95) وغیرہ کہتے ہیں۔ تاہم انھوں نے اعداد کی دوسری مختلف شکلوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مثلاً پاؤ ($\frac{1}{4}$) کے لیے تلگو عدد "کال" بولا جاتا ہے۔ اسی طرح پاؤ کے آدھے کے لیے "ارپاؤ" ($\frac{1}{8}$) بھی عام ہے۔ آج کل "سیر" کا زمانہ نہیں رہا۔ تاہم گھروں میں عورتیں "اسیر" کہتے ہیں۔ جو تلگو لفظ "اردھا" کے مخفف "ار" اور سیر کو جوڑ کر بنایا گیا ہے۔

آئیے اب تلگو اور دکنی کے کچھ مرکب فقرے دیکھیں۔ دکنی میں تلگو اور تلگو میں ہم معنی الفاظ جوڑ کر مرکب الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً لواحقین کے لیے سگے سودرے کا مرکب لفظ استعمال ہوتا ہے۔ "سودرے" تلگو لفظ "سودرا" بہ معنی بھائی کی جمع ہے۔ قصّہ اور کنتھا ملا کر قصہ کنتھا یا قصے کنتھے بنایا جاتا ہے۔ کنتھا دراصل کتھا ہے جو دکنی میں نون غنّہ کے اضافہ کے ساتھ کنتھا بن گیا ہے۔ اسی طرح 'گھر کمبا'، اور 'بوکے برتناں' عوام میں کافی معروف فقرے ہیں۔

مرکب الفاظ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تلگو الفاظ کو عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔ مثلاً من موجی کے لیے دکنی میں "جلسہ رائیڈو" کی ترکیب عام ہے۔ جو تلگو اور دکنی میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ اسی طرح چالاکی کے لیے کتی کمال کی ترکیب مستعمل ہے۔ کمال اور جلسہ عربی کے الفاظ ہیں۔ کتی اور رائیڈو تلگو کے۔ اس طرح کی کئی ایک ترکیبیں دکنی میں بولی اور بنائی جاتی ہیں۔

عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ تلگو لاحقے جوڑے جاتے ہیں۔ مثلاً گتی ایک لاحقہ ہے جس سے کئی الفاظ بنتے ہیں۔ مثلاً

ہوشیار سے ہوشیار گتی

ساہوکار سے ساہوکار گتی

بیزار سے بیزار گتی۔ بیزارگی وغیرہ۔

گی عام طور پر جہاں یائے اسمیت (ی) کا محل ہوتا ہے وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ہوشیاری، امیری، بیزاری وغیرہ۔

سنسکرت میں ایک لفظ گی ہے۔ جس کے کئی مطالب ہیں۔ ان میں حالت، کیفیت، ذریعہ وغیرہ شامل ہے۔ گی کو گی کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ مذکورہ مثالوں میں کسی کی حالت یا کیفیت کو دکھایا گیا ہے۔ یہ لفظ اگرچہ سنسکرت کا ہے، تاہم تلگو کے ذریعہ سے دکنی میں آیا ہے۔

عصری دکنی کے ضمائرِ اشارہ کی طرح استعمال ہوتی ہیں۔ اردو میں جہاں "اس" کا محل ہوتا ہے وہاں دکنی میں "یہ" اور جہاں "اُس" کا محل ہوتا ہے وہاں "وہ" بولا جاتا ہے۔

ای منشی وَچیاڑو۔	یہ آدمی آیا ہے۔
منشی کو راچیانو۔	اس آدمی کو دیا ہے۔

دکنی میں بھی بالکل اسی طرح بولا جاتا ہے۔

یہ آدمی آیا تھا۔

آدمی کو دیا۔

لہٰذا ضمیر جب اسم کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے 'یہ' اور 'وہ' استعمال کرتے ہیں۔ اور بصورت دیگر اگر صرف ضمیر کہنی ہو تو 'اِسے' یا 'اُسے' استعمال کرتے ہیں۔

دکنی محاوروں اور ضرب الامثال پر بھی تلگو کا راست اثر پڑا ہے۔ پچاسوں محاورے اور ضرب الامثال ایسے ہیں جو تلگو الفاظ سے بنے ہیں۔ یہاں نمونے کے لیے صرف پانچ پانچ مثالیں دی جاتی ہیں۔ پہلے چند محاورے ملاحظہ کیجیے:

پورسنا	برداشت کرنا	پوجا کرنا	سزا دینا
بٹے میں ڈال لینا	شیشے میں اتارنا	کِٹ لینا	فائدہ مند ہونا
ناشنم کرنا	برباد کرنا وغیرہ		

یہ چند ضرب الامثال بھی ملاحظہ فرمائیں:

ملا تو جیٹ نہیں تو پاداں — اَیو پاپ کتو چھو مچھنے کا عذاب (دھینے) — بے حیا کتو ایم اپّا کیا۔

پڑھے لکھے سے دھوبی بہتر — بیٹھ کو کھائے کتو پہاڑاں بھی گھٹ جائیں۔ وغیرہ

ایسے کئی محاورے اور ضرب الامثال دکنی میں موجود ہیں۔ جنھیں اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے۔

تلگو کے بعض مترادفات دکنی میں استعمال ہوتے ہیں اس طور سے کہ آج یہ دکنی ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں: مثلاً

الو = گڈلاگوبا	چٹنی = توکو	تماشا = گمّت	سُود = وڈی
شریر = انتی	مقابلہ = پوٹی	کُل = موتم	وغیرہ
تیز = کوس	تو ند = بوجا	راست = نیر	

آخر میں تلگو کے اثر سے پیدا ہونے والی ایک حرفِ تہجی کی ضرورت کا ذکر کرتا ہوں۔ تلگو کا ایک حرف ہے "ڑل" اس آواز کا کوئی حرفِ تہجی اردو یا دکنی میں نہیں ہے۔ تاہم عصری دکنی میں کئی ایک الفاظ ایسے ہیں جو اس صوتِ عجیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً

کرڑلا = کڑک   بُرڑلا = سکّہ   کھڑلا = بنا چربی کا گوشت۔ بے مزہ گوشت   کرڑلو = حاسد

نرڑلا = گلا   پھرڑلا = چاقو کی ایک قسم   جرڑلو = بچّہ کے منہ سے بہتا ہوا پانی   ہرلہ = ایک جڑی بوٹی

نیز ایک فعل ہے جو کثرت سے بولا جاتا ہے ..... اڑلانا ...... یعنی ڈانٹنا وغیرہ۔

جب اتنے سارے الفاظ روزانہ بولے جاتے ہیں تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ انھیں صحیح تلفظ کے ساتھ لکھنے کا انتظام کیا جاے۔ بہ الفاظ دیگر اس آواز کی نمائندگی کے لیے ایک نیا حروف تہجی وضع کیا جائے۔ میری رائے ہے کہ د، ڈ، ذ، ر، ڑ کے بعد ڑ اور لام کو ملا کر ایک نیا حرف تہجی ڑل وضع کیا جائے تاکہ مذکورہ الفاظ ایسے الفاظ یا ایسے کچھ اور الفاظ کو جب دکنی میں لکھنا پڑے تو "ل" سے لکھنے کے بجائے "ڑل" سے لکھیں، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔

دکنی پر تلگو کے ان اثرات کا جائزہ لینے کے بعد آئیے ہم دیکھیں کہ عصری دکنی میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جو اُسے تلگو اور اردو سے ممیز کرتی ہیں۔ پہلے کچھ صرفی نحوی تجزیے دیکھیں گے۔ بعد ازاں دیگر لوازماتِ زبان کا مطالعہ کریں گے۔

اردو میں "گا" علامتِ مستقبل ہے۔ عصری دکنی میں اس کی جگہ "دں" استعمال ہوتا ہے۔ ضمیر متکلم واحد کے لیے "اوں" اور باقی دونوں ضمائر کے لیے تیسے اور جمع کے طور پر تیں اور صیغہ تانیث کے لیے "تیوں" وغیرہ مستعمل ہیں۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

- ضمیر اور متکلم واحد

میں آؤں گا   میں آتوں

میں آؤں گی   میں آتیوں

- ضمیر مخاطب واحد

تم آؤ گے   تو آتیے

تم آؤ گی   تو آتیے (آتی ہے)

- ضمیر غائب واحد

وہ آے گا   انے اتیا

وہ آے گی   انے آتیے۔ وغیرہ

دکن میں بعض مونث اسماء کے لیے افعالِ تذکیر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں دو نئی مثالیں پیش ہیں۔

بارش پڑتا ہے۔   برسات پڑتا ہے۔   آواز آتا ہے۔   ہنسا آتا ہے۔ وغیرہ

عصری دکنی کی ایک اور خصوصیت اس کے جمع کا استعمال ہے۔ جو صحیح نہ ہونے کے باوجود عوام میں رائج ہے۔ مثلاً

آپ لوگاں وضواں کرلیو۔   تم لوگاں منواں دھولیو   تم لوگاں نمازاں پڑھ لیو   سامان اٹھا لیو

آج کل محبتاں بھوت ہوگئیں۔ وغیرہ

مذکورہ جملوں میں جن جگہوں پر اسماء کی جمع استعمال ہوئی ہے اردو میں ان کی جگہ واحد استعمال ہوتا ہے۔

قدیم دکنی میں "ستی" بہ طور حرف جار استعمال کیا جاتا ہے اب اردو اور دکنی دونوں میں یہ متروک ہے۔ تاہم "ستی" عصری دکنی میں گالیوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "بال ستی" وغیرہ

ترتیب اعداد کو ظاہر کرنے کے لیے اردو میں "واں" کا لاحقہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً بارہواں، تیرہواں، اکیسواں وغیرہ۔ عصری دکنی میں واں کی جگہ "ماں" استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

ایک ماں دوماں تین ماں دس ماں پچاس ماں سوماں وغیرہ۔

تاہم اب یہ لاحقہ دھیرے دھیرے ترک ہو رہا ہے۔

اردو کے بعض اسماء دکنی میں یائے مجہول کے اضافہ کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ چوں کہ یہ ایک غیر ضروری "ی" ہے اس لیے اسے یائے مزید کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ یہ مثالیں دیکھیے:

حیات کو حیاتی جگہ کو جگتی غرور کو غروری کہا جاتا ہے۔

عصری دکنی میں اردو کے بعض الفاظ کا پہلا حرف محذوف ہو جاتا ہے۔ مثلاً "سمانا" کا "س" محذوف ہو کر صرف مانا رہ جاتا ہے۔ اور اس سے اس کے تمام صیغے بنتے ہیں۔ مثلاً مانا، ماتا، ماتے، ماتی وغیرہ اسی طرح افلاطون کا الف حذف ہو کر فلاطون رہ جاتا ہے اور اس کی مونث فلاطونی بنایا جاتا ہے۔

عصری دکنی میں بعض لاحقے ایسے ہیں جو اسی سے مخصوص ہیں۔ ان کا تعلق نہ اردو سے ہے اور نہ تلگو سے۔ یہ لاحقے دکنی میں دو طرح سے مستعمل ہیں۔ اولاً یہ کہ اردو کا کوئی لاحقہ نئے انداز سے استعمال کیا گیا ہے۔ ثانیاً کوئی نیا لاحقہ وضع کیا گیا۔ مثلاً "گی" اردو کا لاحقہ ہے جو اسمیت مثلاً دیوانہ سے دیوانگی۔ آوارہ سے آوارگی وغیرہ اور وصفیت جیسے خانہ سے خانگی وغیرہ ظاہر کرنے استعمال کیا جاتا ہے۔ دکنی میں بھی یہ لاحقہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اردو میں جہاں "ی" لگا کر اسمیت یا وصفیت ظاہر کی جاتی ہے، وہاں دکنی میں "گی"، "اگی" یا "زگی" وغیرہ لگا کر کی جاتی ہے۔ جس سے اردو قواعد آشنا نہیں ہیں

مثلاً ہوشیاری	کے بجائے	ہوشیارگی	دیری	کی بجائے	دیراگی
چوری	کے بجائے	چوراگی	لال	کے بجائے	لالاگی
بے کلی	کے بجائے	بے کلاگی		یا	لالازگی
اور برائی	کے بجائے	برازگی وغیرہ			

ایک اور لاحقہ ہے "دگی" مجھے صرف ایک مثال ملی ہے:

کھانا کے بجائے کھادگی

یہ لاحقہ عصری دکنی سے مخصوص ہیں۔

اردو کا ایک لاحقہ "ات" ہے جو ہندی لاحقہ کے طور پر علامتِ اسمیت اور عربی لاحقہ کے طور پہ علامت جمع ہے تاہم "اتی" کوئی لاحقہ اردو میں نہیں ہے۔ البتہ عصری دکنی میں اس کی کم سے کم ایک مثال ملتی ہے۔ یہ لاحقہ عربی لفظ عین سے مل کر عینیاتی بنتا ہے۔ اور وصفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ عینیاتی ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے جس کا مطلب وہی ہے جو عین کا ہے۔

ایک اور لاحقہ "مت" بہ طور علامتِ اسمیت دکن میں مستعمل ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کریں:

کھانا سے کھامت کھامت کا مطلب بسیار خور ہے۔

ان لاحقوں سے ہٹ کر عصری دکنی میں اردو کا ایک لاحقہ ایسا بھی ہے جسے دکنی الفاظ کے ساتھ جوڑ کر غلط اور دوغلی ترکیبیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ لاحقہ "خور" ہے۔ جو فارسی سے مستعار ہے۔ اردو میں اس کے ساتھ کئی الفاظ وضع کیے جاتے ہیں مثلاً سود خور، چغل خور۔ بسیار خور وغیرہ تاہم عصری دکنی میں اس کا استعمال الگ طور سے کیا جاتا ہے - مثلاً

لڑائی خور	جھگڑالو	اتی خور	شریر
باتاں خور	باتونی	جلاپہ خور	حاسد وغیرہ۔

اس لاحقہ کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی جوڑے جاتے ہیں۔ مثلاً شان خور وغیرہ

ایک حرف کی آواز کا کسی دوسرے حرف کی آواز سے تبدیل ہونا' لسانی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ یہ تبدیلی مختلف زبانوں میں مختلف طرح سے ہوتی ہے۔ دکنی میں اردو کے "ک" اور "کھ" والے بعض الفاظ "خ" سے تبدیل ہوجاتے ہیں دو چار مثالیں ملاحظہ کریں۔

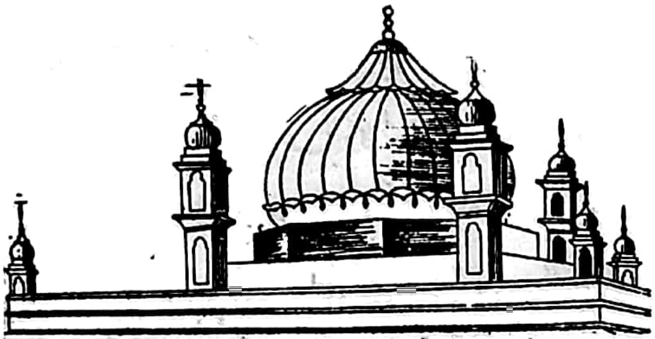
راکھ	راخ	لڑاکو	لڑاخ
سلکھن	سلخن	پھوکل	پھوخل

آخر میں کچھ خالص دکنی محاورے اور ضرب الامثال دیکھیں:۔

محاورے

اَرٹی پرکو کرنا	کوئی کام نمائشی جوش وخروش کے ساتھ کرنا۔
اوُل جانا	آپ سے باہر ہوجانا۔
جڑلو چھوڑنا	رال ٹپکانا
چیز ہونا	کسی چیز کا صحیح اور درست استعمال ہونا۔
چٹیا ہاتھ کو دینا	سب کچھ لوٹ جانا۔
لیپ لینا	بڑھ چڑھ کر کام کرنا۔
کھٹا چورنا	سزا دینا۔

(بقیہ صـ 50 پر ملاحظہ ہو۔)



○ ضمیمہ

اعدادِ بسم اللہ

حضرت مولانا حکیم سیّد افسر باشاہ قاسمی صبغۃ اللّٰہی۔ شفاء ڈسپنسری نڈوپیٹ۔ گڑیاتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام اس کے آخری پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر، جن پر قرآن مجید نازل ہوا اور پوری دنیا کے حق میں ایک رہبر اور آخری پیغام ثابت ہوا۔

فقیر کا مضمون بنام "اعداد بسم اللہ" ڈسمبر ۱۹۸۳ء میں جب پہلی مرتبہ شائع ہوا تو الحمد للہ ملک کے کونے کونے سے اس کو بنظرِ استحسان دیکھا گیا۔ اس کے چند سالوں بعد یہ فتنہ پھر ابھرا تو یہی مضمون دوبارہ شائع ہوا۔ اس طرح یہ تین چار مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

اب کی میرے بعض مخلص اور مہربان حضرات نے اس کے اندر اپنے کچھ اشکالات شکوک و شبہات پیش کئے ہیں جو یقیناً غور طلب بلکہ بظاہر معقول بھی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان شکوک و شبہات کا خلاصہ یہاں آپ کے سامنے رکھ دوں پھر ان کے حل طلب جوابات کی کوشش کروں۔

1۔ آیتِ رحمت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی داغ بیل حضور سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی بہت پہلے پڑ چکی ہے۔ چناں چہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے نام جو خط لکھا تھا، اُس کی ابتدا بھی آیت رحمت " بسملہ " سے اس طرح ہوئی ہے: انہ من سلیمٰن وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پھر جب انبیاءِ سابقین نے بھی اس کو اپنایا ہے تو ہم کیوں اس سے محروم رہیں؟

جب کہ حدیثِ شریف میں آتا ہے: کل امر ذی بال لم یبدأ ببسم اللہ فھو اقطع وفی روایۃ فھو ابتر۔ (ہر وہ اچھا کام جس کی ابتداء بسم اللہ سے نہ ہو وہ برکتوں سے خالی ہوتا ہے۔ اور ایک روایت میں اس کو منتشر اور بکھرا ہوا کہا گیا ہے۔)

2۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خطوط و مراسلے، شاہانِ روم و کسریٰ اور حبشہ وغیرہ کے نام کی ابتداء اسی آیتِ رحمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؐ سے کی گئی ہے۔ پھر ہم ان کی پیروی اور متابعت میں اس کو اپنائیں تو کیا بُرا ہے ؟ ......

3۔ یہ قرآنی اعداد کا شمار و حصار، حروف ابجد کا حساب اور ہندسوں کی ایجاد اصل میں یونانی، یہودی اور شیعی سازشوں کا شاخسانہ ہے۔ ان کی متابعت و پیروی یقیناً گمراہی کا نتیجہ ہے۔

4۔ جہاں بسم اللہ کے اعداد "۷۸۶" ہیں وہیں "ہرے کرشنا" کے اعداد بھی "۷۸۶" ہیں۔ اس طرح بسم اللہ کے نمبرات کی آڑ میں یہ ایک مشرکانہ عقائد کی ترویج و اشاعت ہے۔ نیز لام جلالہ (اللہ) کے اعداد ۶۶ ہیں۔ اب اگر کسی نے یہ کہا: کہ اے "۶۶" میری مدد فرمائیے تو کیا یہ ٹھیک ہے؟ اور اسی طرح فرض کیجیے کسی کے نام کا عدد "۴۲۰" نکلے جسے عرف عام میں فراڈ اور دھوکہ باز کہتے ہیں اور آپ انھیں جناب "۴۲۰" کہہ کر پکاریں تو کیا وہ اپنے لیے اس عدد کو سُننا گوارہ کریگا؟

یہ ہیں میرے بعض مخلص صاف گو احباب کے شبہات و خدشات، جن کے جواب سے پہلے یہ ذہن نشین رہے کہ نفس مسئلہ جائز یا ناجائز پر نہیں ہے بلکہ افضل اور غیر افضل پر ہے۔ پھر جب بات بہتر اور افضل، احوط اور انسب پر چل رہی ہے تو بفحوائے حدیث: دع مایریبک الی مالا یریبک۔ (جس بات پر شک ہو اسے چھوڑ دو اور جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اُسے اپناؤ) ایک صاف اور پاک طریقے کو اپنانا کون سا بُرا کام ہے؟ احتیاط کا تقاضہ جس پہلو میں زیادہ واضح اور رونما ہو اس کو اپنانے میں قباحت ہی کیا ہے؟

1۔ اب رہی یہ بات کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم آیتِ رحمت ہے اور بڑی متبرک آیت ہے اور شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بہت پہلے، اگلی شرائع نے اس کو اپنایا ہے۔ چناں چہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملکۂ سبا "بلقیس" کے نام اپنے خط میں لکھا ہے۔ اور ہماری شریعت محمدی علیہا التحیۃ والتسلیم نے بھی اس کو ضروری جانا اور ہر کام کی ابتداء میں اُسے پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ جو یقیناً ہمارے حق میں ایک رہبر ایک اصول، ایک قانون اور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود یہاں بنظر غائر اگر دیکھا جائے تو یہ اصول و قانون اور تبرک کا حصول بھی پوری تعظیم و تکریم سے ایک بندے کا اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق و رشتہ جوڑنے اور قائم کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور یہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے جہاں زبان سے ادا ہوتا رہے، وہیں دل سے بھی ہونا چاہیے۔ نیز یہ تحریر و کتابت کے وقت بھی ادا ہوتا رہے۔ بشرطیکہ اس کے بے ادبی کا احتمال نہ ہو۔ تعظیم و تکریم کا تقاضا ہی یہ چاہتا ہے کہ اس کا ہر ممکن احترام و اکرام ہو اور جہاں سوءِ ادبی کا احتمال ہو، وہاں احتیاط ضروری ہے۔

ہاں خط و کتابت اور تحریروں میں ایسے وقت مبنی بر احتیاط قلم سے نہیں زبان سے پڑھ لیں گے۔ جو اصل میں بھی معنی خیز بھی ہے اور اثرانگیز بھی۔ اور جب ہم نے اس کو زبان سے پڑھ لیا تو اب بظاہر قلم سے خطوط وغیرہ میں اس کی جگہ "باسمہ سبحانہٗ"، "باسمہ تعالیٰ شانہٗ" اور یا "باسمہ تعالیٰ یا "۷۸۶" پر اکتفا کرلینا ہی احوط اور انسب طریقہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگلی شریعتیں الگ تھیں اُن کے قوانین وضوابط بھی مختلف تھے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں حقیقی بہن اور بھائی کا ایک دوسرے کے ساتھ نکاح جائز تھا، گو کہ اُن دونوں کے درمیان میں وقفہ کی شرط تھی شریعت عیسوی علی نبینا و علیہم الصلوۃ والسلام میں روزے کی حالت میں بات چیت سے روزہ ٹوٹ جاتا تھا۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ انی نذرت للرحمٰن صوما فلم اکلم الیوم انسیا۔ (حضرت مریم علیہا السلام نے فرمایا کہ بے شک میں نے اللہ کے لیے روزے کی منت کی ہے اس لیے میں آج کسی بھی شخص سے گفتگو نہیں کروں گی۔)

جس طرح پچھلی شرائع میں قوانین الگ تھے اسی طرح ممکن ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت کے قوانین و ضوابط بھی الگ رہے ہوں۔ اور اس رُو سے وہاں بسملہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کو لکھ کر کفار و مشرکین اور آتش پرست کے ہاتھوں دینے میں کوئی کراہت، قباحت اور برائی نہ رہی ہو۔ اور ویسے ہم اُن کی متابعت کے پیروکار اور ان کی شریعت پر عمل پیرا ہونے کے مامور بھی ہیں نہیں۔

2۔ مانا کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "ہرقل"، "کسریٰ" اور دیگر مشرک بادشاہوں کے نام خطوط کی ابتداء "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے کی ہے تو پھر ؎

میں بھی اس پر مر مٹا ناصح تو کیا بیجا کیا؟ اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

کے تحت ہم بھی اپنے خطوط اور تحریروں میں اسے درج کریں تو کونسی قباحت ہے؟

اس سلسلہ میں موضوع مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر ذرا تفصیلی روشنی ڈالنی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کو اپنے ناموں میں سے دو نام سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔ ایک اللّٰہ اور دوسرا رحمٰن۔

ابتداء اسلام میں بسم اللہ لکھنے کا طریقہ اور معمول باسمک اللّٰھم تھا۔ پھر جب قرآنِ کریم کی یہ آیت قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن: (اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو) نازل ہوئی تو چونکہ اس میں لفظ اللہ اور رحمٰن کی صراحت موجود تھی اس لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ آئندہ سے باسمک اللّٰھم کا طریقہ بدل دو اور اب اس کی بجائے بسم اللہ الرحمٰن لکھا کرو۔ یعنی اس میں لفظ اللہ اور رحمٰن لگا دو۔

چناں چہ مسلمانوں کے ہاں آپس میں یہی طریقہ رائج ہو گیا۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین باسمک اللّٰھم کی بجائے بسم اللہ الرحمٰن لکھنے اور بولنے لگے۔ ابھی اس کے اندر لفظ "الرحیم" کا اضافہ نہیں ہوا تھا کہ اتنے میں سورۃ نمل کی آیت: انہ من سلیمٰن وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہو گئی تو اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ اب بسم اللہ الرحمٰن کے ساتھ لفظ الرحیم بھی بڑھا دو۔

اس طرح باسمک اللّٰھم سے بسم اللہ الرحمٰن ہوا۔ پھر بسم اللہ الرحمٰن سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہو گیا۔ (تفسیر "قرطبی" اور "روح المعانی" ملخصاً) اب یہی آیت اس وقت آپس میں بولی اور لکھی جانے لگی۔ چناں چہ شاہانِ مشرکین

کے پاس دعوتِ اسلام کی غرض سے جو خطوط ارسال کئے گئے ان میں بھی یہ آیتِ رحمت لکھی گئی تھی۔

غرض یہ ابتدائے اسلام کی بات ہے، جہاں شراب و خمار کی چھوٹ اور ڈھیل تھی اور اُن کی حرمت پر کوئی قانون یا وحی الٰہی نازل نہیں ہوی تھی، وہیں آیاتِ قرآنی کے چھونے اور لکھنے پر بھی کوئی پابندی عائد نہیں ہوی تھی۔ جس طرح شراب پینا اور جوا کھیلنا ابتدائے اسلام میں جائز تھا، اسی طرح وحیٔ الٰہی آیاتِ قرآنی کا بغیر طہارت کے لکھنا اور چھونا سب جائز تھا۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوی (یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما) آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتے ہیں شراب اور جوا کا حکم۔ آپ فرما دیجئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور (تھوڑے) فائدے بھی ہیں لوگوں کو اور ان کے فائدے سے بھی ان کا گناہ بہت بڑا ہے۔

تو بظاہر ان دونوں سے جہاں امراض روحانی و جسمانی مفاسد ظاہری و باطنی پیش آتے ہیں۔ وہیں سرسری اور وقتی طور پر شراب سے سرور و لذت اور جوے سے مال مفت بلا مشقت ہاتھ آتا ہے۔

چونکہ اس سے کوئی قطعی اور حتمی فیصلہ کا ثبوت نہیں ملتا تھا۔ بلکہ کسی درجہ میں شراب و جوے کی منافعت کا پہلو بھی اُجاگر تھا۔ اس لیے ان دونوں کا رواج پھر بھی موجود تھا اور جب دوسری آیت (یا یھا الذین امنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰریٰ) (اے ایمان والو نماز کے نزدیک نہ جاؤ جس وقت کہ تم نشہ میں ہو۔) نازل ہوی تو اب شراب نماز کے اوقات میں منع ہوگئی اور نہیں پی جاتی تھی۔ باقی اوقات میں پینا پھر بھی جائز تھا۔ کوئی واضح اور کھلا ثبوت اب بھی نہیں تھا۔

اس کے بعد جب تیسری آیت (یا یھا الذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون) ترجمہ: اے ایمان والو! بے شک شراب اور جوا اور بت اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے۔ سو ان سے بچتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ۔

نازل ہوی تو اب مکمل طور پر ہر طرح سے شراب و جوا حرام قرار پاگئے۔ جب تحریمِ خمر کی اس واضح تصریح نے جو اپنے اندر تدریج کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے اور علی الاعلان یہ واضح کردیا کہ آج سے شراب جو مکمل طور پر ہر طرح سے حرام و ناجائز ہیں تو لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے، خم خانے برباد کردیے۔ اپنا ایک محبوب و قیمتی سرمایہ لنڈھا دیا، مدینہ کی گلی کوچوں میں شراب پانی کی طرح بہنے لگی اور سارا عرب بیک وقت اس گندی شراب کو چھوڑ کر معرفت ربانی اور محبتِ یزدانی، اطاعتِ لاثانی اور عقیدت اور ارادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شرابِ طہور سے مخمور و محظوظ ہوگیا۔

اس طرح آہستہ آہستہ جب ان پر پابندیاں لگ گئیں اور بعد کے احکام پہلے کے حق میں ناسخ قرار پاگئے تو اب رفتہ رفتہ قرآنی آیات کے بلا وضو اور بغیر طہارت کے لکھنے اور چھونے پر بھی پابندی عائد ہوگئی۔ پہلے آیت کا لکھنا اور چھونا بلا وضو اور طہارت کے جائز تھا اور ایسے مشرکین و منافقین شاہان ہرقل و کسریٰ، نجاشی حبشہ کے ہاتھوں دینا بھی جائز تھا اور اب وحیٔ الٰہی نازل ہوگئی کہ (لا یمسہ الا المطھرون) (بغیر پاکی اور طہارت کے اس کو ہاتھ نہ لگاؤ۔)

چناں چہ اس آیت کا سیاق و سباق یا اس کی نقیض بھی یہی چاہتی ہے کہ اس کو بغیر وضو کے جس طرح لکھنا جائز نہیں ہے اسی طرح چھونا بھی جائز نہیں ہے۔ پھر جب اس کا محض چھونا ہی ناجائز ہے تو اس کا لکھنا تو بدرجۂ اتم ناجائز ہوا۔

غرض ان واضح حقائق کے پیشِ نظر اپنے خطوط و کتابت اور تحریروں میں اس آیتِ رحمت کا لکھنا اور لکھنے کے لیے زور دینا غور فرمائیں کہاں تک صحیح ہے؟ کیا ہماری دینی غیرت و حمیت اس کی اجازت دیتی ہے؟ جب کہ آیت لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ کے تحت ایک واضح اور کھلا حکم موجود ہے جو پہلے حکم کے حق میں ناسخ کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر بھی یہ اصرار کے اس کو اپنے خطوط اور تحریروں میں وضو اور طہارت والے مسئلہ کو بالائے طاق رکھ کر بلا کم و کاست بے دھڑک نقل کیا جاے۔ چاہے اس سے احتیاط و طہارت کا پہلو کتنا ہی چاک کیوں نہ ہوا اور تعظیم و تکریم کا تقاضا چاک در چاک ہو کر خاک میں مل جاے اور پامال ہو جائے کوئی حرج نہیں ہے۔

فیاللعجب:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت   دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

3۔ اب رہا تیسرا اشکال کہ تاریخ، ہندسوں اور حروف ابجد سے ۸۶ ے کا اختراع و ایجاد اصل میں یہود و نصاریٰ، یونانی اور شیعی حضرات کی طرف سے ہے۔ قرونِ اولیٰ میں اس کا کہیں ثبوت نہیں ہے۔

سو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ایسا تأثر دینے والے حضرات دراصل تاریخ اور دنیائے تاریخ سے لوگوں کا رُخ بدل رہے ہیں اور منہ موڑ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حالاں کہ روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت ہے کہ اس فن کی داغ بیل و ایجاد اور اصل بنیاد حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام نے رکھی ہے۔ اس کے بعد اس کو حضرت دانیال علیہ السلام نے مزید فروغ دیا۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں اُن کا صحابی اور مشیر و وزیرِ خاص آصف ابن برخیا نے جو اس حسابِ ابجد اور فنِ جمل و رمل میں ماہر تھا اور جسے اللہ تعالیٰ نے خود عندہٗ علم من الکتٰب سے آگاہ کیا ہے کہ وہ کتب سماویہ اور اُن کے حساب و کتاب اور تاثیرات کے علوم سے واقف تھا۔ اس لیے چشم زدن میں اس نے بلقیس کے تخت کو حاضر کر دیا۔

اس وقت میرے سامنے ایک نہایت قدیم قلمی فارسی نسخہ حضرت امام محمد زناتی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر کردہ موجود ہے۔ جس کا نام حضرت نے "جواھر الاسرار" رکھا ہے۔ اور اس کے حواشی کہیں کہیں سے کرم خوردہ بھی ہیں۔ پتہ نہیں اصل کتاب پر کتنی صدیاں بیت گئیں۔ البتہ کتاب کے آخر میں نقل کی تاریخ اور ناقل کا نام اس طرح موجود ہے۔

"تمت تمام شد بتاریخ دوم شہر شوال ۱۲۷۱ سنہ ہجری مقدسہ، از ید فقیر سید محمد غوث شریف المدنی، ساکن بیجاپور، عفی اللہ عنہٗ" غور کیجیے کہ اس کتاب کو نقل کیے ہوے ڈیڑھ سو صدی (۱۵۲) سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ اس کے صفحات (۱۱۸) ایک سو اٹھارہ ہیں۔ اور اسی قلمی نسخہ سے متصل یہی امام محمد زناتی کی دوسری کتاب بنام "دیوان الرمل" ۳۶ چھتیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس نسخے کی نقل کی تاریخ روز سہ شنبہ تاریخ بستم شعبان المعظم ۱۲۷۱ سنہ ہجری مقدسہ ہے۔

کتاب "جواھر الاسرار" کی ابتداء اس طرح ہو رہی ہے۔
"الحمد للہ رب العلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمد والہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد۔ بدانکہ ایں علم شریف' معجزۂ حضرت آدم و دانیال پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام است ایں علم پسندیدہ است وحق تعالیٰ در قرآن مجید از شرف آں خبری دہد: ایتونی بکتب من قبل ھذا او اثرۃ من علم ان کنتم صٰدقین ۰ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان نبیا من الانبیاء یخط فی الرمل فمن وافق خطہ فقد اصاب۔ بداں کہ دریں کتاب امام محمد زناتی رحمۃ اللہ علیہ۔ جمیع احکام استادانِ مصر و مغرب و یونان و ہند جمع کردہ؛ مسمّٰی "بجواھر الاسرار" نام نہادہ۔ پس طالبِ ایں فن را می باید کہ از فکر تمام بطبائع و نتائج حکم کردہ باشد تا صحیح و درست آید۔"

ترجمہ:" تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لیے جو سب عالموں کا پالن ہار ہے۔ انجام اور نتیجہ پرہیزگاروں کے حق میں ہے اور درود و سلام اللہ کے رسول محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آپ کی تمام آل و اصحاب پر بھی۔ بعد حمد و صلوۃ کے واضح ہو کہ یہ شریف علم (رمل) حضرت آدم اور حضرت دانیال پیغمبران علیہما الصلوۃ والسلام کے معجزات میں سے ہے۔ جو پسندیدہ بھی ہے اور حق تعالےٰ قرآن مجید میں بھی اس کے شرف و بزرگی کی اطلاع اس طرح دیتے ہیں۔ ایتونی۔ الخ "لاؤ میرے پاس کوئی کتاب اس سے پہلے کی، یا کوئی علم جو چلا آتا ہو اگر ہو تم سچے"

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ انبیاء میں سے بعض نبی ایسے بھی رہے ہیں، جو فن رمل کو اپنائے ہوئے تھے۔ پس جس کی تحریر ان کی تحریر کے مطابق ہوگی تو سمجھو کہ وہ حق کو پالیا۔ جان لو کہ یہ کتاب امام محمد زناتی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ جس میں انھوں نے مصر و مغرب، یونان و ہندوستان کے ماہر استادوں کی تمام معلومات جمع کی ہیں۔ اور اس کا نام "جواھر الاسرار" رکھا ہے۔ غرض اس فن کے طالب و شائق کو چاہیے کہ پورے غور و خوض اور سوچ بچار کے ساتھ طبیعتوں اور نتیجوں سے حکم کرے، تاکہ صحیح اور درست ثابت ہو۔

پھر زمانہ کی نیرنگی اور اتار چڑھاؤ نے جہاں ترقی اور تنزلی کیفیات پیدا کیں وہیں یہ پسندیدہ اور محبوب فن رمل، حساب ابجد اور فن تاریخ بھی طاقِ نسیان کے حوالہ ہو گیا۔ عرصہ دراز بعد اس نے پھر انگڑائی لی اور نیا روپ دھارا تو صحابہ رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے دور میں اس کے اندر بیداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ شدید احساس اور اس کی اہمیت و ضرورت کے پیش نظر مختلف نشستیں اور مجلسیں ہوئیں۔ مشورے ہوے اور بالآخر سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ کے دور خلافت میں اس کی مستقل داغ بیل پڑی اور اس فن کی اہمیت کی خاطر علوم قرآن و حدیث کے لیے تاریخ دانی کو ضروری قرار دیا گیا۔ بغیر تاریخ کے علم کے کون سی آیت کب اور کس لیے نازل ہوی اس کا صحیح علم نہ ہو سکے گا۔

تاریخ ہی ایک ایسا اہم علم ہے جس کے ذریعہ قرآنی آیات کے سیاق و سباق، ناسخ و منسوخ اور شانِ نزول کا علم ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آیاتِ قرآنی اور ان کے معانی و مطالب نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہیں۔ پھر حروف ابجد اور فن جمل و

رمل دنیائے تاریخ کے حق میں سنگِ میل اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت و مقام رکھتے ہیں۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار و انحراف نہیں ہے۔

ولو بالفرض تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ حروف ابجد اور فنِ رمل کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر دنیائے تاریخ کے بہت سارے حقائق و معلومات سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور کسی اہم اور ضروری چیز سے یا بزرگ و عظیم المرتبت شخصیت کی ذات و مرتبت سے نابلد ہونا پڑے گا۔

اس لیے ہر سورت اور ہر آیت کی سمجھ بوجھ کے لیے جہاں اور علوم کی ضرورت ہے وہیں تاریخ کا جاننا اور شانِ نزول کا پہچاننا بھی ایک امرِ لازمی ہے۔ نیز احادیث کے معانی و مطالب میں منشاءِ رسول صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تہ کو پہنچنے کے لیے بھی اسماءِ رُواۃ، طبقاتِ رُواۃ اور ان کی تاریخ پیدائش و وفات کا علم بھی از بس ضروری ہے۔ اس لیے اس فن میں بہت سی کتابیں معرضِ وجود اور منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہیں اور اگر تاریخ کا علم نہ ہوتا تو ہر شخص اپنی من مانی مزعومات پر جو چاہے اور جیسا چاہے کہتا چلا جاتا۔

غرض ان بے شمار حقائق اور دلائل اور ناقابلِ انکار شواہد کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ یہ یہود و نصاریٰ اور اسلام دشمن عناصر کی سازش و ایجاد ہے، سراسر غلط اور ناانصافی کی بات ہے۔ اس کی ایجاد و فونڈیشن تو درحقیقت حضرت آدم علیہ السلام نے رکھا ہے پھر اس شریف فن کی تجدید اور حروف ابجد کا استخراج و رواج آج سے کافی عرصہ پہلے قرونِ اُولیٰ میں پڑ چکا ہے اور اس کی اہمیت اور تاریخ میں شہادت کے متعدد نمونے اور ہزاروں نہیں لاکھوں مثالیں تاریخ عالم میں آج بھی بکھری پڑی ہیں۔

حضرت امام المحدثین سیدنا الامام ابو حنیفۃ النعمان التابعی رحمہ اللہ الباری کی تاریخِ ولادت و وفات پر حروف ابجد میں یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

ؔ

آں کہ او بود شاہِ مجتہداں — نام او بو حنیفہ نعمان

سالِ مولود آں شہِ والا — سرِ علماء است یا سرِ فقہا

عقل تاریخ او چو گو پر سفت — سالِ ترحیل او مُعلّٰی گفت

اس میں ولادت کی تاریخ ۸۰؁ھ ہجری یا ۸۰؁ھ بتلائی گئی ہے اور لفظ "مُعلّٰی" سے تاریخ وفات کا استخراج ۱۵۰؁ھ ہجری ہے۔

دربارِ قلندری کے قصر و مینار اور دربارِ ولایت کے قطب و ابدال حضرت شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات ابجدی حروف سے "شرف الدین" ہے۔ جس سے (۶۷۴) چھ سو چوہتر واں سالِ ہجری نکلتا ہے۔

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء (محبوب الٰہی) رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر آپ کے خلیفۂ خاص حضرت امیر خسرو نے جہاں بہت سے قطعات اور والہانہ اشعار اپنے پیر و مرشد کی شان و عقیدت میں پیش کئے ہیں۔ وہیں ان میں ایک رباعی بھی ہے جو آپ کے آستانہ کی پیشانی پر کندہ ہے۔ جس سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ ملاحظہ ہو: ؔ

نظامِ دو گیتی شہِ ما وطین — سراجِ دو عالم شدہ بالیقین

چو تاریخ فوتش بجستم ز غیب — ندا داد ہاتف شہنشاہِ دین!

"شہنشاہ دین" سے سات سو پچیس (۷۲۵) ہجری تاریخ وفات نکالی ہے۔

اب ایک دل چسپ اور حیرت انگیز معمہ بھی سنئے جو یقیناً اچنبھے میں ڈالنے والا اور مشکل سے حل ہونے والا ہے حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ کے دربار کے حاضر باش، عاشق زار مرید و خلیفۂ خاص حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے صنعت تلمیح میں ایک باریک رمز و اشارہ سے جو قطعہ پیش کیا ہے، یہ آج بھی اپنی جگہ نہایت ہی عجیب و غریب اور حیرت انگیز ضرور ہے۔ جس کی نظیر و تمثیل دنیائے تاریخ پیش کرنے سے یقیناً عاجز ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس وقت وہ پورا قطعہ یاد نہیں رہا۔ البتہ اس کا وہ حصہ جو موضوع بحث سے تعلق رکھتا ہے یاد ہے : ؎

مرا نام نیک است خواجہ عظیم — دو شین و دو لام و دو قاف و دو جیم

- - - - - - - - - - - - — بجستی گر دانی تو مرد فہیم

یہاں حضرت امیر خسروؒ حروف ابجد کے تتبع اور پیروی میں قطعہ کے ثانی مصرعہ میں اپنا نام بڑی رازداری اور چابکدستی کے ساتھ ظاہر فرماتے ہیں۔ اور وہ اس طرح ہے کہ حروف ابجد میں شین کے عدد تین سو ہوتے ہیں۔ اور دو شین کے چھ سو (۶۰۰) ہوئے اور چھ سو والا حرف "خاء" ہے۔ ایک لام کا عدد تیس ہے (۳۰) اور دو لام کے (۶۰) ساٹھ ہوئے اور ساٹھ والا حرف حروف ابجد میں "سین" ہے۔ ایک قاف کا عدد (۱۰۰) سو ہے۔ دو قاف کے دو سو (۲۰۰) ہوئے اور دو سو والا حرف "راء" ہے۔ ایک جیم کا عدد (۳) تین ہے۔ پھر دو تین کے چھ (۶) بنے اور چھ والا حرف حروف ابجد میں "واؤ" ہے۔ اس طرح "دو شین و دو لام و دو قاف و دو جیم" سے حضرت امیر خسروؒ نے اس معمہ اور رمز میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ شاعر کا نام "خسرو" ہے۔

یہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے اکثر و بیشتر نامور علماء و مشائخ کی پیدائش و وفات پر، نیز اکثر مساجد و مدارس کی بنیاد یا تکمیل و اختتام پر تاریخی قطعات محراب و آستانوں پر آج بھی کندہ و محفوظ ہیں۔ ہندوستان کی بدقسمتی سے بابری مسجد تو شہید ہوگئی۔ مگر تاریخ دانوں اور آثارِ قدیمہ سے تعلق و دلچسپی رکھنے والوں سے پوچھیے آج بھی ان کے دل و دماغ پر اس کے تاریخی قطعات ثبت ہیں کندہ ہیں۔

ان بے شمار حقائق اور لامحدود شواہد و دلائل کے باوجود تعجب ہے اس کو اسلام دشمن عناصرین، مغربی مصنفین و مستشرقین یا یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی سازش کا الزام دیا جا رہا ہے۔

حالاں کہ غور کیا جائے تو اکثر اکابرین اور بزرگانِ دین نے اسی ابجد کے حساب سے اپنا تاریخی نام بھی رکھا ہے اور اس کو پسند بھی فرمایا ہے۔ جس طرح شمال میں قدیم و جدید بڑے بڑے مدارس و مساجد موجود ہیں، اسی طرح جنوب میں بھی ہیں۔ اور نہ صرف ہندوستان کے پورے صوبے میں بلکہ پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ ممالک کے اکثر و بیشتر مدارس و مساجد میں حروفِ ابجد کی مدد سے نکالے گئے تاریخی قطعات آج بھی موجود ہیں۔ اگر یہ آپ کی معلومات و مزعومات کے تحت واقعی غلط ہیں تو پھر ان لوگوں نے اسے ابھی تک کیسے برداشت کر لیا؟ ام کھاڑ

کیوں نہیں پھینکا؟؟ پھینکیں کیوں کر؟ وہ تو جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ یہ فن رمل وجمل دراصل انبیاء کا علم ہے، بزرگوں اور علماء نے اس پر محنت کی ہے۔ ایسی صورت میں اس کو دھڑلے سے ناکارہ اور کفار ومشرکین کی سازش کا نتیجہ کہنا سراسر لاعلمی کا شاخسانہ نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ حقیقت ہے کہ بہت سے مشائخ اور بزرگوں نے تعویذ اور فلیتوں کے سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھی ہیں اور ان میں سلف وخلف کے حضرات نے متفقہ طور پر اپنی کتابوں میں حروف رمل وجمل اور ابجد کے حساب کا اندراج بھی ضروری جانا ہے اس فن میں ایک اور قدیم کتاب بنام "خزینۃ الاسرار جلیلۃ الاذکار" بھی ہے۔ جو استاذ السید محمد حقی النازلی رحمہ اللہ الباری کی تصنیف ہے۔ یہ عربی زبان میں ہے اور مطبوعہ سلیمان مرعی سنگاپور ہے۔
علاوہ ازیں ابھی حال کے علماءِ محققین

نے حروف ابجد کی

بعض تعویذات درج کی ہیں۔ پھر یہ بات ایسے دُوربین نکتہ رس بالغ نظر محقق کی نگاہ سے اوجھل ہو، یہ ناممکن ہے اور عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔

موجودہ دَور میں حروف ابجد اور حساب رمل وجمل کے پسندیدہ اور مستحسن ہونے پر منجملہ اور دلائل کے یہ خود بھی ایک مستقل دلیل ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مزید دلیل کی میں سمجھتا ہوں چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔

4 چوتھا اشکال بڑا پھس پھسا اور پھیکا اشکال ہے۔ اس کے لیے تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت بھی ہے نہیں۔ یہ عقائد اور نیت سے تعلق رکھتا ہے۔ حروف سے نہیں۔ اور حروف اصل کے قائم مقام اور بدل بھی نہیں ہیں۔ محض شدید ضرورت پر انھیں استعمال کریں گے۔ جب کہ بے ادبی کا احتمال ہو، ورنہ نہیں۔ پھر یہ کہنا کہ جس طرح "بسم اللہ" کے اعداد "۷۸۶" نکلتے ہیں، اسی طرح "ہرے کرشنا" کے بھی وہی اعداد نکلتے ہیں۔ بظاہر جھانسے میں لاتا ہے اور اچنبھے میں ڈالتا ہے۔ حالاں کہ اس کو حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ عدد سے کسی کو یاد کریں اور پکاریں حالاں کہ عدد کا کوئی نام نہیں ہے۔ ہاں البتہ نام کے اعداد ہوتے ہیں۔ پھر نام بھی جس طرح ہوگا اسی طرح اس کے عدد بھی بنیں گے۔ چناں چہ یہاں موضوع بحث میں ایک تو ہمارے عقائد اور مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا دوسرے مذہب سے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق ایک سنّت کو اپناتے ہوئے جہاں بے ادبی کا خوف واحتمال ہو۔ وہاں زبانی طور پر پہلے بسم اللہ پڑھ لیں پھر علامتی طور پر "۷۸۶" لکھا کریں۔ اور اس فکر و اندیشہ میں نہ پڑیں کہ اس سے دوسرے مذاہب کے اعداد بھی بنتے ہیں بنتے ہیں تو بننے دیجیے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل اعتبار تو اس کی نیت اور ادا پہ ہے۔ بفحوائے حدیث "انما الاعمال بالنیات" (اعمال کا دار ومدار نیتوں پر ہے۔) اور "جیسی کرنی ویسی بھرنی" مشہور ضرب المثل بھی ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہم اس طرح کا موازنہ اور کمپائر کرتے رہیں گے تو

ہر بات اور ہر لفظ و جملہ کا کچھ نہ کچھ حساب بنتا اور جڑتا چلا جائے گا۔ اور پورے قرآن شریف کا ایک ایک لفظ و جملہ بھی کسی نہ کسی لادینی اور غیر مذہبی لفظوں اور جملوں سے تعلق اور میل کھاتا اور ٹکراتا رہے گا۔

مثالاً عرض ہے "حسبی اللہ" کے اعداد (۱۴۶) ایک سو چھیالیس ہیں اور" جنم بھوم" کے بھی یہی عدد (۱۴۶) آتے ہیں "وبالحمد للہ" کے (۱۵۶) ایک سو چھپن عدد ہیں۔ اور "جنم بھومی" کے بھی یہی (۱۵۶) عدد ہوتے ہیں۔" والحمد للہ" کے (۱۵۴) "اور جنم بھومکے بھی (۱۵۴) عدد ہیں۔" ربّ ارحمھما کما" کے عدد (۵۵۸) ہیں تو" ایشورما" یا" ایشورام" کے بھی ٹھیک یہی عدد آتے ہیں۔ کہ" الحمد للہ رب العٰلمین" کے (۶۱۷) چھ سو سترہ عدد ہوئے۔ اور" ایشورا بھگوان ہے" اس کے بھی ٹھیک یہی عدد ہوئے۔" ربّ انا" کے اعداد (۲۵۴) ہیں۔" جے رام" اور" رام جی" کے بھی یہی عدد ہیں۔" ان ربی حقّ" کے اعداد دو سو اکاسی (۲۸۱) ہوتے ہیں اور" نمسکار" کے بھی یہی عدد آتے ہیں۔" فی جنّٰت وعیون" کے عدد چھ سو پچہتر (۶۷۵) ہیں۔" جہاں ایشور بھگوان ہے" کے بھی یہی عدد ہیں۔ قرآن شریف میں لفظ" امر" متعدد جگہ اور بار بار امر بالمعروف، من امر ربی وغیرہ الفاظ سے آیا ہے۔ اس کے اعداد دو سو اکتالیس (۲۴۱) ہیں تو" رام" کے بھی یہی عدد ہیں۔ بلکہ" امر" کے حرف کو آگے پیچھے کرنے سے "رام" ہی بنتا ہے۔

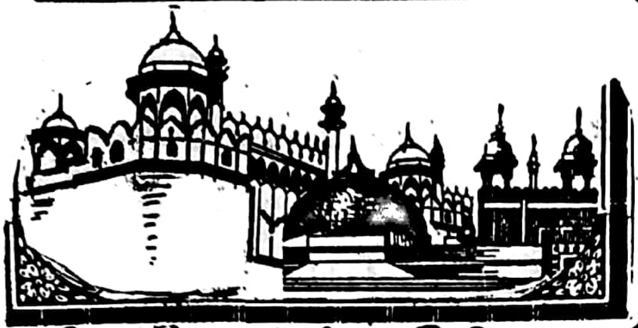
پھر کیا اس دلدل اور لاینحل مشکل میں پھنسنا اور جھمیلے میں پڑنا بھی کوئی عقل کی بات ہوئی؟ اور جب بات اس اشکال پہ پہنچ رہی ہے تو اس کا بس سیدھا سا جواب تو قرآنی الفاظ میں لکم دینکم ولی دین ہی ہے۔ هٰذا ما عندی واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

" اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ" کا بقیہ صفحہ 174 سے آگے۔

لیکن عدل کا فائدہ عادل کی ذات کے علاوہ دیگر انسانوں کو بھی ہوگا۔ اس لیے حدیث میں عدل پر کثرتِ ثواب واجر کی خبر دی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو حاکم ہے وہ لوگوں پر نگہبان ہے اور اس رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا اور کوئی شخص بڑے عہدے پر ہے اور اس کے ماتحت کئی لوگ کام کرتے ہوں تو وہ ان لوگوں کا حاکم ہوا اور وہ لوگ اس کی رعیت ہیں اور اسی طرح ایک گھر میں باپ حاکم ہے اور اس کے بیوی بچے سب اس کی رعیت ہیں۔ اس طرح اُن اُن کے ماتحت لوگوں سے متعلق سوالات کئے جائیں گے۔ وکلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

حاصلِ کلام! عدل ہی سے دُنیا میں چین و امن قائم رہتا ہے۔ جس کے بغیر زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس لیے اسلام نے عدل کو غیر معمولی اہمیت دی تاکہ دُنیا میں امن قائم رہ سکے



سلفِ صالحین کی زندگی کی ایک جھلک

مولوی عبد السبحان لطیفی وگروری ضلع کرنول ۔ مدرس دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطبؒ ویلور

موجودہ دور میں جو زندگی چلتی پھرتی نظر آرہی ہے یہ اس زندگی سے مختلف ہے جو سلف صالحین کی زندگی تھی۔ اس لیے چند نمونے اور چند مثالیں اس زندگی کی یہاں پیش کی جارہی ہیں جو آج تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

مقام تقویٰ کب حاصل ہوتا ہے:
عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے تم میں سے کوئی بھی تقویٰ کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کا قول و فعل ایسا ہو جس سے دنیا و آخرت میں فضیحت نہ ہو۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا کہ انسان تقویٰ کی بلندی پر کب پہنچ سکتا ہے؟ فرمایا: جب وہ اپنے تمام دلی خیالات کو طبق میں رکھ کر بازار میں چکّر لگائے اور ان سے شرمندہ نہ ہو۔

وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایمان ننگا ہے اور اس کا لباس تقویٰ ہے۔

حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہٗ فرماتے تھے۔ کہ جو عمل تقویٰ کے ساتھ ہو وہ کم نہیں ہوتا کیوں کہ وہی مقبول ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۝

متقی کی علامت

عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تقویٰ یہ نہیں کہ دن بھر وہ روزہ رکھے اور رات کو قیام کرے اور اس کے ساتھ نیک و بد اعمال کو خلط ملط کرے بلکہ تقویٰ یہ ہے کہ محرماتِ الٰہی کو چھوڑ دے اور فرائض ادا کرے۔ پھر جو اس سے بڑھ کر کرے وہ تو خیر الی خیر ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے: متقی کی علامت یہ ہے کہ وہ کلام کرنے سے لگام دیا گیا ہو۔ جیسے احرام کی حالت میں محروم ہوتا ہے۔ اور متقی کو تمام شریعت کا عالم ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ وہ اپنی جہالت کے باعث تقویٰ کی حدود سے باہر نکل جائے گا اور اُسے خبر تک نہ ہوگی۔

ابو الدردا رضی اللہ عنہٗ فرماتے تھے تقوے کا کمال یہ ہے کہ بندہ رائی برابر عمل میں بھی اپنے رب سے ڈرے۔

تقویٰ ایک خاردار راستہ ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے تقویٰ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: یہ ایک خاردار راستہ ہے اور اس میں چلنے والے کو شدید صبر کی ضرورت ہے۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے ہم نے ایسے آدمی دیکھے ہیں کہ جنھیں اگر کوئی کہتا اللہ سے ڈرو تو وہ اس

سے محبت کرتے برخلاف آج کل کے لوگوں کے ایسے باتوں سے آزردہ خاطر ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک شخص نے عمر بن عبدالعزیزؒ سے کہا کہ اے عمر! اللہ تعالےٰ سے ڈرو تو آپ اللہ تعالےٰ کی ہیبت سے غش کھا کر گر پڑے۔

فضیل بن عیاضؒ سے ایک آدمی نے عرض کیا کہ آپ میرے لیے کون سا شہر پسند کرتے ہیں کہ میں اس میں قیام کروں۔ آپ نے فرمایا: کسی شہر میں اور تجھ میں کوئی رشتہ داری نہیں۔ لیکن تیرے لیے وہ شہر اچھا ہے جہاں تجھے تقوی کی ترغیب ہو۔

سفیان ثوری علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ اگر ہم سے کوئی متقی ہو تو اس کی زندگی خوش گوار نہ ہو اور اسے نیند نہ آئے۔

حقیقی ورع سلف صالحین رضی اللہ عنہم اپنے مسلمان بھائیوں کے عیوب بالکل پوشیدہ رکھتے اور ورع کے بارے میں اپنے نفوس کی خوب چھان بین کرتے۔ پس وہ کسی کا عیب ظاہر کرنا پسند نہ کرتے اور اپنے اقوال و افعال اور کھانے پینے کا محاسبہ کرتے رہتے اور اپنے تمام اعضاء کے متعلق محرّمات میں واقع ہونے کی جستجو کرتے خصوصًا زبان، شکم، فرج اور آنکھ کے بارے میں۔

حدیثِ شریف میں آیا ہے کہ جس چیز سے اللہ تعالےٰ نے منع کیا ہے اس سے رُکنے والا تمام لوگوں سے زیادہ پرہیزگار ہوگا۔ ابنِ عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ فرماتے تھے: اگر تم روزے رکھو یہاں تک کہ سوکھ کر تار بن جاؤ اور اتنی نمازیں پڑھو کہ سوکھ کر تنکا ہو جاؤ تو تمہیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا جب تک کہ تمہارے پاس خالص ورع نہ ہوگا۔

ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ فرماتے تھے قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کے جلیس اہلِ ورع ہوں گے۔

ورع کے بغیر فقہ بے فائدہ ہے فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ فقہ کام کا نہیں جس میں ورع نہ ہو۔ جیسے وہ نماز جس میں خشوع نہ ہو اور وہ مال کچھ نہیں جس میں سخاوت نہ ہو۔

یونس بن عبید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حقیقی ورع شبہات سے نکلنے اور ہر ہر قدم پر اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کا نام ہے۔ جو شخص یہ نہیں کرتا وہ ورع متورّع نہیں۔

ابو عبداللہ انطاکی علیہ الرحمہ فرماتے تھے گناہ صغیرہ کو حقیر نہ جانو کیوں کہ گناہ کو حقیر جاننا ورع کی ترک کرنے کی سیڑھی ہے۔

ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جس نے علم کو بغیر عمل کے طلب کیا اس کا پیشوا ابلیس ہے اور جو سیاست کا طالب ہوا اس کا رہبر فرعون ہے اور جس نے تلاش کیا اس کے امام انبیاء علیہ الصلوۃ السلام اور اصفیاء رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو ورع سیکھا کرتے تھے اور اس کے سیکھنے میں تین تین مہینے یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک سفر اختیار کرتے تھے لیکن آج کل کوئی اس کو طلب نہیں کرتا۔ اگر یہ بتلا بھی دیا جائے تو اس پر

یہی کامل تواضع ہے۔

ہمیں خبر ملی ہے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے کہ عالم سب سے بڑھ کر لوگوں کی خدمت کرنے کا مستحق ہے۔
مالک بن دینار علیہ الرحمہ فرماتے تھے اگر منادی کرنے والا مسجد کے دروازے پہ ندا کرے کہ سب سے بُرا باہر نکل آئے تو دروازے کے پاس مجھ سے پہلے کوئی نہ آئے گا۔ مگر وہ جو مجھ سے طاقت میں بڑھ کر ہو۔
حاتم الاصم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالےٰ متکبّر کو دُنیا سے نہیں نکالتا جب تک کہ ادنیٰ خدمت گاروں اور ہمسایوں سے اس کو ذلّت نہ دکھائے۔ اور موت سے پہلے وہ اپنے بول و براز سے آلودہ نہ ہو۔

رابعہؒ عدویہ کا قول رابعہ عدویہ رحمہا اللہ تعالےٰ فرماتی تھیں ہماری استغفار بھی استغفار کی محتاج ہے۔ یعنی اس لیے کہ اس میں صدق نہیں ہوتا۔

خالد بن سعدان رحمۃ اللہ تعالےٰ فرماتے تھے تائب جہنم پر سے گزریں گے مگر اُسے دیکھیں گے نہیں تو عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار کیا تو نے ہم سے آگ پر سے گزرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ جواب ملے گا: تم اس پر سے گزر رہے تھے اور وہ بجھی ہوئی تھی کیوں کہ تم تائب تھے۔ اور گناہوں پہ اصرار کے بغیر جوش میں نہیں آتی۔ اہلِ سنّت کا اجماع ہے کہ قتل اور غصب اور شراب خوری وغیرہ تمام گناہ، توبہ سے معاف ہو سکتے ہیں۔

کہتے ہیں مسروق رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا، کیا مومن کے قاتل کے لیے توبہ ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: جو دروازہ اللہ تعالےٰ نے کھولا ہے میں اُسے بند نہیں کر سکتا۔

ابوالجو نزاد علیہ الرحمہ فرماتے تھے۔ کہ آدمی گناہ کر کے ہمیشہ نادم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جنّت میں داخل ہوتا ہے۔ اُس وقت شیطان کہتا ہے کاش! میں اس سے گناہ نہ کراتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کا قول حضرت امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ فرماتے تھے: تم میں سے اچھے تمام گنہ گار تائب ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھتے تھے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ اللہ تائبوں کو دوست رکھتا ہے۔

ربیع بن خثیم علیہ الرحمہ فرماتے تھے: تم میں سے کوئی استغفر اللہ تعالےٰ واتوب الیہ نہ کہے کیوں کہ اگر اس نے توبہ نہ کی تو یہ کہنا جھوٹ اور گناہ ہوگا۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ: اے اللہ! مجھے معاف کر اور مجھے توبہ کی توفیق دے۔

کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ استغفر اللہ کے الفاظ حدیث میں آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ صادقوں کے حق میں ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہٗ فرماتے تھے مجھے نہ قرآن مجید اور نہ سنّت سے یہ معلوم ہوتا ہے اور نہ کسی اور ذریعہ سے

عمل نہیں کرتے۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

محمد بن سیرین علیہ الرحمہ جب کسی چیز کو مشتبہ دیکھتے تو اُسے بالکل ترک کر دیتے۔ اگرچہ سارا بیت المال ہی ہو۔

امیر المؤمنین حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہٗ فرماتے تھے کہ ہم حلال کے نو حصّے چھوڑتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں حرام میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اسلاف کی عادت تھی کہ اگر کسی جگہ اُن کا دینار گر پڑے اور اس کی تلاش میں وہاں جائیں اور دو دینار کو گرا پڑا دیکھیں تو اُسے نہ اٹھاتے اور خیال کرتے کہ ممکن ہے کسی اور کا گرا ہو اور میرا کسی نے اٹھا لیا ہو۔

محمد بن سیرین علیہ الرحمہ سے پوچھا گیا غنیمت میں کستوری کو کرتے وقت ناک کو بند کرنے والا کیسا ہے؟ اور کیا اس میں کوئی ڈر ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ یہی سوال قاسم بن محمدؒ سے ہوا۔ آپ نے فرمایا وہ شخص ظاہری طور پر ورع کرنے والے کے مانند ہے۔ میں اس کو ادب کے باعث ورع نہیں کہتا۔

عمر بن عبدالعزیز کا ورع ریاح القیس رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا کہ عمر بن عبدالعزیز کے ورع کے متعلق جو آپ نے دیکھا ہے سنائیں: آپ نے فرمایا: عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شام ہمیں کھانے پہ بلایا۔ ہم کھا رہے تھے تو فرمایا: ٹھہر جاؤ۔ اس چراغ کا تیل عوام کا تیل ہے۔ جس میں ان کے حساب و کتاب کے کاغذات دیکھتا ہوں۔ یونس بن عبید علیہ الرحمہ کسی تعجب انگیز چیز کو دیکھ کر اللہ تعالٰے کے جلال کے خیال سے سبحان اللہ کہتے۔

عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمہ کا بیٹا اگر مال غنیمت سے ایک سیب منہ میں ڈال لیتا تو وہ سختی سے نکال دیتے اور فرماتے میں اس کو خوفِ الٰہی کے باعث نکالتا ہوں گویا کہ میں اس کو اپنے دل سے نکالتا ہوں۔

امام ابوحنیفہ کا ورع امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا کہ آپ اپنے ایک مقروض سے مطالبہ کے لیے گئے۔ اس آدمی کے گھر کے دروازے پر ایک درخت تھا۔ امام نے دھوپ میں کھڑے ہو کر مطالبہ کیا۔ کسی نے کہا آپ درخت کے سایہ میں کیوں نہیں کھڑے ہوتے؟ آپ نے فرمایا: نہیں میرا اس کے مالک پر قرض ہے اور جو فائدہ بھی قرض سے حاصل کیا جائے وہ سود ہے۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں منقول ہے۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جب پھیری والوں سے کوئی چیز خریدتے تو چلنے والوں کی دقت کے خیال سے راستہ سے ایک طرف ہو جاتے اور اس سے سودا خریدتے۔

تواضع سلف صالحین کے اخلاق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جوں جوں مقامات ترقی کرتے تواضع میں بڑھ جاتے برخلاف اس شخص کے جو چراغ کے قریب ہوتا ہے کہ جتنا وہ اس کے قریب ہوتا ہے اتنا ہی اپنے کو بڑا دیکھتا ہے۔ مگر یہ لوگ جوں جوں بارگاہِ الٰہی میں قرب حاصل کرتے ہیں اتنا ہی اللہ تعالٰے کی عظمت دیکھ کر اپنے آپ کو مچھر سے بھی حقیر خیال کرتے ہیں۔ اسی لیے جب شیطان نے تکبّر کیا اور کہا اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ تو دربارِ الٰہی سے راندہ گیا۔

متکبّر صوفی اللہ کا دشمن ہے پس اے دوست اس میں غور کر اور جس صوفی کو متکبّر دیکھے اس سے دُور بھاگ

کیونکہ وہ اللہ کا دشمن ہے ۔جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ نے فرمایا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی : اے موسیٰ ! مخلوق میں سے میرے نزدیک سب سے بُرا وہ شخص ہے جس کا دل متکبّر، زبان ترش ، ہاتھ بخیل اور خُلق بُرا۔ ابو مسلم خولانی علیہ الرحمہ فرماتے تھے ۔کہ تکبّر کمینہ شخص ہی کرتا ہے اور فخر رذیل ہی سے واقع ہوتا ہے ۔اور باطل امور پر کوئی ناقص الاصل ہی تعصب کرتا ہے۔

ابو سلیمان درانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے اگر تمام مخلوق اس پر جمع ہو جائے کہ مجھ سے اپنے آپ کو حقیر سمجھنا چھڑا دیں تو بھی وہ ایسا نہ کر سکیں گے ۔

ابو ایوب سختیانی علیہ الرحمہ فرماتے تھے : ایک قوم نے عزّت طلب کی تو اللہ نے انھیں ذلیل کر دیا اور ایک قوم نے تواضع اختیار کی تو اللہ تعالےٰ نے انھیں عزّت بخشی ۔ کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری علیہ الرحمہ جب رملہ میں آئے تو ابراھیم بن ادھمؒ نے انھیں پیغام بھیجا کہ ہمارے ہاں آؤ اور ہمیں حدیث سناؤ۔ آپ نے فرمایا : میں تمہیں اس کی شدّتِ تواضع دکھلانا چاہتا ہوں۔ پھر سفیان ثوری آئے اور ان کو حدیث سُنائی ۔

سلیمان خواص رحمۃ اللہ علیہ سخاوت اور حسنِ خلق میں ابراھیم خلیل علیہ السلام سے مشابہ تھے ۔

تواضع ایک عظیم نعمت

عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ تم تواضع کو لازم جانو کیوں کہ یہ ایک عظیم نعمت ہے اور اس پر کوئی حسد نہیں کرے گا ۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : جو شخص ناحق تکبّر کرے وہ قرآن مجید کے فہم سے محروم ہو جاتا ہے اور جو شخص ناحق عزّت حاصل کرے ، اُسے لازمی طور پر ذلّت نصیب ہوگی ۔

سفیان ثوری علیہ الرحمہ فرماتے تھے زاہد بلا تواضع ایسا ہے جیسے بغیر پھل کے درخت ۔جو شخص اپنے آپ میں تواضع نہ کرے ، وہ دوسروں کے نزدیک معزز نہیں ہوتا ۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے دسترخوان سے جذامی ، ابرص وغیرہ مریضوں کو نہ ہٹاتے بلکہ اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور فرماتے اصل تواضع یہ ہے کہ حقیروں کے پاس بیٹھیں ۔مگر یہ کام کسی حظِّ نفسانی کے لیے نہ ہو ۔بعض لوگ جوتیوں کے پاس بیٹھتے ہیں اور ان کے دل میں اتنا تکبّر ہوتا ہے جیسے خدا جانتا ہے اور اس جگہ بیٹھنے پر اُن کو صرف یہ بات ترغیب دیتی ہے کہ لوگ انھیں متواضع کہیں گے اور فرمائے : تیرے متواضع ہونے کی علامت یہ ہے کہ تو لوگوں میں اپنے متعلق نیکی اور تقویٰ کے ذکر کو بُرا سمجھے ۔

کامل تواضع کیا ہے ؟

ابن سماک رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ فرماتے تھے : سب سے بڑھ کر تواضع یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی سے افضل خیال نہ کرو اور جسے دیکھو اُسے اپنے سے افضل سمجھو ۔ بس تو اپنے ہر ایک ہم عصر کو افضل خیال کر اور اللہ تعالےٰ کی رحمت کا امیدوار ہو اور اس سے قبولِ دُعا کی التجا کر اور یقین رکھ کہ اللہ تعالےٰ اُس کے توسل سے تیری مصیبت دُور کر دے گا ۔

میرے علم میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کہا ہو' میں گناہ کو معاف نہیں کروں گا (میں کہتا ہوں) شاید ان کی مراد خاص الفاظ ہی ہوں۔ ورنہ قرآن مجید میں ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ اللہ تعالےٰ شرک معاف نہیں کرے گا۔ لہٰذا ان کے کلام کو اہلِ اسلام کے گناہوں پر محمول کیا جائے۔ جیسا کہ علماء نے آیت اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا: اللہ تعالےٰ تمام گناہوں کو معاف کردے گا۔) کو اہلِ اسلام کے گناہوں پر محمول کیا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی ندامت ثابت البنانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت داؤد علیہ الصلوۃ والسلام گناہ کے بعد کبھی کوئی پینے کی شئے آنسوؤں کی آمیزش کے بغیر نہیں پیتے تھے۔

مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے میں اپنے ایک ہمسایہ کے پاس گیا وہ بیمار تھا اور گناہ گار تھا۔ میں نے کہا: اے دوست تو اللہ تعالےٰ سے توبہ کا عہد کر شاید تجھے شفاء حاصل ہو۔ اس پر وہ رو پڑے۔ میں نے گھر کے ایک کونے سے ہاتف کو یہ کہتے سنا کہ اگر اس کا عہد تیرے عہد جیسا ہے تو اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں کہ تو نے کئی بار ہم سے عہد کیا لیکن ہم نے تجھے کاذب ہی دیکھا۔ راوی کہتا ہے کہ اُس وقت مالکؒ پر غشی طاری ہوگئی۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالےٰ نے ہماری قوت سے بڑھ کر کھانے کو دیا ہے اور ہماری قوت سے کم تکلیف دی ہے۔ لیکن ہم اپنی قوت پر کم کفایت نہیں کرتے اور جو تکلیف دی ہے اس میں اپنی قوت خرچ نہیں کرتے

مجاہد علیہ الرحمہ فرماتے تھے: جو شخص ہر روز صبح وشام توبہ نہ کرے وہ ظالم ہے۔

حسن بصری علیہ الرحمہ سے کہا گیا: آپ اس شخص کی نسبت کیا کہتے ہو جو توبہ کرے توڑ دے پھر کرے اور توڑدے اور اسی طرح کرتا رہے۔ آپؒ نے فرمایا: میں اسے مومن ہی خیال کروں گا۔ کیوں کہ یہ فعل مومن ہی کا ہے۔

یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے توبہ کے بعد ایک گناہ بھی قبل از توبہ ستر گناہوں سے بُرا ہے۔

تائب کون ہے؟ یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمہ سے دریافت کیا گیا، تائب کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو شخص جوانی میں توبہ کرے اور پھر اس سے رکا رہے یہاں تک کہ اُسے موت آجائے، بوڑھوں کی توبہ توبہ نہیں ہے کیوں کہ ان کی شہوانی آگ گناہوں سے ٹھنڈی ہو چکی ہوتی ہے مگر اللہ تعالےٰ نے توبہ قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ کرے۔

سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ کہ آیت فَاِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا: اللہ تعالےٰ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کردیتا ہے۔ اس شخص کے حق میں نازل ہوی ہے جس نے گناہ کیا اور پھر توبہ کیا اور پھر گناہ کیا اور توبہ کی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے۔ جس شخص سے کوئی گناہ واقع ہوا ہو پھر اس کے یاد آنے پر اپنے دل میں ڈرے تو اس کا گناہ ام الکتاب سے مٹا دیا جائے گا۔

مروی ہے کہ حضرت یونس علیہ الصلوۃ والسلام کی قوم نے جب عذاب دیکھا تو ان میں سے ایک آدمی کھڑا ہوگیا۔

(بقیہ صفحہ 169 پر ملاحظہ ہو)

اُمّ المؤمنین

عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

کاتب محمّد شریف برکاتی۔ آمبور

نام ونسب نام گرامی عائشہ : کنیت اُمّ عبداللہ : خطاب حمیرا، عویش : لقب اُمّ المؤمنین

باپ کی طرف سے : عائشہ بنتِ حضرت ابوبکر صدیق ابنِ ابی قحافہ ابنِ عامر ابن عمرو کعب ابنِ سعد ابنِ تمیم ابنِ مرہ ابنِ کعب ابنِ لوی

ماں کی طرف سے : عائشہ بنتِ اُمّ رومان بنتِ عامر ابنِ عویر ابنِ عبد الشمس ابنِ عتاب ابنِ اذ ینۃ ابن ستیع ابنِ دھمان ابنِ الحارث ابنِ غنم ابن مالک ابن کنانہ

آپ پدری اور مادری نسب سے قریشیہ ہیں۔ ہجرتِ نبویؐ سے آٹھ یا نو سال پہلے آپ کی ولادت ۶۱۴ء یا ۶۱۵ء میں مکّہ کے محلۂ مسفلہ یا منقلہ میں ہوئی۔ عرب کے رواج کے مطابق دودھ پلانے کے لیے ابوقعیس کی بیوی کا انتخاب ہوا۔ ماں باپ ناز برداری کرتے تھے۔ بچپن ہی سے عظمت اور شان کے آثار نمایاں تھے۔ اپنی ہم جولیوں میں قد و قامت، عقل و دانائی، صورت اور سیرت میں ہمیشہ ممتاز رہیں۔ گڑیاں کھیلنا اور جھولا جھولنا آپ کا شوق تھا۔ آپ کے پاس اتنی گڑیاں جمع تھیں کہ محلّہ کی کسی بھی لڑکی کے پاس اتنی گڑیاں نہ تھیں۔

سعادتِ حرمِ نبویؐ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اکثر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لاتے تھے۔ اور بی بی عائشہ اور محلہ کی دوسری لڑکیاں گڑیوں کے کھیل میں مشغول دیکھتے۔ بی بی عائشہ چھ یا سات سال کی ہوئیں تو حضور اکرم کی زوجۂ محترمہ اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ دنیا سے پردہ فرما چکی تھیں اور آپ ہمیشہ انھیں یاد کرتے، ان کی دلگیری، دلداری، رفاقت اور خدمت گزاری کو یاد کرکے دلگیر ہوجاتے تھے۔ ایک دن کفارانِ مکّہ نے آپ کو غیر معمولی تکالیف پہنچائیں آپ گھر تشریف لائے گھر خالی تھا بی بی خدیجہ کی غم خواری و غم گساری یاد آئی، رات بھر بے قرار رہے اور افسردگی چھائی رہی۔ صبح میں مشہور صحابی عثمان بن مظعون کی بیوی حضرت خولہؓ تشریف لائیں آپ کی حالت دیکھ کر متاثر ہوئیں اور فرمایا ؛ یارسول اللہ! آپ دوسرا نکاح کیوں نہیں کرلیتے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا؛ خولہ! خدیجہ سی نیک نہاد، وفادار، غم گسار، سچّی ہمدرد اور خدمت گزار مجھے نہیں مل سکتیں۔ خولہ نے جواب میں کہا : حضور! ابھی مکّہ میں ایسی لڑکیاں اور

عورتیں ہیں جن میں مذکورہ اوصاف ہیں اور کہا: حضرت صدیق کی بیٹی عائشہ اور دوسری سودہ ہیں۔ پہلی باکرہ اور دوسری بیوہ ہیں پہلے تو حضور خاموش رہے پھر فرمایا کہ دونوں گھروں میں پیغام لے جائیں۔

بی بی خولہ خوشی خوشی پہلے حضرت ابوبکر صدیق کے گھر گئیں۔ وہاں عائشہ کی والدہ امّ رومان تھیں اور صدیق اکبر باہر گئے ہوئے تھے۔ خولہ نے امّ رومان کو حضور اکرم کا پیغام دیا۔ انھوں نے کہا: کچھ دیر رُک جاؤ جب صدیقِ اکبر آجائیں تو اُن سے ذکر کرکے تم کو جواب دوں گی۔ جب صدیق اکبر آئے تو اُن سے ذکر کیا اور آپ نے فرمایا حضور تو میرے بھائی ہیں اِس لحاظ سے وہ عائشہ کے چچا ہیں۔ بھلا بھتیجی اور چچا میں کیسے رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ جب یہ بات حضور تک پہنچی تو حضور نے فرمایا: وہ میرے منہ بولے اور دینی بھائی ہیں دودھ شریک یا عائشہ کے حقیقی چچا ہمارے مذہب میں یہ رشتہ جائز ہے۔ حضرت صدیق نے یہ سُنا اور پھر آپ نے جواب میں کہا: مطعم بن عدی سے وعدہ کر چکا ہوں کہ عائشہ کو اُن کے بیٹے جبیر کے نکاح میں دوں۔ اتنی مہلت دیجیے کہ اُن کو جواب دے دوں۔ ارشاد ہوا بہتر ہے۔

حضرت صدیق نے مطعم بن عدی بن نوفل سے حضور کے رشتہ کے پیغام کا ذکر کیا تو انھوں نے سچّی خوشی سے اس رشتہ پر اپنی منظوری دے دی کہ عائشہ کا نکاح حضور سے کردیں۔ (طبقاتِ ابنِ سعد)

بی بی خولہ نے یہ خبر سنائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت صدیق کے گھر تشریف لے گئے اور نکاح ہوگیا۔ آپ اس وقت پچاس برس کے قریب تھے اور بی بی عائشہ چھ یا سات برس کی تھیں۔ یہ نکاح ہجرت سے تین برس پہلے مکہ میں ہوا۔

مہر ابو سلمہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ سے دریافت کرنے پر بتایا کہ ازواج مطہرات کا مہر بارہ اوقیہ اور نش، (اوقیہ: چالیس درہم) اس حساب سے پانچ سو درہم مہر مقرر ہوا۔

ہجرت : جب ہجرت کا حکم ہوا تو آپ کے ساتھ صدیق اکبر بھی ہم رکاب تھے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد آپ نے ابورافع اور زید بن حارثہ کو دو اونٹنیاں اور پانچ سو درہم کے ساتھ مکہ بھیجا تاکہ اہلِ رسول کو مدینہ لے آئیں اور صدیق اکبر نے عبداللہ بن ارقیط الدیلی کو تین اونٹنیوں کے ساتھ روانہ کیا اور اپنے بیٹے عبداللہ کو لکھ دیا کہ وہ اہل وعیال کو لے کر مکہ سے مدینہ آجائیں۔ حضرت عائشہ کے ساتھ ان کی والدہ اور بہن اسماء (والدۂ عبداللہ ابن زبیر) طلحہ بن عبداللہ بھی ہجرت کرکے مدینہ آگئے۔ مدینہ میں حارث بن خزاج کے مکان میں فروکش ہوے۔ یہاں بی بی عائشہ کو بخار آنے لگا جس کی وجہ سے آپ کے سر کے بال جھڑ گئے۔

رخصتی . بی بی عائشہ نو برس کی تھیں اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ گڑیاں کھیل رہی تھیں تو ماں نے انھیں بلایا وہ آئیں تو انھیں اُن انصار عورتوں کے حوالہ کردیا۔ انصار عورتوں نے بناؤ سنگھار کرکے تیار رکھا۔ دوپہر کو حضور تشریف لے آئے اور مہر ادا کرکے بی بی عائشہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور مسجد نبوی سے متصل اُسی حجرہ میں رہنے لگیں جہاں سرکار مدینہ نے وفات پائی اور مدفن مبارک ہے۔

ولیمہ حضرت ابوبکر صدیق نے بڑی سادگی سے دلہن بیٹی کو رخصت کیا۔ دلہن کے ساتھ بی بی اسماء اور چند عورتیں آئیں۔ تو گھر میں کچھ کھجوریں اور دودھ کا صرف ایک پیالہ تھا۔ آپ نے فرمایا: کہ جو کچھ ہے کھاؤ پیو۔ حاضرین نے جواب دیا ہم روزے سے ہیں اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: بھوک اور جھوٹ ایک پیٹ میں جمع نہیں ہو سکتے۔ تب حاضرین نے کھجوریں کھائیں اور دودھ پیا۔ یہ تھا سرکار دوجہاں کا ولیمہ۔

بی بی عائشہ جب بیاہ کر آئیں تو اُن کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ ذمہ داری، خاوند کی خدمت گزاری، شرعی حقوق کی بجا آوری آداب رسالت اپنی استطاعت کے مطابق بجالانے کا دور شروع ہوا۔ کم سنی کے باعث سرکار دو جہاں بھی آپ کی دلداری اور دلدہی فرماتے۔ بہت الفت اور محبت فرماتے۔ یہاں آکر بھی آپ اپنے ساتھ لائی ہوئی گڑیوں سے دل بہلا لیتی تھیں۔

حضور صلعم کے پڑوسی بہت اچھا کھانا بناتے تھے حضور کو کھانے پر بلاتے تو آپ پوچھتے صرف مجھے ہی یا عائشہ کو بھی انھوں صرف آپ کو ہی تو آپ نے نا منظور فرمادیا۔ دوسری دفعہ بھی یہی بات ہوئی تو آپ نے پھر نامنظور فرمادیا تیسری بار جب انھوں نے عائشہ کو بھی دعوت دی تو آپ نے منظور فرمایا۔ اسی طرح ایک دن مسجد نبوی میں حبشی چھوٹے چھوٹے خنجروں سے ٹیا کھیل رہے تھے۔ آپ حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے اور بی عائشہ حضور کی آڑ میں کھڑے ہو کر کان اور کندھوں کے درمیان سے یہ کھیل تھکنے تک دیکھتی رہیں۔

حضور اکرم عدل و انصاف کی بے مثال تفسیر تھے۔ باوجود بی عائشہ سے بے حد محبت کے آپ اپنی دوسری ازواجِ مطہرات کی باری میں بلاناغہ حاضر ہوتے۔ کبر سنی کی وجہ سے اپنی باری کا دن حضرت سودہؓ نے حضرت عائشہ کو دے دیا تھا۔ جب حضور کی وفات کا دن قریب آیا تو تمام ازواجِ مطہرات کی رضا و رغبت سے آپؐ کو حجرۂ عائشہ میں رہنے دیا۔

نزولِ آیتِ تیمم حضور جب سفر پر جاتے تو ازواجِ مطہرات میں سے کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ طریقہ یہ تھا کہ قرعہ ڈالا جاتا جن کا نام آتا انھیں ساتھ لے جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک سفر میں حضرت عائشہ ہم سفر تھیں۔ قافلہ ذات الجیش میں پہنچا تو آپ کے گلے کا ہار ٹوٹ کر گر پڑا۔ حضورؐ کو اطلاع ہوئی آپ نے قافلہ کو روک دیا۔ صحابہ کو ہار کی تلاش کے لیے بھیجا۔ صبح ہونے کے قریب تھی، نمازِ فجر کا وقت آگیا۔ لوگ گھبر گئے۔ حضرت صدیق اکبر آپؓ کے پاس آئے۔ دیکھا کہ سرکار مدینہ آپ کی ران پر سر رکھے استراحت فرما ہیں۔ بیٹی سے فرمایا: عائشہ تم روز نئی آفت لاتی ہو، غصہ سے بیٹی کے پہلو میں کوچے دیے۔ آپ نے ان کوچوں کو برداشت کر لیا تاکہ حضور کے آرام میں خلل نہ ہو۔ پانی نہ ہونے کی وجہ سب پریشان تھے حضور بیدار ہوئے۔ واقعہ معلوم ہوا پانی کی فراہمی نہیں ہو سکتی تھی اس موقعہ پر قرآنِ مجید کی آیاتِ مبارکہ نازل ہوئیں:

ترجمہ: "اگر تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو یا حاجتِ ضروریہ سے فارغ ہوئے ہو یا عورتوں سے مقاربت کی ہو اور تم پانی نہیں پاتے تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اس سے کچھ منہ اور ہاتھ پر پھیر لو اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔"

اس آیت کے نزول نے مسلمانوں کو مسرت سے دوچار کر دیا۔ اور اپنی ماں کو دعائیں دینے لگے۔ ایک صحابی اُسید بن حُضیر نے کہا "اے خانوادۂ صدیق! اسلام میں یہ تیری پہلی برکت نہیں۔" صدیق اکبر نے فرمایا: "اے جان پدر! مجھے معلوم نہ تھا کہ تو اس قدر مبارک ہے۔ تیرے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کتنی آسانی بخشی۔" قافلہ کی روانگی کے لیے اونٹ کو اٹھایا گیا تو اونٹ کے نیچے ہار پڑا ملا۔

آیتِ تحریم ازواجِ مطہرات کی دو ٹولیاں تھیں۔ ایک طرف حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت سودہ، اور حضرت صفیہ تھیں اور دوسری ٹولی میں حضرت زینب اور دوسری ازواج۔ حضور اکرم کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر تک تمام ازواجِ مطہرات کے ہاں بیٹھا کرتے تھے۔ حضرت زینب کے ہاں کچھ زیادہ ٹھہر جاتے تھے۔ کیونکہ بی بی زینب کے ہاں اُن کے کسی عزیز نے شہد بھیجا تھا اور بی بی خدمتِ عالی میں شہد پیش فرماتیں تھیں۔ حضور کو شہد بہت مرغوب تھا۔ آپؐ اخلاقاً انکار نہ

فرماتے۔ اسی وجہ سے معمول میں فرق آگیا تھا۔ حضرت عائشہؓ، سودہ اور حفصہ نے مشورہ فرمایا۔ سب نے ایک رائے ہو کر حضور کی تشریف آوری کے بعد ہر ایک نے آپؐ سے پوچھا: آپ کے منہ سے یہ کیسی بُو آرہی ہے۔ آپ نے فرمایا: شہد پی کر آرہا ہوں۔ تو کہا: شاید یہ مغافیر ہو! (عرب میں ایک قسم کا پھول ہے۔ مکھی ان پھولوں سے رس چوسے تو اس شہد میں اسی پھول کی مٹھاس اور بو ہوتی ہے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا اور آپ کو شہد سے کراہت پیدا ہو گئی اور عہد کیا کہ اب شہد نہ کھاؤں گا۔ اللہ رب العزت نے اس پر یہ آیاتِ تحریم نازل فرمائیں۔

ترجمہ: ”اے پیغمبر! اللہ نے تیرے لیے جو حلال کیا ہے، اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لیے اس کو اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے۔ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور اس نے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔ اللہ تمہارا آقا ہے وہ علم و حکمت والا ہے۔“ (سورۃ تحریم)

اور اسی سورت میں اللہ تعالٰی نے ایک اور بات پر بھی تنبیہہ فرمائی ہے:

واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہ سے کہی اور حضرت حفصہ نے یہ بات حضرت عائشہ کو بتلا دی تھی اس پر یہ آیت نازل فرمایا۔ ترجمہ: ”اے پیغمبر! (آپ نے) اپنی کسی بیوی سے راز کی بات کہہ دی۔ جب اس (بیوی) نے دوسری سے اُسے کہہ دیا اور اللہ نے پیغمبر پر اس واقعہ کو ظاہر کر دیا۔ تو پیغمبر نے اس بیوی کو اس کا قصور کچھ بتایا اور کچھ نہیں بتایا۔ اس (بیوی) نے کہا: آپ سے کس نے کہہ دیا! پیغمبر نے جواب دیا مجھ کو باخبر دانا نے بتایا۔ اگر تم دونوں اللہ کی بارگاہ میں رجوع کرو (تو تمہارے لیے کوئی ایسی بات مشکل نہیں ہے) اللہ پیغمبر کا آقا ہے اور جبرئیل ہو منین صالحین اور فرشتے اس کے مددگار ہیں (تحریم)

واقعہ ایلا ازواجِ مطہرات میں سے کوئی بی بی ایسی نہ تھی جس نے اپنی عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ دولت مندی، لاڈو پیار اور ناز و نعم میں نہ کاٹا ہو۔ حضرت عائشہ حضرت ابوبکر کی صاحب زادی، حضرت حفصہ فاروق اعظم کی صاحب زادی، حضرت صفیہ رئیسِ خیبر کی بیٹی، حضرت جویریہ بنی مصطلق کے امیر کی بیٹی، ام حبیبہ رئیس قریش کی بیٹی غرض ہر بی بی کے گھر میں شان و امارت کا اظہار تھا۔ اور یہاں مشربِ رسول کچھ اور گھر کی حالت کچھ اور تھی۔ پھر فتوحات کا دائرہ بڑھتا جاتا تھا اور مالِ غنیمت کی فراوانی تھی۔ مگر سرکارِ عالم اس مال میں سے کچھ لے لینا روا نہ رکھتے تھے۔ شاید کسی ایک بی بی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ اس مال میں سے تھوڑا سا مال بھی مل جائے تو آرام کے ساتھ زندگی بسر ہو۔ پھر سب نے مل کر توسیعِ نفقہ کے معاملہ میں شرکت کی ہو۔ پھر ہر بی بی کو اپنی شان کے تحفظ کو بھی مدِ نظر ہو۔ یہ بھی خیال رہا ہو کہ سرکارِ دو عالم سب سے زیادہ مجھ سے ربط رکھیں اور دوسروں سے وہ ربط نہ ہو۔ مگر حضور اکرم کے عملِ مساوات نے اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیتا تھا پھر بھی توسیع نفقہ میں سب متفق تھیں اور جب یہ مطالبہ طول کھینچا تو آپ ملول ہو گئے اور آپ نے عہد کر لیا کہ ایک مہینہ تک ازواجِ مطہرات سے نہ ملیں گے۔

اسی زمانہ میں آپ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آگیا آپ بالاخانہ پر گوشہ نشیں ہو گئے۔ ان واقعات سے لوگوں میں خیال پیدا ہو گیا کہ حضور نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدیے ہیں۔ اور بی بی حفصہ سے جو راز کی بات کہہ دی تھی انہوں نے بی بی عائشہ سے ذکر کر دیا۔ دونوں توسیع نفقہ اور چند خاص معاملات میں متفق تھیں۔ چناں چہ دونوں خواتین نے آپ کے خلاف سازش شروع کر دی اور اللہ تعالٰی نے آپ کی الجھنوں اور اس سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اور وحی کے ذریعہ آپ کی الجھنوں کو دُور فرمایا۔

رازکی بات کو ظاہر کرنے کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئیں ان کا ترجمہ پہلے آچکا ہے۔ توسیع نفقہ اور سازش بارے میں ذیل کی آیات نازل ہوئیں: ترجمہ: " اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر ان کا (رسول صلعم کے مقابلہ میں ایکا کرو تو اللہ اور جبرئیل اور نیک مسلمان اور سب کے بعد فرشتے رسول اللہ کے مددگار ہیں" اور یہ آیات بھی توسیع نفقہ سلسلہ میں نازل ہوئیں: ترجمہ: " اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی پسند ہو اور اس کی زینت و آرائش کی ہوس ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر رخصت کردوں اور اگر خدا اور رسول اور آخرت پسند ہو تو اللہ نے تم میں سے نیک عورتوں کے لیے بڑے ثواب مہیا کر رکھا ہے "

جب یہ آیت نازل ہوی تو آپ بالاخانہ سے اُتر کر سب سے پہلے بی بی عائشہ کے پاس تشریف لے گئے اور آیاتِ ربانی سنایا تو بی بی عائشہ سرِ تسلیم خم کر دیا اور بولیں: سب کچھ چھوڑ کر اللہ اور اس رسول کو اختیار کرتی ہوں۔ اس کے بعد سب ازواج مطہرات ان آیات کو سن کر اُن کے دل محبتِ رسول سے پُر ہو گئے۔ حق کی جیت ہوی۔ طلاق کی خبریں غلط ثابت ہوئیں۔ اور سب نے اللہ کی رضا محبت رسول اور آخرت کو چاہا اور اپنے مطالبہ سے دست بردار ہوئیں۔

واقعۂ افک اب آپؓ کی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ پیش ہے۔ جس نے آپ کے فضائل کو غیر معمولی اور شاندار اہمیت عطا کی۔ اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپؓ نہ صرف حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوبِ نظر تھیں بلکہ بارگاہِ رب العالمین میں بھی آپ کی فضیلت تھی۔

افک (بکسرِ الف) لغت میں الٹنا پلٹنا اور اصطلاح میں وہ بہتان مراد ہے جو اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر رکھا گیا تھا۔ الزام اور بہتان میں بہت فرق ہے۔ الزام وہ ہے جس ہونے اور نہ ہونے میں فرق ہو یعنی شک ہو اور بہتان سے مراد وہ جھوٹی اوران ہونی بات ہے جو کسی پر لگایا گیا اور ایسا جھوٹ جسے سچ کر کے دکھایا جائے۔ ایک ایسا ہی بہتان جو اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالے عنہا پہ اٹھایا گیا تھا جس کی وجہ سے ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ واقعہ یوں ہے:

حضور اکرم جب بھی سفر پہ جاتے اُمّہات المؤمنین میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ قرعہ میں جس کا نام نکل آتا انھیں ساتھ لے جاتے۔ ۵ھ ہجری کا واقعہ ہے کہ غزوہ مصطلق کے بعد واپس مدینہ آرہے تھے۔ مدینہ منورہ ایک منزل پر تھا پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ ام المؤمنین ہودج (محمل) میں بیٹھ جاتیں جس کے چاروں طرف پردے ہوتے اور لوگ ہودج کو اٹھا کر اونٹ پر کس دیتے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ اسی جگہ پڑاؤ ڈالا گیا۔ گھر پہنچنے کی خوشی میں لوگ بہت دیر تک جاگتے اور باتیں کرتے رہے جب آدھی سے زیادہ رات گزر گئی تو آنکھ لگ گئی۔ صبح کے قریب لوگوں نے جاگنا شروع کیا اور اسباب باندھنا شروع کر دیا۔

اُمّ المؤمنین حاجت کو گئی ہوی تھیں۔ واپس آیا تو دیکھا کہ قافلہ کوچ کرنے تیار ہے۔ ہار جو مانگے کا تھا ندارد۔ ادھر دیکھا، اُدھر دیکھا ہار کا کہیں پتہ نہ چلا۔ واپس جنگل کو گئیں۔ ہار ڈھونڈنے لگیں۔ وقت کا خیال نہ رہا۔ ہار مل گیا۔ واپس لشکر کی طرف آئیں تو دیکھا کہ لشکر جا چکا ہے۔ اس خیال سے کہ راستے میں خبر ہو گی تو کوئی نہ کوئی آئے گا۔ اب انھوں نے وہیں قیام فرمایا۔ رات بھر کی جاگی ہوی تھیں

لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی اور چادر اوڑھ کر سو گئیں۔

صحابئ رسول صفوان بن المعطل سلمیؓ جن کی یہ ذمہ داری تھی کہ لشکر کوچ کر جائے تو پڑاؤ کے میدان کو اچھی طرح دیکھ بھال کر گری پڑی چیزوں کو اکٹھا کر کے لائیں۔ انھوں نے میدان کو گھوم پھر کر دیکھا اور اس طرف آئے جہاں ام المومنین چادر اوڑھی سو رہی تھیں۔ دیکھا کہ کوئی دبکا سکڑا چادر لپیٹے سو رہا ہے۔ قریب پہنچ کر پوچھا کون ہے؟ اتفاقاً ہوا کے تھپیڑے کی وجہ سے چہرہ پر سے چادر کھسک گئی تھی۔ آپ نے ام المومنین کو دیکھ لیا اور اونچی آواز سے اناللہ وانا الیہ راجعون کہا۔ یہ سنتے ہی آپ جاگ اٹھیں۔ صفوان نے جواب نہ ملنے پر اونٹ کو آپ کے قریب لاکر بٹھادیا۔ آپ سوار ہو گئیں۔ صفوان اونٹ کی مہار پکڑے پیدل ہی مدینہ کی طرف جلد جلد چلنے لگے۔ دوپہر کے وقت مسلمانوں کے لشکر میں داخل ہوئے۔ اس لشکر میں منافقین کا سردار عبداللہ مسئول کے ساتھ اور بھی کچھ منافقین تھے۔ اس نے دیکھا کہ ام المومنین اونٹ پر سوار آرہی ہیں اور مہار صفوان کے ہاتھ میں ہے۔ بدبختی کے کیڑے دماغ اور زبان پر رینگنے لگے۔ چہ میگویاں شروع کیں۔ مسطح بن آثاثہ، مشہور شاعر حسّان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش (ام المومنین حضرت زینب کی بہن) نے بھی ہاں میں ہاں ملادی۔ اس کا چرچا ہونے لگا اور یہ بات حضور اکرمؐ کے گوشِ مبارک تک پہنچی۔ آپ کے دل کو تکلیف پہنچی۔ مدینہ پہنچتے ہی ام المومنین بیمار ہو گئیں۔ حضور اکرمؐ نے چپ سادھ لی۔ نہ دلداری اور نہ شفقت فرمائی۔ اجازت لے کر چند روز کے لیے میکے چلی گئیں۔ ماں کی ممتا نے بہت کچھ دریافت کیا۔ ام المومنین چپ ہی رہیں۔ علاج ہوتا رہا۔ ایک شام رفع حاجت کے لیے اپنی پھوپی (مسطح کی ماں) کے ساتھ گئیں۔ انھیں ٹھوکر لگی، ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا مسطح ہلاک ہو۔ بی بی عائشہ نے کہا: کیوں کوستی ہو؟ وہ تو اصحابِ بدر سے ہیں۔ آپ کی پھوپی نے اپنی بھتیجی کے سامنے پورا واقعہ دہرایا۔ یہ سنتے ہی بے تابانہ واپس ہوئیں اور ماں سے پوچھا: آپ نے بھی کچھ سنا ہے، یہ معاملہ کیا ہے؟ ماں نے بیٹی کو گلے سے لگالیا اور تسکین دی۔ بہت کچھ سمجھایا بجھایا۔ معاملہ عصمت و عفت کا تھا۔ شدت سے روئیں۔ تڑپ تڑپ کر، بلک بلک کر رات کاٹیں۔ صبح کو یہ خبر حضورؐ کو پہنچی۔ سب سے پہلے فاروق اعظمؓ کی آنکھوں سے غصّہ کے مارے آنسو نکل پڑے۔ سرکار مدینہ سے مشورہ کیا اور کہا: میری رائے میں عائشہ سچی ہیں۔ یہ منافق جھوٹے۔ ام المومنین پر بہتان لگا کر اللہ کے رسول اور ان کے دوستوں کو دلی اذیت پہنچا رہے ہیں۔ حضرت عثمان غنی نے بھی کہا کہ یہ منافقین کاذب ہیں۔ حضرت علی نے بریرہ (حضرت صدیقہ کی ماما) سے دریافت کیا تو انھوں نے اس کے متعلق کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتیں۔ پھر حضور اکرمؐ نے بریرہ کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے کہا: عائشہ میں اس کے سوا میں نے کوئی عیب نہیں دیکھا کہ وہ آٹا گوندھ کر سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے۔ یا رسول اللہ! لڑکی ہے، ناتجربہ کار ہے رفتہ رفتہ درست ہو جائے گی۔ جب ہر طرف سے یہی صدا آرہی تھی تو آپؐ کو بی بی کی بے گناہی کا یقین ہو گیا۔ آپؐ مسجدِ نبوی تشریف لے گئے اور ممبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔ فرمایا:

"عبداللہ نے مجھے تکلیف دی اور بلا وجہ پریشان کیا۔ یہ لوگ میری بی بی عائشہ کو بدنام کرتے ہیں۔ معاملہ کی تحقیقات سے مجھے عائشہ کے خلاف کوئی بات معلوم نہ ہوئی اور جس شخص کے ساتھ عائشہ کو بدنام کرتے ہیں اسے میں خوب

جانتا ہوں۔ مسلمانو! جو بدمعاش میرے اہلِ بیت پر عیب لگاتا ہے، اُسے میری طرف سے کون سزا دے گا!
بنی اوس کے سردار سعد بن معاذ نے اٹھ کر کہا: یا رسول اللہ وہ چاہے ہمارے قبیلے کا ہو یا ہمارے بھائی قبیلے خزرج سے ہو ہم اسے ضرور سزا دیں گے۔ بنی خزرج اس پر بگڑ گئے اور نزاع ہونے لگی اور تلواریں باہر نکلنے ہی والی تھیں کہ سرکار مدینہ نے دونوں کو خاموش کرا یا۔ پھر آپ حضرت عائشہ کے ہاں پہنچے۔ دیکھا کہ بی بی صاحبہ فراش ہیں والدین تیمارداری کر رہے ہیں۔ آپ قریب بیٹھے اور فرمایا: اگر تم مجرم ہو تو توبہ کرو، ورنہ خود اللہ تعالیٰ تمہاری بے گناہی کو آشکار کر دیگا۔ آپ نے آنسو خشک کیا اور بولیں: اگر میں اقرار کروں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں بالکل بے گناہ ہوں تو سب کو میرے گنہگار ہونے پر یقین ہو جائے گا اور اگر انکار کروں تو کوئی باور نہ کرے گا۔ اقرار کروں جو قطعی غلط ہے اور اتہام لگانے والوں کے ہاں عید ہو جائے گی اور مجھے سچا سمجھ لیں گے۔ اس لیے اس وقت یہی کہوں گی جو ایک برگزیدہ اور سچے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے مصیبت کے وقت ادا ہوئے: فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون۔ بیٹی کو ماں سمجھا رہی تھیں کہ حضور اکرم پر وحی کے آثار شروع ہوئے۔ بیٹی کے اشارہ پر ماں نے سرکار مدینہ پر کپڑا اڑھا دیا۔ جب وحی نازل ہو چکی تو سرکار کی حالت درست ہوئی، کپڑا ہٹا دیا۔ سورۃ النور کی وہ آیتیں: ان الذین جآء بالافک سے ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ وان اللہ رءوف الرحیم تک نازل ہوئیں۔

ترجمہ: "وہ جو طوفان بنا کر لائے ہیں تمہارے ہی ہیں کا ایک گروہ ہے اس کو اپنے لیے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ان میں سے جس نے جو کچھ کیا ہے اتنا ہی گناہ اس پر ہے اور ان میں سے جس نے اس کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کے لیے تو بڑا عذاب ہے۔ مسلمانو! جب تم نے اس کو سنا تو کس لیے ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں نے اپنے دلوں میں ٹھیک گمان نہ کیا۔ اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے۔ کس لیے اس بہتان پر چار گواہ نہ لائے۔ پھر جب گواہ نہ لائے تو اللہ کے نزدیک بھی وہی جھوٹے ہیں۔ اور اگر اللہ تم پر فضل اور اس دنیا اور آخرت میں تم پر رحمت نہ ہوتی، جس کا تم نے چرچا کیا تھا اس میں تم پر کوئی بڑی آفت آ گئی ہوتی۔ جب تم نے اس کو اپنی زبانوں سے نکالنے لگ گئے اور اپنے منہوں سے وہ بات کہنی شروع کر دی تھی جس کا علم تم کو بھی نہ تھا۔ اور اس کو ہلکی بات سمجھ لیا تھا۔ حالاں کہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی بات ہے۔ اور جب تم نے اس کو سنا تھا تو کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں تو اس بات کو منہ سے نکالنا بھی لائق نہیں۔ سبحان اللہ! یہ تو بڑا بہتان ہے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے پھر کبھی ایسا نہ کرنا اگر تم ایمان رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آیتیں بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا اور حکمت والا ہے۔ وہ لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ بدکاری کا چرچا ایمان والوں میں پھیلے تو اُن کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عذاب الیم ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے، تم نہیں جانتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا مہربان ہے۔"

ان آیات کو سن کر صدیق اکبر، ام رومان خوشی سے پھولے نہ سمائے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ بی بی عائشہ سجدہ میں گر پڑیں۔ حضور اکرم مسجد نبوی تشریف لے گئے۔ ان آیات کو سنایا مسلمانوں نے خوش ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اور بہتان و افواہ پھیلانے والے حمنہ،

مسطح، عبداللہ اور حسان بن ثابت سرنگوں کھڑے ہو گئے۔ حضور نے جب ان سے شہادت پیش کرنے کو کہا تو وہ پیش نہ کر سکے اور کہا: ایک معمولی سی افواہ کو بغیر سوچے سمجھے اس قدر شہرت دے دی، ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں۔ شرعی حد کے مطابق اُن کو اسّی اسّی دُرّے لگائے گئے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برأت وحیٔ الٰہی سے اس طرح ثابت ہوئی کہ منافقوں اور مشرکوں کو دم مارنے کی جگہ نہ رہی اور جو اِس بارے میں ملوّث تھے بہت شرمندہ اور پشیمان ہوئے۔ غرض اللہ ربّ العزّت نے ناموسِ رسول حضرت عائشہ کی معصومیت اور بے گناہی کے ثابت کرنے کے لیے آیات کا نزول فرمایا۔ اس طرح آپؓ اس بہتانِ عظیم سے بری ہو گئیں۔

جنگِ جمل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے جس کی وجہ سے اعتراض اور نکتہ چینی کا باعث بنا۔ جنگِ جمل ہے جس میں ایک طرف حضرت عائشہ اور دوسری طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ تاریخِ اسلام سے واقفیت رکھنے والوں کو یہ معلوم ہوگا کہ حضرت فاروق اعظم عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جب تک خلیفہ رہے ساری مملکت اسلامیہ امن و امان سے رہی۔ ہر شخص مطمئن اور پُرسکون تھا۔ سارے ملک کا انتظام باقاعدہ چل رہا تھا۔ آپ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ جب خلافت آئی تو چھ سال تک سکون رہا۔ جب آپ نے اپنے چچیرے بھائی مروان کو (جس کو آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مع اس کے باپ کے مدینہ سے باہر نکال دیا تھا۔) جو بڑا مفسد تھا۔ اپنے پاس بلایا اور مملکت کے انتظام قریب قریب تمام اختیارات سونپ دیے۔ اس نے ان عمال اور حکام کو علاحدہ کر دیا جن کو حضرت عمر نے مقرر کیا تھا۔ ان کی بجائے اپنے رشتہ داروں کو جگہ دینے لگا۔ جن کے مظالم اور زیادتیوں سے تنگ آ کر صحابۂ رسول نے مدینہ آ کر شکایات کیں۔ آپ نے حضرت علیؓ کی باتوں پر بھی توجہ نہ دی۔ نیز ایک یہودی عبداللہ ابن سبا جو یہودی تھا برائے نام مسلمان بنا اسلامی حکومت کو نقصان پہنچانے کے لیے پوری مملکتِ اسلامیہ کا دورہ کیا اور خلافتِ عثمان کے خلاف غلط خبریں پھیلائیں۔ جس کی وجہ سے اضطراب اور بے چینی کی فضا ابھر آئی۔ پھر آپ نے عبداللہ بن ابی سرح کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔ جس نے ظلم و ستم ڈھائے۔ لوگوں کی شکایت پر صرف آپ نے نامہ بر ہی روانہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اور بھی ظلم و ستم شروع کر دیا۔ ایک شکایت کرنے والے کو مار بھی دیا۔ حضرت علی، حضرت طلحہ اور بی بی عائشہ کو مجبور کرنے پر محمد بن ابو بکر کو مصر کا گورنر نامزد کیا اور پروانۂ تقرری دے کر روانہ کیا۔ انھوں نے راستہ میں ایک تیز جاتے ہوئے شخص کو گرفتار کیا۔ اس کے پاس برآمد ہونے والے خط میں لکھا تھا کہ محمد بن ابو بکر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے اس پر مہرِ خلافت اور حضرت عثمان کے دستخط تھے۔ قافلہ اس شخص کو لے کر واپس مدینہ آیا۔ حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت سعید کو دکھایا۔ ان سبھوں نے سمجھ لیا کہ یہ سب شرارت مروان کی ہے۔ سب نے مل کر عثمان سے کہا کہ وہ مروان کو الگ کر دے اور اسے ان لوگوں کے سپرد کر دیں۔ آپ نے اس معاملہ میں تامل کیا۔ صحابہ آپ سے اور زیادہ منحرف ہو گئے اور

حضرت عثمان غنی کے معاملہ میں نہ پڑنے کا عہد کرلیا۔ مفسدین نے آپ سے خلافت سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا اور مروان کو اُن کے حوالے کردے۔ آپ نے ان دونوں مطالبات کو نہ مانا۔ اس پر شورش اور گڑبڑ شروع ہوگئی۔ آپ کی حفاظت حضرت حسین، محمد بن طلحہ، زبیر بن عبداللہ کرنے کے باوجود حضرت عثمان کو شہید کردیا گیا۔ شہادت کے بعد حضرت علی خلیفہ ہوے۔ آپ نے مروان کو طلب کیا تو وہ لاپتہ تھا۔ حضرت عثمان کی بیوی نائلہ نے دو نامعلوم الاسم اشخاص کا پتہ دیا۔ قاتلانِ حضرت عثمان کا پتہ نہ چلا۔ شورشیں اور گڑبڑ کی وجہ سے حضرت علی کو موقعہ نہ ملا کہ وہ قاتلانِ عثمان کو تلاش کریں۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اور دیگر ہواخواہوں نے حضرت عثمان کے قصاص پر زور دینے لگے۔ حضرت علی نے حضرت عثمان کے مقرر کردہ حاکموں کو معزول کرنا شروع کردیا۔ اس بات سے آگ اور بھڑک اٹھی۔

بی بی عائشہ حج کے لیے مدینہ سے مکہ تشریف لائی تھیں۔ واپسی کے وقت راستہ میں شہادت عثمان کی خبر ملی۔ آپ واپس مکہ گئیں۔ طلحہ اور زبیر مکہ پہنچ کر حضرت عائشہ کو مجبور کیا کہ قاتلانِ عثمان سے قصاص لینے آمادہ ہوجائیں۔ نیز بصرہ سے عبداللہ بن عامر اور یمن سے یعلی بن امیہ اپنی معزولی کی خبر سنتے ہی نقد و جنس کے ساتھ مکہ پہنچے اور اصرار و مجبور کیا آپ قصاصِ خونِ عثمان کی خاطر تیار ہوگئیں ہزاروں آدمی آپ کے جھنڈے تلے لشکر میں شامل ہوگئے۔ جب یہ لشکر بصرہ کے قریب پہنچا۔ حضرت علی جو کوفہ کے راستے آرہے تھے ان خبروں کو سُنا بی بی عائشہ اونٹ پر یہ سفر فرما رہی تھیں اس لیے اس جنگ کا نام جنگِ جمل پڑ گیا۔

حضرت علی چاہتے تھے کہ یہ جنگ ہونے نہ پائے۔ کسی نہ کسی طرح صلاح ہوجائے۔ مگر اس کی کوئی صورت نہ نکل آئی۔ مجبوراً حضرت علی اپنے لشکر کو لے کر آگے بڑھے۔ بصرہ کے حاکم عثمان بن حنیف جو حضرت علی کے طرف دار تھے، لشکر جمل کو روکنا چاہا، تو دونوں لشکر مقابل ہوے۔ بی بی عائشہ کے لیے یہ بات شاق گزری کہ دونوں طرف ایک دوسرے سے لڑ کر ہلاک و برباد ہوں۔ دونوں ابن حنیف اور ام المومنین صلاح پر آمادہ ہوے۔ لشکر میں گھسے فسادی چاہتے تھے کہ صلح نہ ہو۔ اس لیے انھوں نے رات میں لشکرِ حنیف پر شب خوں مارا۔ گڑبڑ شروع ہوگئی۔ حضرت علی نے قاصد بھیجے تاکہ بی بی عائشہ کو حفاظت کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا جائے۔ اس وقفہ میں حضرت علی اپنے لشکر کے ساتھ بصرہ آپہنچے۔ حضرت عبداللہ بن عباس بیچ میں پڑھ کر مصالحت کی بات چیت شروع کی۔ جو رات بھر چلتی رہی۔ اہل جمل غور کرنے کی مہلت مانگی۔ شرپسند جو فوج سے الگ ہوگئے تھے رات کو اہل جمل پر شب خوں مارا۔ اور انھیں غلط فہمی ہوئی یہ حضرت علی کے اشارہ پر ہوا۔ یہی سبب تھا جنگ جمل کے شروع ہونے کا

حضرت عائشہ کا اونٹ بطورِ عَلَم کے تھا۔ دورانِ جنگ حضرت علی نے اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ میں قرآن دیدیا کسی نے حاملِ قرآن کو تاک کر تیر مارا جس کی وجہ قرآن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ حضرت علی کی تلوار نیام سے باہر نکل آئی اور جنگ میں گرمی پیدا ہوگئی۔ لوگ بی بی عائشہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ اہل جمل نے بھی بہت سخت جنگ کی۔ بی بی کے اونٹ کی مہار پکڑنے والے تقریباً ستّر آدمی مارے گئے۔ اونٹ اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔ حضرت علی نے حکم دیا کہ اونٹ کے پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ چناں چہ بہ ہزار دقت اعین بن صبیعہ دارمی نے اونٹ کے پاؤں قطع کردیے۔ اونٹ سینے کے

بل چیختا ہوا گر پڑا۔ رسیاں کاٹ کر ہودج اتارا گیا۔ اونٹ اور ہودج کے گرتے ہی اہلِ بصرہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے محمد بن ابوبکر نے اپنی بہن ام المومنین کو لے کر بصرہ پہنچے اور ایک مکان میں ٹھہرایا۔ زبیر بن عوام مدینہ جاتے ہوئے مقتول ہوئے اور ان کے قاتل نے خودکشی کر لی۔ حضرت طلحہ پر مروان بن حکم زہریلا تیر چلا کر شہید کر دیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد حضرت علی نے بی بی عائشہ کو محمد بن ابوبکر کے ہمراہ مدینہ روانہ کر دیا۔ بی بی عائشہ نے چلتے چلتے حضرت علی سے فرمایا کہ وہ معاویہ سے ہوشیار رہیں۔ وہ دشمنی پر آمادہ ہے۔

وفاتِ حضرت عائشہ صدیقہ جب آپ کی عمر شریف چھیا ۶۶ سٹھ سال کی ہوئی تو ۱۷ رمضان المبارک ۵۸ سنہ ھجری کے مطابق 13 جولائی 678 سنہ ء کو وصال فرمایا۔ وفات سے پہلے آپ بیمار ہوئیں۔ اس حالت میں بھی تلاوتِ قرآن مجید آپ کا مشغلہ رہا۔ ایک دن حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ جو سرکار کے چچا حضرت عباسؓ کے بیٹے ؑ اور جلیل القدر صحابہ میں سے تھے بیمار پرسی کے لیے آئے۔ دورانِ گفتگو فرمایا: ام المومنین آپ خوف و ہراس دل سے نکال دیں کیوں کہ آپ بخشش اور رزقِ کریم کے وعدہ پر جا رہی ہیں اور یہ آیت مبارکہ پڑھی: الطیبات للطیبین والطیبون للطیبات اور فرمایا یہ آیتِ طیبہ آپ کی شان میں نازل ہوئی۔ اس آیت کو سن کر فرمایا: اے ابنِ عباس اللہ نے مجھے نو چیزیں ایسی عنایت فرمائی جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی کسی اور بیوی کو نہیں ملیں:

۱۔ جبرئیلِ امین نے نکاح سے پہلے میری شبیہ حضور انور کو بتلائی تھی۔
۲۔ حضور اکرم نے مجھ سے اس حال میں نکاح فرمایا کہ میں ناکتخدا تھی۔
۳۔ حضور اکرم نے میری ہی آغوش میں وصال فرمایا۔
۴۔ آپ کا مزار مقدس میرے ہی حجرہ میں بنا ہے۔
۵۔ میرے پاس ہوتے تو وحی نازل ہوتی تھی۔
۶۔ میں حضور کے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق کی بیٹی ہوں۔
۷۔ منافقوں نے جب مجھ پر تہمت لگائی تو اللہ کے کلام کے ذریعہ میری بریت، عصمت و عفت کی شہادت دی۔
۸۔ میں خود پاک ہوں اور پاک بندے کے لیے پیدا ہوئی۔
۹۔ اللہ نے میری بخشش اور رزقِ کریم کا وعدہ فرمایا۔

ان کے بعد عبداللہ ابن زبیر اور بہت سے صحابہ عیادت کے لیے تشریف لاتے آپ ہر ایک سے فرماتیں کہ اچھی ہوں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ مدینہ کے حاکم تھے۔ انھوں نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور رات کے وقت زبیر کے بیٹے عروہ اور عبداللہ، محمد بن ابوبکر کے بیٹے قاسم، عبداللہ اور عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے میّت کو قبر میں اتارا۔ جنت البقیع میں وصیت کے مطابق دفن کی گئیں: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے فضائل

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب بات کرتیں تو اُن کے منہ سے پھول جھڑا کرتے تھے۔ آپ کی بلاغت و وضاحت حضور کو اتنی پسند تھی کہ آپ سے گفتگو کی خواہش تھی۔ ذوق سے سنتے تھے اور مسرور ہوتے تھے۔ علم طب فقہ اور علم حدیث میں بڑی مہارت تھی۔ بڑے بڑے صحابہ بھی آپ سے استفادہ اور مشورہ فرماتے تھے۔ فرائض نکالنے میں آپ کو بڑی مہارت تھی۔ اکثر مسائل میں صحابہ آپ سے رائے لیا کرتے تھے۔

نکاح سے پہلے دو بار آپ کی شبیہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بتلائی گئی۔ حضور جب آپ کے گھر میں ہوتے تو وحی نازل ہوتی تھی۔ آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو وحیہ کلبی کی صورت میں دیکھا۔ آپ کی خوبی یہ ہے کہ ہر جگہ آپ حضور کی ہم جلیس، غمگسار اور ہمدم ہوں گی۔ حضور کی معرفت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو سلام بھیجا۔

ذہانت وفطانت کی مجسمہ تھیں۔ معلومات اور اجتہادی قابلیت، ذوق و تجسّس بہت تھا۔ بارگاہِ نبوت کی نہایت مستعد، آزاد و بے باک طالب علم تھیں۔ حضور گھر میں ہوتے تو ہر مسئلہ اور ہر معاملہ کو آپ سے پوچھتیں اور جب تک اطمینان نہ ہوتا اور بات صاف نہیں ہو جاتی اس وقت تک بحث و تکرار فرماتیں اور معاملہ کی تہ تک پہنچ کر مطمئن ہوتیں۔ حضور مسجدِ نبوی میں صحابہ کرام کی تعلیم ادب آموزی فرماتے تو حجرہ پاس ہونے کی وجہ سے کان دھر کر سنتیں اور سینہ میں محفوظ فرمالیتیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضور کے وصال کے بعد کسی آیت کے اصل مفہوم اور کسی حدیث کے مطلب میں شبہ ہوتا تو صحابہ آپ کی طرف رجوع ہوتے اور آپ اس شبہ کو دور کر کے مطلب کو صاف صاف بیان کر دیتی تھیں۔

واقعۂ جمل کے بعد آپ بائیس ۲۲ سال زندہ رہیں۔ دنیا سے بے تعلقی، قناعت، صبر کی بے مثال زندگی گزاریں۔ شریعتِ محمدی کی اصلاح و ترقی، تفسیرِ قرآن مجید، روایتِ حدیث اور اجتہاد و فقہی مسائل پر آپ کے بے شمار احسانات ہیں۔ آپ کا یہ رتبہ اور کسی نے نہیں پایا۔ طبقۂ نسوان کے تعلق سے آپ نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ یعنی عورت و مرد کے باہمی طرز معاشرت، عورتوں کے خاص مسئلہ، خاص خاص باتیں اور حالتوں میں روزہ، نماز، حج و طواف وعمرہ کی ممانعت و اجازت، پاکی و ناپاکی کی تعلیم۔ پردہ، لباس، آرائش، شوہر کی اطاعت، طلاق و نکاح کے خاص خاص نکات، ایسی بہت سی حدیثیں اور ان کی وضاحتیں آپ نے روایت فرمائی ہیں۔ اور اگر آپ روایتیں اور وضاحتیں نہ فرماتیں تو اسلام میں عورتوں کا بڑا نقصان ہو سکتا تھا۔

آپ علم حدیث کی بڑی معلمہ تھیں۔ تقریباً دو ہزار دو سو دس ۲۲۱۰ حدیثیں روایت فرمائی ہیں۔ علمائے حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ اگر آپ کی ذات نہ ہوتی تو علمِ حدیث کو بہت نقصان پہنچتا۔ ...

نصیحت آموز واقعات



مولوی جمیل احمد شریف لطیفی ننجنگڈھ ۔ دارالعلوم لطیفیہ ۔ حضرت مکان ۔ ویلور

سچائی کی برکت

ایک ماں اپنے بیٹے کو علم حاصل کرنے کے لیے بغداد بھیج رہی تھی اور اس کے کرتے کی آستین میں بغل والے حصّہ میں چالیس دینار رکھ کر سی دیے۔ جاتے وقت فرمایا: بیٹے! ہمیشہ سچ بولو۔ وہ لڑکا قافلہ کے ساتھ بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ چلتے چلتے قافلہ جب ایک دَرّے سے گزر رہا تھا، ڈاکوؤں اور رہزنوں کی ایک ٹولی نے قافلہ کو گھیر لیا اور سب کا مال چھین لیا۔ ایک ڈاکو نے اس لڑکے سے پوچھا: تمہارے پاس کیا ہے؟ لڑکے نے کہا: چالیس دینار۔ ڈاکو نے مذاق سمجھا اور آگے بڑھ گیا۔ اسی طرح دو چار ڈاکوؤں نے لڑکے سے یہی سوال کیا اور لڑکے نے ہر ایک سے یہی کہا کہ اس کے پاس چالیس دینار ہیں۔

سبھی نے لوٹا ہوا مال اپنے سردار کے سامنے جمع کر دیا۔ سردار نے ڈاکوؤں سے پوچھا کہ قافلہ والوں کا سارا مال لوٹا گیا یا نہیں؟ سب نے ہاں کہی۔ مگر ایک ڈاکو نے کہا: ایک لڑکا ہے۔ جس سے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کے پاس چالیس دینار ہیں۔ اسی طرح وہ دو چار ڈاکوؤں نے بھی سردار سے کہا۔ سردار نے حکم دیا کہ اس لڑکے کو حاضر کیا جائے لڑکے کو سردار کے سامنے لایا گیا۔ سردار نے بھی یہی سوال کیا تو لڑکے نے یہی جواب دیا۔ یہ سن کر سردار نے ایک ڈاکو سے کہا: اس لڑکے کی تلاشی لی جائے۔ تلاشی لی گئی تو کچھ نہ ملا۔ سردار نے کہا: اے لڑکے تجھے کیا اپنی جان کا خوف نہیں، جو تو اس طرح کا مذاق کر رہا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا: میرے پاس چالیس دینار ہیں۔ اب سردار نے پوچھا: کہاں ہیں؟ تو لڑکے نے جواب دیا: میری آستین میں بغل والے حصّہ میں سلے ہوئے ہیں۔ سردار کے حکم پر ایک ڈاکو نے تلاشی لی تو چالیس دینار نکلے۔ سردار نے پوچھا: اے لڑکے! تو نے یہ بتا کر اپنا مال گنوا دیا۔ اگر نہ بتاتا تو یہ مال تیرے ہی پاس رہ جاتا۔

لڑکے نے جواب میں کہا: میری ماں نے چلتے وقت یہ نصیحت کی کہ بیٹا ہر حال میں سچ کہنا۔ یہ سننا ہی تھا کہ سردار کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ وہ سوچنے لگا: ایک چھوٹا سا لڑکا، اپنی ماں کی بات مان کر سچ بتا دیا اور میں قرآن شریف کے پیغام اور نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کو بھول کر لوگوں کو لوٹتا اور قتل کرتا رہا ہوں دل کی کایا پلٹ گئی اور دنیا بدل گئی۔ اس نے توبہ کی اور اعلان کیا کہ قافلہ کا لوٹا ہوا مال واپس کر دیا جائے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے ڈاکہ زنی اور رہزنی کو چھوڑ کر قرآن شریف کے احکام پر عمل کروں گا۔ اس عہد میں میرا ساتھ کون کون دیگا

سردار کی بات سن کر اکثر ڈاکوؤں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور نیکی کی طرف رجوع ہوئے۔
وہ لڑکا جس نے ماں کی نصیحت پر عمل کیا اور سچ کہا وہ حضرت غوث الاعظم دستگیر، محبوب سبحانی، معشوق رحمانی قطب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ کی سچائی اور راست گوئی نے ڈاکوؤں کی دل کی دنیا بدل دی۔ وہ نیک اور صالح بن گئے۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی اور عمل صالح کے جذبہ کی برکت سے مقام ولایت پر فائز ہوئے۔

ماں کی خدمت

آدھی رات کا وقت تھا۔ بیمار ماں کو پیاس لگی۔ اس نے پانی مانگا۔ ایک نونہال لڑکا ماں کی آواز پر جاگ اٹھا۔ اور پانی لانے چلا۔ گھر کے برتن دیکھے تو پورے برتن خالی، پانی نہیں تھا۔ گھر سے باہر نکلا۔ کنوئیں پر پہنچا اور پانی لے کر ماں کے پاس آیا تو دیکھا کہ ماں سو گئی ہے۔ گلاس ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ صبح ہوئی تو ماں نے دیکھا کہ پانی کا گلاس لیے کھڑا ہے۔ پوچھا: بیٹا! تم رات بھر نہیں سوئے۔ جواب دیا: نہیں۔ ماں نے کہا: سو جاتے تو اچھا تھا۔ فرماں بردار بیٹے نے جواب دیا: میں اس لیے نہیں سویا کہ آپ جاگیں اور پانی طلب کریں۔ اور میں نیند سے بیدار نہ ہو سکوں۔ اس لیے میں آپ کے جاگنے کے انتظار میں جاگتا رہا۔
ماں نے بیٹے کی یہ محبت اور اطاعت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: اے رب العالمین! میرے اس بیٹے کی فرماں برداری کو قبول فرما۔
اللہ رب العزت نے اس ماں کی دعا کو قبول فرمالیا اور وہ فرماں بردار لڑکا بڑا ہو کر درجۂ ولایت کو پایا اور اپنے وقت کا ولی کامل بنا اور یہ تھے حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

بہلول دانا

بہلول دانا سے متعلق یہ نصیحت آموز واقعہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔
خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں ایک مجذوب آدمی تھے۔ جو شہر سے دور قبرستانوں میں، جنگلوں میں اور میدانوں میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی بغداد کے بازاروں میں بھی چکر لگاتے تھے
ایک بار ایک قبرستان سے مردوں کی کھوپڑیوں کو جمع کیا۔ اور ایک سخت سی باریک اور خشک شاخ ان کے ہاتھ میں تھی۔ ایک ایک کھوپڑی اٹھاتے۔ کھوپڑی کے کان کے سوراخ میں اسی شاخ کو گزارتے اور انھیں الگ الگ تین ڈھیروں میں رکھتے جاتے تھے۔ پہلے ڈھیر کی ایک کھوپڑی میں کان کا سوراخ تھا، مگر وہ سوکھی شاخ کان کے سوراخ میں نہیں گزرتی تھی۔ دوسرے ڈھیر کی کھوپڑی ایسی تھی کہ شاخ کان سے گزرتی اور وہ حلق کے سوراخ سے نکل آتی تھی۔ تیسرے ڈھیر کی کھوپڑی کے کان سے وہ شاخ گزرتی اور دوسرے کان کے سوراخ سے باہر نکل آتی تھی۔
یہ عمل جاری تھا کہ خلیفہ کا گزر ہوا۔ اسے تعجب ہوا کہ دانا قبرستان سے کھوپڑیاں اکٹھا کر کے ان کے تین ڈھیر بنا رکھے ہیں اور ہر ایک کھوپڑی کے کان کے سوراخ سے شاخ گزارتا ہے۔ وہ آپ کے قریب آیا اور پوچھا اے دانا یہ کیا کر رہے ہو؟ دانا نے خلیفہ کو دیکھا اور چپ سادھ لی۔ خلیفہ نے پھر یہی سوال دہرایا۔ تو دانا نے خلیفہ

سے کہا: اے خلیفہ یہ تین ڈھیر تین قسم کے آدمیوں کے کھوپڑیوں کے ڈھیر ہیں۔ جو اس دُنیا سے جا چکے ہیں۔ اور اب بھی دُنیا میں اسی قسم کے لوگ آباد ہیں۔

خلیفہ نے کہا: اے دانا! میں اب بھی نہیں سمجھا!

تب اس دانا شخص نے ایک کھوپڑی اٹھائی اور شاخ کو اس کے کان کے سوراخ میں گزارنی چاہی تو شاخ اس سوراخ میں دھنسی ہی نہیں۔ دانا نے کہا: اے خلیفہ! جب تک یہ دُنیا میں رہا اس نے کسی بھی اچھی اور نیک بات کو سُنا ہی نہیں۔ یہ بڑا ہی بدبخت تھا جو بزرگوں کی نصیحت کو نہیں سُنا۔

پھر دوسرے ڈھیر سے ایک کھوپڑی اٹھائی اور اس کے کان کے سوراخ میں سے شاخ گزاری۔ شاخ کان سے گزر کر حلق کے سوراخ سے باہر نکلی۔ دانا نے کہا: اے امیرالمومنین! یہ کھوپڑی اس خوش نصیب اور نیک و صالح شخص کی ہے۔ جب تک یہ زندہ رہا اس نے بزرگوں کی باتیں اور نصیحتیں کانوں سے سُنتا تھا اور ان باتوں کو اپنے دل میں گرہ ڈال کر رکھتا اور عمل کرتا تھا۔

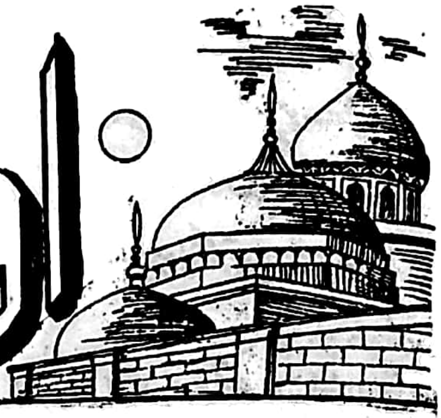
پھر تیسرے ڈھیر سے ایک کھوپڑی کو اٹھایا اور شاخ کو اِدھر کے کان کے سوراخ سے گزارا۔ وہ شاخ اس کان کے سوراخ سے گزر کر اُس کان کے سوراخ سے نکل گئی۔ بزرگ دانا نے خلیفہ سے مخاطب ہو کر کہا: اے نیک بخت خلیفہ! یہ اس تیرہ بخت اور شریرالنفس کی کھوپڑی ہے، جب تک یہ کھوپڑی والا زندہ رہا، بزرگوں کی باتوں اور نصیحتوں کو ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے باہر نکال دیتا تھا۔

خلیفہ نے اس دانا شخص کی باتوں کو بہت غور سے سُنا اور اُن کے قدموں اپنا ہاتھ رکھ کر تعظیم دی اور اجازت لے کر اپنی راہ لی۔ یہ بزرگ تھے مجذوبِ وقت حضرت بہلول علیہ الرحمہ۔ جنھیں بہلول دانا کہا جاتا تھا۔

یہ تینوں نصیحت آموز واقعات ایسے ہیں جن کو اپنے ذہن میں رکھ کر عمل کیا جائے تو یقیناً ہماری دُنیا و دین خیر سے گزرے۔

اے ربِّ ارض و سماوات دُعا ہے کہ ہمیں بزرگوں کی زندگی کے اچھے کارہائے نمایاں پہ عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے پیارے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اور طفیل سے ہماری دُنیا و آخرت کو سنوار دے آمین! آمین یا ربّ العالمین آمین ٭٭٭

اولیاء اللہ کی عظمت



ایم۔ اے۔ محمد خالد عرف الطاف ویلور: زمرۂ سابعہ دار العلوم لطیفیہ۔ حضرت مکان ویلور

اولیاء اللہ سے متعلق قرآنِ کریم کی یہ مشہور آیت ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف بھی نہیں ہے اور کوئی حزن بھی نہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ لِلْحَرْبِ: جس نے میرے ولی سے دشمنی کی میں اُسے جنگ کا چیلنج دیتا ہوں۔ مذکورہ آیت کی تشریح سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنئے۔ اس حدیث کے راوی خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں: آپ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں بعض وہ لوگ ہیں جو انبیاء و شہداء تو نہیں لیکن انبیاء اور شہداء اُن کے مرتبوں پر رشک کریں گے۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہی لوگ ہوں گے جو بغیر کسی قرابت داری کے اور دُنیاوی تعلقات کے اللہ کی رحمت سے لوگوں میں محبوب ہوں گے۔ پس اس وضاحت کے بعد آپؐ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (ابوداؤد)

اولیاء اللہ کی خدمت میں حاضری کے متعلق یہاں ایک واقعہ پیش ہے:

بہجۃ الاسرار میں ہے: حضرت عبداللہ تمیمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔ کہ: میرا طالب العلمی کا زمانہ تھا۔ میں بغداد میں مدرسۂ نظامیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ شہر سے کچھ دُور پر ایک مقبولِ خدا ہیں، جنھیں غوث کہا جاتا ہے۔ ہمیں اُن کی زیارت کا شوق ہوا۔ میں اور میرے دو اور ساتھی تھے۔ ابنِ سقا نے کہا: میں اس غوث سے ایسا سوال کروں گا کہ وہ چکرا جائے گا اور میرے سوال کا جواب نہ دے سکے گا۔

عبداللہ بن تمیمی نے کہا: میں سوال تو بڑا سخت کروں گا اور دیکھوں اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر

جیلانیؒ نے کہا: یہ کلمات بے ادبی سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں تو اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر صرف یہ دیکھوں گا کہ مجھے کتنا فیض ملتا ہے۔ جب یہ تینوں وہاں پہنچے تو وہ بزرگ اُن کو دیکھتے ہی غائب ہو گئے۔ پھر اچانک ظاہر ہوئے اور ابن سقا کی طرف غضب ناک نگاہ کر کے فرمایا: اے ابن سقا! خدا تیرا بھلا نہ کرے۔ تو مجھ سے ایسا سوال کرنا چاہتا ہے جس کا جواب مجھے نہ آتا ہو۔ لے سن! تیرا سوال یہ ہے اور یہ اس کا جواب ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرے جسم سے کفر کی آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔

عبداللہ تمیمی فرماتے ہیں کہ پھر وہ بزرگ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا: اے عبداللہ تمیمی! تیرا خیال ہے کہ تو اتنا سخت سوال کرے گا کہ میں اس کا جواب دے سکوں گا یا نہیں۔ تیرا سوال یہ ہے اور اس کا جواب یہ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ دُنیا تیرے کانوں کی لَو تک پہنچ چکی ہے۔

پھر شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن کو سینے سے لگایا۔ فرمایا: اے عبدالقادر تم نے ادب کی وجہ سے اللہ اور رسول کو راضی کر لیا اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بغداد کے منبر پر بیٹھے ہوئے وعظ کہہ رہے ہو اور لاکھوں انسان تمہارے بیان سے فیض یاب ہو رہے ہیں اور تم کہہ رہے ہو: قَدَمِي هٰذَا عَلٰى رَقَبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللّٰهِ۔ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے۔ اور مجھے یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ تمام اولیاء اللہ نے تمہاری بزرگی کے سامنے اپنی گردنوں کو جھکا دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ بزرگ ہم سے غائب ہو گئے اور پھر اُن کا پتہ نہ چلا۔

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اس غوث نے کہا تھا اللہ تعالٰی نے اسی طرح کر دیا۔ ابن سقا نے ہر علم میں شان دار کامیابی حاصل کی۔ ساری دُنیا میں اس کے علم کا چرچا ہونے لگا۔ بڑے بڑے عالم اس سے مناظرہ میں شکست کھا گئے۔ روم کے عیسائی بادشاہ نے اپنے تمام پادریوں کو جمع کیا اور ابن سقا کو مناظرہ کی دعوت دی۔ ابن سقا نے تمام پادریوں کو شکستِ فاش دے دی اور سب کو لاجواب کر دیا۔ بادشاہ اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوا۔ اچانک ابن سقا کی نظر بادشاہ کی جواں سال بیٹی پر پڑی اور وہ اس کا عاشق ہو گیا۔ ابن سقا نے بادشاہ سے کہا اپنی لڑکی کا نکاح میرے ساتھ کر دو۔ بادشاہ نے کہا: اس شرط پر نکاح کر سکتا ہوں کہ تو اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لے۔ ابنِ سقا نے فوراً اسلام کو خیرباد کر دیا اور مرتد ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا۔ نکاح کے ساتھ ہی اس کے جسم میں کوڑھ کی بیماری پھیل گئی۔ بادشاہ نے اس کو شہر کے باہر پھینک دیا۔ جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا اس پر لعنت بھیجتا۔ لوگ کہتے یہ وہ آدمی ہے جس نے اللہ کے ولی کی بے ادبی کی ہے۔ آخر کار اسی حالت میں مر گیا۔

مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ نے فرمایا: جب اللہ کسی کو ذلیل کرنا چاہتا تو وہ پاک لوگوں پر طعن شروع کر دیتا ہے۔ عبداللہ تمیمی فرماتے ہیں کہ جس طرح اس غوث نے کہا تھا، میں نے دیکھا ابن سقا پر اُسی طرح گزری۔ معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے اسی طرح ہو کر رہتی ہے۔

عبداللہ تمیمی کہتے ہیں مجھے تحصیل علم کے بعد سلطان نور الدین شہید نے دمشق بلایا اور وزیر اوقاف بنایا۔ میں نے دیکھا دُنیا میرے کانوں کی لَو تک پہنچ گئی ہے۔ میرے معاملہ میں غوث کا کہنا درست ہوا۔ مگر میرا ایمان سلامت رہا کیوں کہ میری بے ادبی اس سے کم رہی۔ اور

شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہٗ کو میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا کہ بغداد کی جامع مسجد میں منبر پر کھڑے ہوکر فرما رہے ہیں: قَدَمِي هٰذَا عَلٰى رَقَبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللّٰهِ۔ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردنوں پر ہے۔

شیخ علی بن ہیتی علیہ الرحمہ مجلس سے اٹھے اور غوث الاعظم دستگیر رضی اللہ عنہٗ کا قدم پکڑ کر اپنی گردن پہ رکھ لیا۔ دو ہزار اولیاء اللہ آپ کی محفل میں حاضر تھے۔ سب نے اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں۔ اس وقت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہ الرحمہ غزنی کے پہاڑوں میں عبادت فرما رہے تھے۔ شہنشاہِ بغداد کا اعلان سُن کر اپنے سر کو جھکا دیا اور کہا: لَا بَلْ عَلٰى عَيْنِي وَرَأْسِي، آپ کا فرمان سر آنکھوں پہ۔ اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اللہ کے محبوب بندوں کے دربار میں نہایت ادب و احترام سے حاضر ہونا چاہیے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ علماء کی محفل میں زبان کو سنبھال کر اور اولیاء اللہ کی محفل میں دل کو سنبھال کر بیٹھنا چاہیے۔

اولیاء اللہ سے ان کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی برابر فیض حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے بے پناہ دلائل ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت مولا علی مشکل کشا کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: شام میں ابدال ہوں گے۔ جن کی تعداد چالیس ہوگی۔ جب ان میں سے ایک فوت ہوجائے گا تو اللہ اس کی جگہ دوسرا مقرر فرمادے گا۔ ان کے وسیلہ سے بارش ہوگی اور ان ہی کے طفیل دشمنوں پر فتح حاصل ہوگی اور ان ہی برکت سے اہل شام سے عذاب دُور کیا جائے گا۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ کے مقبول بندوں کے ذریعہ بارش ہوتی ہے اور دشمنوں پہ فتح ملتی ہے اور عذاب دُور کیا جاتا ہے۔

اولیاء اللہ سے ظاہری زندگی میں تو فیض ملنے کا کوئی بھی منکر نہیں ہے۔ البتہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اولیاء اللہ سے وصال کے بعد ظاہری زندگی سے زیادہ امداد فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ اب وہ صرف اللہ ہی کی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ ہر سال فلسطین سے بغداد شریف میں حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کی قبر پہ حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور اس مسجد میں جو حضرت امام اعظم کے مزار کے قریب ہے، نماز ادا فرماتے تھے۔ اور نماز رفع الیدین نہیں فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ شاگردوں نے عرض کیا: ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں آپ اپنے اجتہاد پہ عمل نہیں کے بجائے اس اجتہاد پہ عمل کرتے ہیں، جو حضرت امام اعظم نے فرمایا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: مجھے یہاں آکر

اتنے بڑے امام کے سامنے اپنے اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

حضرات! اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضر ہونا اور ان سے فیض و برکات کا حاصل کرنا اہلِ اسلام کا شروع سے طریقہ چلا آرہا ہے۔

اولیاء اللہ کی نگاہ زمین پر ہی نہیں بلکہ لوحِ محفوظ تک جاتی ہے۔ ان کی نگاہوں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہوتی۔ عارف رومی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ؎

لوحِ محفوظ است پیشِ اولیاء ہر چہ محفوظ است محفوظ از خطاء

یہ واقعہ بہت مشہور ہے:

ایک دن حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ شیخ اوحد الدین کرمانی اور شیخ شہاب الدین علیہ الرحمہم تینوں یکجا بیٹھے ہوئے کسی مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ سامنے سے اچانک ایک لڑکا تیر و کمان لیے ہوئے نکلا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر حضرت غریب نواز علیہ الرحمہ نے ارشاد فرمایا: میں نے لوحِ محفوظ میں دیکھا ہے کہ یہ لڑکا دہلی کا بادشاہ ہوگا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ وہ لڑکا سلطان شمس الدین التمش تھا جو دہلی کا بادشاہ کہلایا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمارے دلوں میں اپنے مقبول بندوں کی محبّت عطا فرمائے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اولیاء اللہ کے فیوض و برکات ہمارے حق میں جاری و ساری فرمائے۔

آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم ...

(بقیہ ص 179 کا) "قلب کی اہمیت اور باطنی علاج"

اخلاص اور للّٰہیت اس کو جنّت میں داخل کروائے گی۔ ؎

روشن جو ترا دل ہو خود تجھ کو نظر آئے
ایمان کی دولت ہی سرمایۂ جنّت ہے

اللہ رب العزّت سے دعا ہے کہ وہ ہم تمام کے قلوب کو اپنے انوار و تجلّیات سے منوّر کرے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ...

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○

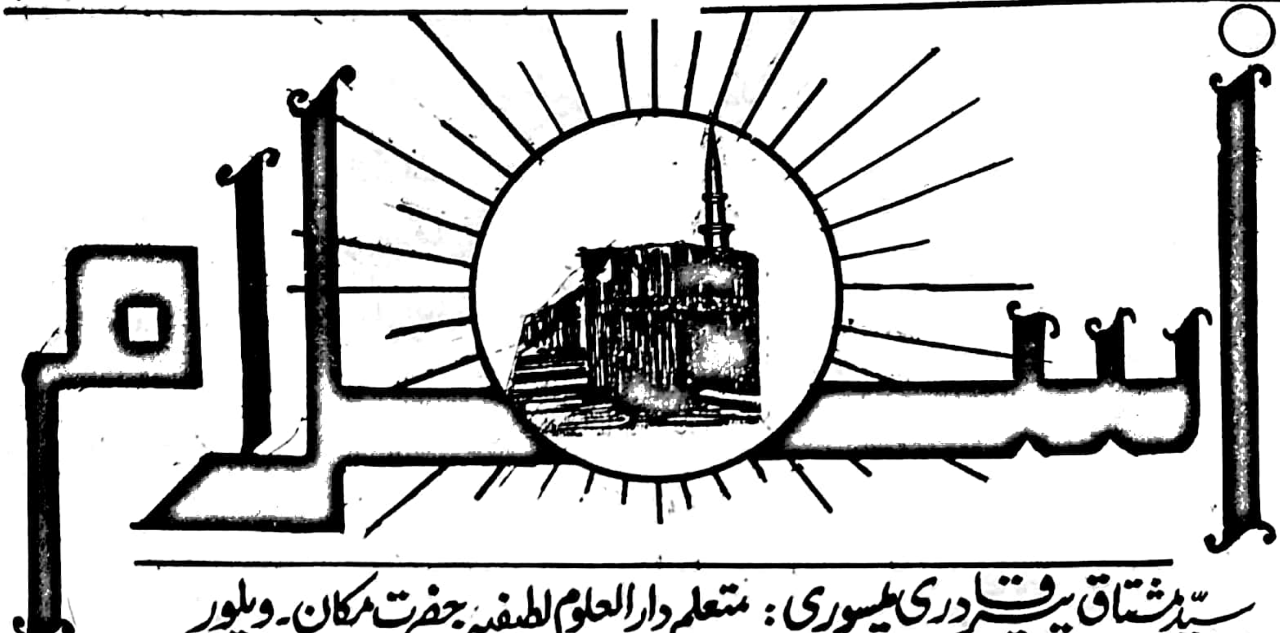
سید خلیل احمد قادری: متعلم زمرۂ سادسہ: دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان۔ ویلور (گجیندر گڑھ، کرناٹک)

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسان کو فطری طور پر ایک ایسی ٹھنڈی چھاؤں کی تلاش اور جستجو ہوتی ہے جس کے نیچے وہ اطمینان اور چین کی زندگی بسر کر سکے۔ اس کے حصول کی خاطر وہ نت نئے سامان اور نوع بنوع چیزیں فراہم کرتا ہے۔ دادِ عیش و عشرت دینے کے لیے فلک بوس عمارتیں تعمیر کرتا ہے اپنے کو آرام و سکون پہنچانے کے لیے خدم و حشم رکھتا ہے۔ اور اس کے علاوہ سال میں ایک یا دو دفعہ کسی خوش گوار مقام یا کیف آور سرزمین کی سیاحت بھی کرتا ہے۔ غرض وہ اپنے قلب کو سکون پہنچانے کے لیے دُنیا کی تمام چیزوں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن سچ پوچھئے تو اسے وہ سکون حاصل نہیں ہوتا جسے سکونِ خاطر کہتے ہیں۔ اسے وہ چین نہیں ملتا جسے دل کا چین کہتے ہیں اور اُسے وہ اطمینان نصیب نہیں ہوتا جسے اطمینانِ قلب کہتے ہیں۔ بسا اوقات خوش حالی و فارغ البالی، عیش و عشرت میسر آنے کے بعد بھی اس کی زندگی عذابِ الیم بنی رہتی ہے۔ نہ اُسے بڑے بڑے محلوں میں سکون حاصل ہوتا ہے نہ پھوس کے بنے ہوئے جھونپڑوں میں۔ حکیم مطلق کی حکمت و دانائی سے یہ بعید بات ہے کہ وہ انسان کی ضرورتوں اور فطری مطالبات کو فراہم کرنے لیے کوئی سامان پیدا نہ کرے ظلم ہوتا اگر اس کی بے چینی، اضطراب اور اس کے روحانی امراض کا علاج کرنے کے لیے ایسے نسخہ کا اہتمام نہ کرتا جو ہر جگہ اور ہر حال میں نسخہ کیمیا ثابت ہو۔ اس کی مادّی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع اور وسائل مہیا کر دیے ہیں۔ اور انسان ان سے مسلسل فائدہ اٹھا رہا ہے۔ انسان کی مادّی حیات کو باقی رکھنے کے لیے اُس نے مادّی غذاؤں کا اہتمام کر رکھا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کی روحانی حیات کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے اس نے کچھ سامان مہیا کر رکھے ہیں اور بلاشبہ مذکورہ بالا فطری طلب اور روحانی پیاس کو رفع کرنے کے لیے اس کی طرف سے ایک لبریز جامِ سکینت انسانوں کے آگے پیش کر دیا گیا ہے اور وہ ہے ذکرِ الٰہی یعنی یادِ خدا یہی ذکرِ الٰہی اور یادِ خدا ہے جس کے لیے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عن ابی موسیٰ الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل الّذی یذکر ربہ والّذی لا یذکر ربہ کمثل الحیّ والمیّت: [ترمذی] حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ کہتے ہیں: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے ذکر میں مشغول رہنے والے اور اس سے غافل رہنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔ آپ ﷺ نے اس شخص کو زندہ فرمایا جو اللہ تعالےٰ کی یاد میں مشغول رہتا ہے اور اس زندہ سے مراد زندہ دل ہے۔ جسے حقیقی اور دائمی زندگی سے سرفراز

کیا جاتا ہے۔ پس ابدی حیات ذکرِ الٰہی اور یادِ خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ جس شخص کا دل ذکرِ الٰہی سے خالی ہوگا وہ زندہ تو ہے لیکن اس کا دل مردہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس کے اندر اس چیز کا بالکل فقدان ہے جو دلوں کو زندگی بخشتا ہے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس ذکر کو سب نیک کاموں سے اعلیٰ وارفع بتایا ہے۔ اور جو انسان اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے وہ دُنیا کی مصیبتوں اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ درحقیقت انسان کی تمام مخلوقات پر افضلیت اور اشرفیت محض اس اعتبار سے ہے کہ اس کے اندر معرفتِ الٰہی کی استعداد اور قابلیت بدرجۂ اتم موجود ہے یہ امتیاز اُسے اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ اپنی اس استعداد اور صلاحیت کو کام میں لائے۔ اس کے بغیر اس کی روح بہیمیت کی آلائشوں میں پھنس کر بالکل مردہ ہو جائے گی جس کے نتیجہ میں وہ مقاماتِ بلند سے گر کر جانوروں کی مانند زوال وانحطاط کی آخری حد کو پہنچنے والوں میں سے ہو جائے گا۔ ذکرِ الٰہی اور یادِ خدا سے دِلوں کے اندر زندگی کی لہر کیسے دوڑ جاتی ہے! آئیے اس پر غور کریں۔

ذکرِ الٰہی سے مُراد کیا ہے! بعض اربابِ تصوّف کے نزدیک۔ ذکرِ الٰہی سے مراد مجرد لا الٰہ الا اللہ ہے اور بس یہی ہمیشہ وردِ زبان رہا کرے۔ ہمارے نزدیک ذکرِ الٰہی سے مراد عام ہے اور یہی مراد ہے۔ تمام صوفیائے کرام کی اور یہ ذکر فکر سے خالی نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ جو لوگ اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ یہ ذکر مع الفکر انسانی خواہشات وشہوات اور شیطانی طاقتوں کے خلاف یزدانی قوتوں کا زبردست خزانہ ہے۔ اگر واقعی یہ چیز حاصل ہو جائے تو گویا انسان کو اس کی زندگی کے ہر لمحے اور ہر موڑ پر رہنمائی کرنے کے لیے ایک عمدہ رہنما ہاتھ آگیا۔ جو اسے معصیت اور سرکشی کے ہر مقام سے بچاتا رہے گا۔ اور اس کا دل ذکرِ الٰہی کے صاف وشفاف آبِ رواں سے سیراب ہوتا رہے گا۔ غور کیجیے جب انسان اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے آثارِ قدرت اور خود اپنے اندر خدا کی رحمت ونعمت، اس کی کرم فرمائیوں کی کرشمہ سازیوں اور نوازشوں کا بہ نظرِ غائر مشاہدہ کرتا ہے۔ وجد وکیف میں آکر خدا کی حمد وثنا کا دل فریب ترانہ گانا چاہتا ہے۔ چہچہاتی ہوئی ننھی ننھی چڑیوں کے ساتھ تقدیسِ الٰہی کے نغمے میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔ کائنات عالم کے پتّے پتّے اور ذرّے ذرّے کے ساتھ بیٹھ کر ربِّ تعالیٰ کی تحمید وتمجید اور تسبیح سے معمور ہونا چاہتا ہے۔ انسان کی اس زبردست فطری خواہش جس کی تکمیل اُسے دُنیا وآخرت میں مقامِ بلند سے سرفراز کرتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اپنی زبان میں کلماتِ شکر ادا کرنے اور خدا کی حمد وثنا اور تسبیح وتقدیس کے لیے نغمۂ جانفزا یعنی سورۂ فاتحہ نازل فرمائی تاکہ انسان اپنی اس فطری تڑپ کو اس نغمہ کے ذریعہ پُورا کر سکے جو اس کے اندر سے اٹھتی ہے۔ مذکورہ بالا وضاحت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ ساری کائنات کی بُنیاد شکر پر ہے۔ دوسری یہ کہ انسان کو شکر ادا کرنے کے لیے سورۂ فاتحہ مرحمت فرمائی گئی۔ یہ سورہ ہر نماز کی ہر رکعت میں ایک دفعہ پڑھی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فاذکرونی اذکرکم واشکروالی ولا تکفرون پس مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا میرا شکر ادا کرو ناشکری نہ کرو۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے ذکر دراصل نماز ہی ہے۔ (بقیہ صـ۱۷۶ـ پر ملاحظہ ہو)



سید مشتاق پیر قادری یلسوری: متعلم دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان۔ ویلور

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

بے شک اللہ کے نزدیک دینِ اسلام ہی سچا دین ہے

ظہورِ اسلام سے پہلے نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں درندگی اور وحشت و بربریت، حرص و طمع، سفاکی و خوں ریزی، قتل و غارت گری اور اخلاقی پستی کا بازار نہایت گرم تھا۔ اگرچہ کہ بڑے بڑے اولو العزم پیغمبر، معلمین اور معلمِ اخلاق ہستیوں نے ندائے توحید و اخلاق بلند کی تھیں۔ لیکن زود فراموش انسانوں کے ذہنوں سے اس کا اثر جاتا رہا۔ اور صدائے توحید زمانہ کے انقلابات اور اس کی فتنہ انگیزیوں اور ہنگاموں میں دب کر رہ گئی۔

توحید و خدا پرستی کی جگہ پتھر کی مورتیوں، درختوں، چاند و سورج، ستاروں و آگ وغیرہ نے لے لی تھیں۔ بس یوں کہیے کہ پورا عالم ضلالت و گمراہی اور تاریکی کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

ایسے پُر آشوب اور پُر فتن دور میں اسلام کا جلوہ گر ہونا عالم پر ایک عظیم ترین احسان ہے۔ اسلام ہی جہاں کا وہ واحد مذہب ہے، جس نے انسان کو اس قدر سے روشناس کیا اور انسان کو ہلاکت و بربادی سے بچا کر صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کیا۔ دُنیا کے دوسرے مذاہب مخصوص طبقوں اور مخصوص اقوام تک محدود ہے لیکن اسلام کسی خاص طبقہ یا کسی خاص ملک کا مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ کُل نسلِ انسانی کا مذہب ہے۔ اسلام کا خدا صرف مسلمانوں کا خدا نہیں ہے بلکہ وہ ربّ العالمین ہے۔ یعنی ساری دُنیا کا خدا ہے۔ اور حضرت محمد صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم صرف مسلمانوں کے رسول نہیں بلکہ وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین: ساری دُنیا کے لیے رحمت بن کر آئے۔ ظہورِ اسلام سے قبل انسانوں میں جو بربریت، برائیاں و خامیاں تھیں اسلام نے ہر ایک کو چن چن کر ختم کیا اور یہ امتیازی خصوصیت صرف اسلام کو ہی حاصل ہے کہ اس نے دنیا کو تہذیب و تمدن، قانون، عدل و مساوات، اخلاق، راست بازی، راست گوئی، پرہیزگاری و تقویٰ،

کے زرین اصول پیش کیا۔ اسلام کا دُنیا پر سب سے عظیم احسان یہ ہے کہ اس نے انسان ہی نہیں بلکہ حیوانوں کی بندگی سے نجات دلاکر تمام کو خدائے واحدہٗ لاشریک لہٗ کے آگے سرنگوں فرما دیا۔

اور اتحاد جس کا اسلام سے قبل نام ونشان تک نہ تھا بلکہ اس کی جگہ نفاق اور باہمی عصبیت نے لے رکھی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر تلواریں میانوں سے باہر آجاتی تھیں اور آپس میں صدیوں تک خون کی ندیاں بہتی رہتی تھیں اور ایک مدت سے عداوت ونفاق کے شعلے جو بھڑک رہے تھے اسلام نے اسے سرد کردیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اتحاد واتفاق کی تعلیم دی۔ (وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ) اور آپس میں مت لڑو ورنہ کمزور ہو جاؤ گے اور اتحاد ہی ایک ایسی عظیم قوت ہے جس کے بغیر دُنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم بھی خوشی کی زندگی بسر نہیں کرسکتی ہے۔

اور صنف نازک جس پر اسلام سے قبل بے حساب ظلم وتشدد کے پہاڑ ڈھائے جارہے تھے اور ان کو جانوروں کی طرح مقید رکھا جاتا تھا اور بعض قبائل شوہر کے انتقال کے بعد عورت کو بھی زندہ نذرِ آتش کردیتے تھے۔ یہ سہرا صرف اسلام کے سر ہے کہ اس نے عورت کو غارِ مذلت سے نکال کر نہایت اعلیٰ وارفع مقام عطا فرمایا۔ اسلام کا اس سے بڑھ کر عورتوں پر اور کیا احسان ہوسکتا ہے جہاں اس نسل ہی کا خاتمہ کیا جارہا تھا وہاں اسلام نے (لا تقتلوا اولادکم) اپنی اولاد کو قتل مت کرو کا حکم جاری فرمایا۔ یہ اسلام ہی کا صدقہ اور طفیل ہے کہ آج عورتیں مقام سربلندی اور سرفرازی اور مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہیں۔

اسلام کی ایک اور بے مثال نعمت درس مساوات ہے جس کا تصور بھی اس سے قبل دُنیا کی کسی قوم میں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ دُنیا کا کم وبیش حصہ غلامانہ زندگی بسر کررہا تھا اور آپس میں اونچ نیچ، ایک دوسرے کو کمتر سمجھنا اور کمزوروں کو غلام بنالینا عام بات تھی۔ لیکن اسلام نے آقا غلام، بڑا چھوٹا، کالا گورا سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کردیا چنانچہ حضور اکرم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ارشاد فرمایا: عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور کالوں کو گوروں پر اور گوروں کو کالوں پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ ہی ہے۔ یعنی اللہ کے نزدیک ہم میں وہی محترم ومکرم سمجھا جائے گا جو صاحب تقویٰ ہو۔ الغرض اسلام نے توجیہات انسانی کے ہر ہر شعبہ میں رہنمائی کرتے ہوئے غلط روش فاسد عقائد اور مہلک رسومات وبے جا روایات کا خاتمہ کیا اور انسان کو زندگی کی قدروں سے روشناس کراتے ہوئے معراجِ کمال پر پہنچایا۔

دعا ہے کہ اللہ ہمیں اپنے پیارے رسول صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران بنائے۔ آمین !! ٭٭٭

اکلِ حلال ترکِ حرام

حافظ عبد السلام لطیفی ویلوری

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ﴿نساء﴾

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ۔ لیکن تجارت کے ذریعہ کھانے میں کچھ مضائقہ نہیں، جو باہمی رضامندی کے ذریعہ واقع ہو اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر رحیم اور مہربان ہے۔

اسلام نے حلال روزی کی تحصیل پر انتہا سے زیادہ زور دیا ہے۔ حتّٰی کہ فرائضِ اسلام کے بعد اگر کسی چیز کا درجہ ہے تو وہ صرف اکلِ حلال اور حلال و جائز مال کی تحصیل ہے۔ زبانِ نبوت صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس کی تحصیل پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے: طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ۔ اسلام نے مسلمانوں کو ایک صالح اور پاک و صاف اقتصادی اور معاشی نظام کے تحت روزگار اور معاش حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص دلائی ہے۔ اور ان تمام طریقوں اور ذریعوں سے مال و دولت اور ساز و سامان حاصل کرنے سے منع کیا ہے، جو غیر اخلاقی ہیں۔ اور سماج و معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہیں اور آخرت میں عذاب و عتاب کا باعث ہیں۔ اس سلسلہ میں مذکورہ آیتِ کریمہ بڑی جامع ہے۔ جس میں ناجائز طریقوں سے مال حاصل کرنے کی ممانعت ہے۔ اور تجارت و باہمی رضا و خوشی سے مال کھانے کی اجازت ہے۔ آیت میں باطل سے مراد سود، جوا، قمار، چوری، خیانت، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، دھوکہ فریب، ناجائز خرید و فروخت، ناجائز ملازمت وغیرہ اور دوسرے وہ تمام ذرائع اور طریقے ہیں جو اخلاقاً ناجائز اور مفادِ عامّہ کے لیے نقصان دہ ہیں۔ ارشادِ نبوی صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم ہے: فرائض کی ادائیگی کے بعد اولین اور اہم ترین فرض حلال روزی کی طلب و تحصیل ہے۔ طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ جَسَدٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ۔

حلال روزی کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور جس بدن کی پرورش حرام مال سے ہوئی ہو وہ جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔ امام ترمذی کی روایت ہے کہ حشر کے دن کوئی شخص اپنی جگہ سے اُس وقت تک نہیں ہٹے گا جب تک کہ

اُس سے ان چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ کیا جائے گا۔ پہلی چیز: اس نے عمر کیسے گزاری، دوسری چیز: جوانی کو کن کاموں میں صرف کیا۔ تیسری چیز: مال کہاں سے اور کیسے حاصل کیا اور کہاں کہاں خرچ کیا۔ چوتھی چیز: اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا؟ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا قلب اور زبان مومن نہ ہو جائے اور جب تک کے اس کے پڑوسی اس کی ایذا اور تکلیف سے محفوظ نہ ہو جائیں۔ اور جب کوئی شخص باطل طریقہ سے مال کھاتا ہے، پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ مقبول نہیں ہوتا اور اس حرام مال سے خرچ کرتا ہے تو اس میں خیر و برکت نہیں ہوتی اور اگر وہ یہ مال اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے تو اس کو دوزخ کی طرف لے جانے والا سامان ہوتا ہے۔ بے شک اللہ بری چیز سے عمل کو نہیں دھوتا بلکہ اچھی چیز سے بُرے عمل کو دھوتا ہے۔

اس دورِ پُرفتن میں دینی و شرعی احکام سے مسلمانوں کی غفلت نے حرام و حلال کا امتیاز اٹھا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کا میلان سودی کاروبار کی جانب ہو رہا ہے۔ اسی لیے یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ بھی ایک تجارت ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے قوانین اسلامیہ معلوم کر لیں اور جس چیز سے منع کیا گیا ہے اس سے احتراز کریں۔ اللہ نے سود کو حرام اور تجارت کو حلال فرمایا ہے۔ سود کو حرام فرمانے میں بہت حکمتیں اور فلسفہ ہیں۔

سود میں جو زیادتی کی جاتی ہے وہ معاوضۂ مالیہ میں ایک مقدار مال کا بغیر بدل و عوض کے لینا ہے اور یہ صریح ناانصافی ہے۔ دوم سود کا رواج تجارتوں کو خراب کرتا ہے کہ سود خور کو بے محنت مال حاصل ہونا تجارت کی مشقتوں اور خطروں سے کہیں زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے اور تجارتوں کی کمی انسانوں کی معاشرت کو ضرر پہنچاتی ہے۔ سوم سود کو رواج سے باہمی مودت کے سلوک کو نقصان پہنچتا ہے کہ جب آدمی سود کا عادی ہوا تو وہ کسی کو قرض حسنہ سے امداد پہنچانا گوارا نہیں کرتا چہارم سود سے انسان کی طبیعت میں درندوں سے زیادہ بے رحمی پیدا ہوتی ہے۔ اور سود خوار اپنے مدیون (قرض داروں) کی تباہی و بربادی کا خواہش مند رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی سود میں اور بڑے بڑے نقصان ہیں۔

شریعتِ مطہرہ میں باطل طریقوں سے اموال کھانے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس آدمی کا قلب مردہ ہو جاتا ہے اور ایمان کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ اور وہ اعمالِ صالح کو انجام دینے کی طرف مائل اور راغب نہیں ہوتا ہے اور باطل طریقوں سے حاصل شدہ مال بھی باطل راستوں ہی میں خرچ ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی خیر و برکت نہیں ہوتی۔

طبرانی میں ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے سعدؓ حلال کا کھانا کھا تیری دعائیں قبول ہونگی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! جب آدمی اپنے پیٹ میں حرام کا لقمہ ڈالتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کی چالیس دن کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔ جو بندہ حرام سے اپنا گوشت بڑھاتا ہے، جہنم کی آگ اس کے بہت قریب ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے: فرمایا جس شخص نے دس درہم کا کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا تھا جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہتا ہے اللہ تعالےٰ اس کی نماز قبول نہیں فرماتا۔ نبی کریم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انسان کا جان بوجھ کر ایک درہم سود کھانا چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بدتر ہے۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود میں تہتر گناہ

ہیں۔ سب سے ادنیٰ گناہ، آدمی کا اپنی ماں سے زنا کرنے کے برابر ہے۔ جو شخص جتنا سود کھاتا ہے اتنا حق تعالیٰ اس کے قلب کو آتش سے بھرے گا۔ اور سود خوار ہمیشہ حق تعالیٰ کے غضب میں رہے گا۔ اور سود کا مال رہنے تک اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت نازل ہوتی رہے گی اور حشر میں حق تعالیٰ سود خور کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھے گا اور نہ اس سے کلام کرے گا۔ زنا اور سود کا عام ہو جانا عذابِ الٰہی کو دعوت دیتا ہے۔ اور فرمایا جب کسی شہر میں زنا اور سود عام ہو جائے تو انھوں نے خود ہی اللہ کے عذاب کو دعوت دے دی ہے۔

سود کی بیماری آج کل مسلم معاشرہ میں تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے۔ کئی لوگ ایسے بھی ہیں جو بظاہر پکّے دین دار معلوم ہوتے ہیں لیکن اندر سے پکے سود خور رہتے ہیں۔ اہل اللہ اور صالحین کی زندگیوں پر ہم نظر ڈالیں تو حیرت ہوگی اہل اللہ اور صالحین نے اسلام کو عملاً اپنایا۔ اپنی کمائی کو باطل کی آمیزش و اشتباہ سے بھی پاک و صاف رکھنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی۔ اور جب کبھی ایسی صورت سامنے آجاتی تو اس مال کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

چناں چہ اس سلسلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کا کردار لائقِ تمثیل، قابلِ ذکر و تقلید ہے۔ امام اعظم علیہ الرحمہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ آپ کے کارخانہ میں خز نامی ایک خاص قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا اور دُور دراز ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ تیار شدہ مال میں کچھ نقص اور عیب پیدا ہو گیا تو آپ نے اپنے نوکر کو تاکید کی کہ خریدار کو کپڑے کا نقص دکھا کر کم قیمت میں فروخت کرے۔ آپ کا خادم اس تاکید کو بھول کر مال فروخت کر کے رقم لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے جب دریافت کیا تو اس نے کہا کہ مال فروخت کرتے وقت یہ بات بُھول گیا اور قیمت میں بھی کمی نہیں کی۔ اس پر آپ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور ساری رقم غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم تمام مسلمانوں کو سود سے بچائے اور کسبِ حلال کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین بجاہِ سید المرسلین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین •••

(بقیہ "سلف صالحین کی زندگی کی ایک جھلک" صفحہ 139 سے آگے۔)

اور کہنے لگا: اے اللہ! میرے گناہ بہت بڑھ گئے ہیں لیکن تو بہت بڑا ہے۔ لہٰذا ہمارے ساتھ وہ کام کر جس کا تو اہل ہے اور ہمارے ساتھ کر جس کے ہم اہل ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان سے عذاب دور کر دیا۔

سلف صالحین کی زندگی کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے جس کا نمونہ موجودہ دور میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں سلفِ صالحین کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مجلس کے آداب

از: جعفر عبداللہ ۔ متعلم زمرۂ خامسہ ۔ دارالعلوم لطیفیہ ۔ ویلور

یاایھا الذین امنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات (المجادلہ)

اے ایمان والو! جب تم کو کوئی کہے کھل کر بیٹھو مجلسوں میں تو کھل جاؤ اللہ کشادگی دے گا تم کو اور جب کوئی کہے اٹھ کھڑے ہو جاؤ اللہ بلند کرے گا ان کے درجے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کو علم ہے ۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں لوگ آتے تو ہر شخص آپ کے قریب بیٹھنا چاہتا جس سے کبھی مجلس میں تنگی پیش آجاتی حتیٰ کہ بعض صحابہ کو حضور کے قریب جگہ نہ ملتی ۔ اس لیے آدابِ مجلس بتائے گئے ۔ تاکہ ہر ایک کو فائدہ حاصل کرنے کا موقعہ ملے ۔ بتایا گیا کہ مجلس میں جب کوئی اور جگہ نہ پائے تو لوگ ذرا ذرا ہٹ جائیں تاکہ حلقہ کشادہ ہو جائے اور دوسروں کو بھی بیٹھنے کی جگہ مل جائے اور اگر کسی وجہ سے چلے جانے کو کہا جائے اس پر غرور نہ کریں اور ہتک نہ سمجھیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجلس میں آؤ تو پہلے سلام کرو اور بیٹھنے کے بعد جب اٹھ کر جانے لگو تو پھر سلام کرکے جاؤ ۔ پہلا سلام دوسرے سلام سے زیادہ ضروری ہے ۔ (ترمذی ، ابوداؤد)

اور اگر ایسی مجلس سے گزر ہو جس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی ہوں تو اس وقت بھی سلام کرنا چاہیے

ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر ایسی مجلس پر سے ہوا جس میں مسلمانوں کے علاوہ مشرکین اور یہودی بھی تھے ۔ آپ نے سلام فرمایا ۔ (بخاری ومسلم)

مجلس میں کوئی آدمی کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہ بیٹھے ۔ بلکہ کشادہ ہو کر اور کھل کر بیٹھنا چاہیے ۔ اگر کوئی شخص مجلس میں سے اٹھ کر گیا ، پھر واپس آگیا تو اُس جگہ کا وہی حق دار ہے ۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتے آپ اٹھ کر جاتے اور پھر واپس آنے کا ارادہ ہوتا تو آپ اپنی کوئی نشانی چھوڑ کر جاتے تو آپ کے اصحاب وہیں بیٹھے رہتے ۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ بہترین مجلس وہ ہے جو کشادہ ہو۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ الگ الگ حلقہ بنائے بیٹھے ہیں۔ آپ نے فرمایا: سب لوگ اکٹھا کیوں نہیں بیٹھتے۔ (ابوداؤد)

جب لوگ مجلس میں بیٹھے ہوں، آنے والے لوگوں کی گردنوں پر سے آگے نہیں جانا چاہیے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو جس کو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ اسی طرح اگر اور لوگ حلقہ بنائے بیٹھے ہوں تو بیچ میں آکر بیٹھنا نہیں چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں پر لعنت کی ہے۔ (ابوداؤد)

اگر مجلس میں کسی معزز آدمی کی وجہ سے لوگ بیٹھے ہوں تو اس کے اٹھنے کے بعد ہی اٹھنا چاہیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھ کر ہم سے بات چیت کرتے رہتے۔ جب آپ اٹھتے تو ہم بھی آپ کے ساتھ اٹھ جاتے۔ جب آپ اپنی کسی زوجہ محترمہ کے گھر تشریف لے جاتے تو ہم بھی اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ (بیہقی)

جب مجلس میں کوئی آئے تو یوں ہی بے پروائی سے اپنی جگہ بیٹھے نہیں رہنا چاہیے بلکہ آنے والے کے لیے کچھ جگہ بنانا چاہیے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک صحابی آگئے آپ اپنی جگہ سے ذرا ہٹ کر ان کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ انھوں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم جگہ تو کشادہ ہے۔ آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ آپ نے فرمایا: جب مسلمان اپنے بھائی کو آتے ہوئے دیکھے تو اس کا حق ہے کہ اپنے بھائی کو جگہ دینے کے لیے حرکت کرے۔ (بیہقی)

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے آئے۔ دو مجلسیں آراستہ تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دونوں مجلسیں خیر پر ہیں۔ ایک مجلس اللہ کی طرف رغبت کر کے دعا کر رہے ہیں۔ اللہ چاہے تو ان کو دے چاہے تو نہ دے۔ دوسری مجلس کے تعلق سے فرمایا۔ یہ لوگ پڑھنے پڑھاتے ہیں، ان کا درجہ بڑا ہے۔ اور میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں یہ کہہ کر آپ اسی علم والی مجلس میں بیٹھ گئے۔ (دارمی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں سے یعنی مسجد میں بیٹھ کر اللہ کی کتاب پڑھتے پڑھاتے ہیں تو ان پر سکنیت یعنی سکونِ قلب نازل ہوتا ہے اور رحمت الٰہی ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان لوگوں میں کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔ یعنی فرشتوں میں ان کا ذکر ہوتا ہے۔ (مسلم)

مجلس میں جب لوگ بیٹھے ہوں اور کچھ راز کی بات ہو تو اسے مجلس کے باہر کسی سے نہ کہنا چاہیے۔ ہاں اگر کسی مجلس میں گناہ یا ظلم یا فتنہ کی بات ہو جائے، جس کے اظہار سے فائدہ نظر آئے تو چھپانے کی ضرورت نہیں مسلمان کو چاہیے کہ ہمیشہ اچھی مجلس میں بیٹھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی مجلس میں بیٹھنے والوں کی مثال مشک بیچنے والے سے

دی ہے کہ جو کوئی اس کے پاس بیٹھے گا اگرچہ مشک نہ خریدے مگر اس کی خوش بو سے تو لطف اندوز ہوگا۔ اور بری مجلس میں رہنے والے کی مثال لوہار کی بھٹی میں بیٹھنے والوں کی طرح ہے کہ دھوئیں سے کپڑا کالا ہونے کے سوا کچھ نہیں ملے گا اور اس کی بدبو سے دل و دماغ کو تکلیف ہوگی۔ (ابوداؤد)

جب کسی مجلس میں تین ۳ آدمی ہوں تو ایک آدمی کو چھوڑ دو آدمیوں کو آپس میں کانا پوسی کرنا منع ہے۔ کیوں کہ اس طرح کی حرکت سے تیسرے آدمی کو رنج ہوگا۔ ہاں! اگر چار آدمی ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ (ابوداؤد)

اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب مسجد کی مجلس ہے۔ اور سب سے زیادہ مبغوض بازار کی مجلس ہے۔

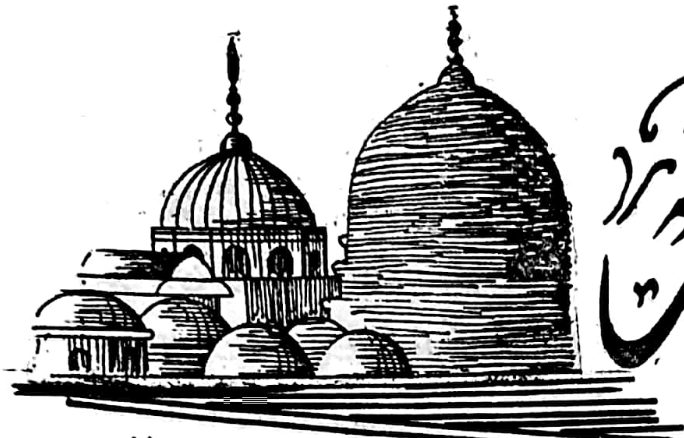
حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا مررتم بریاض الجنۃ فارتعوا: جب تم جنّت کے باغوں میں گزرو تو ان باغوں کا میوہ کھاؤ۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ جنّت کے باغ کون سے ہیں؟ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسجدیں۔ صحابہ نے عرض کیا: اور حضور ان کا میوہ کیا ہے؟ فرمایا: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر۔ یعنی ذکر حق مسجد کا میوہ ہے۔ (مشکوٰۃ، ص: ۶۳)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ یہ چند کلمات ایسے ہیں جب کوئی مجلس سے اٹھتے وقت تین ۳ بار کہے گا تو اس کی مجلس میں صادر ہونے والی غلطیوں اور خطاؤں کا کفارہ بن جائیں گے۔ سبحانک اللّٰھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک و اتوب الیک۔ (ابوداؤد)

اچھی مجالس میں بیٹھنے اٹھنے سے کوئی سیرت و شخصیت میں حسن اور خوبی پیدا ہوتی ہے۔ اور بری مجالس میں شریک ہونے سے آدمی کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے۔ اور آدمی سماج اور معاشرہ کی نظروں سے گذر جاتا ہے۔ کسی بھی شخص کے نیک اور صالح ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی مجلس، اس کے رفقا کس طرح کے ہیں۔

لہٰذا ہمیشہ مجالس کے آداب کا خیال رکھنا اور اچھی مجالس میں اٹھنے اور بیٹھنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو عمل استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ۔



اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ

ایم۔ سیّد احمد تنجاوُری: زمرۃ السادسۃ

عدل ایک ایسا جوہر ہے جو ملک کی زینت ہے۔ اسی سے قوم کی تعمیر و تشکیل ہے۔ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر اس کی تاکید آئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۝ بے شک اللہ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ بادشاہوں کا ایک گھنٹہ عدل کرنا ساٹھ برس کی عبادت کرنے سے بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ عدل کرنے والے قیامت میں نور کے منبروں پر ہوں گے اور عدل کرنے والا شخص قیامت کے دن رحمتِ خداوندی کے سایہ میں ہوگا۔ جس دن خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔

عدل کی فضیلت کے لیے یہی ایک بات کافی ہے کہ عدل وانصاف کرنے والا تمام لوگوں کا محبوب بن جاتا ہے۔ اگرچہ کہ اس کے عدل وانصاف سے اُن کو کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ ہو اور ظلم وستم کرنے والا تمام لوگوں کے نزدیک مبغوض اور ناپسندیدہ ہوجاتا ہے۔ اگرچہ کہ اس کے ظلم وستم سے اُن کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔ چناں چہ اس قول کی تائید وتصدیق کے لیے نوشیرواں اور حجاج بن یوسف کی مثال کافی ہے۔

نوشیرواں ایک آتش پرست تھا۔ لیکن لوگ جب بھی نوشیرواں کو یاد کرتے ہیں تو اس کے عدل وانصاف کی وجہ سے اس کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جب بھی حجاج بن یوسف کو یاد کرتے ہیں تو اس کے ظلم وستم کی وجہ سے اس پر نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ حالاں کہ وہ ایک مسلمان شخص تھا۔ جس نے صحابہؓ اور تابعینؒ کا مبارک زمانہ دیکھا تھا۔ لیکن لوگ اس کے ظلم کی وجہ سے نفرت کرتے ہیں۔ عادل بادشاہ زمین پر خدائے تعالےٰ کا خلیفہ ہے۔ اور ظالم انسان شیطان کا خلیفہ ہے۔ ایک سے خیر کو فروغ ملتا ہے تو دوسرے سے شر پھیلتا ہے۔

عدل کی فضیلت میں ایک حدیث یہ بھی ہے۔ کہ عادل بادشاہ کے جسم کو قبر کی مٹی نہیں کھاتی۔ چناں چہ مصنف "اخلاقِ محسنی" نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ خلیفہ مامون الرشید کی مجلس میں ایک عالم نے ایک حدیث بیان کی کہ عادل بادشاہوں

کے جسم قبر میں بکھرتے نہیں ہیں۔ اور ان کے اجزا ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ مامون نے یہ سنا تو فرمایا: نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کی صداقت میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ لیکن میری خواہش ہے کہ نوشیرواں کی لاش دیکھوں جو عدل کا مظہر تھا۔ جس کے بارے میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں ایک عادل بادشاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا۔ اس گفتگو کے بعد مامون الرشید نے مدائن کا سفر کیا۔ جب وہاں پہنچا تو اس نے حکم دیا کہ نوشیروان کی قبر کھول دی جائے۔ مامون اور اس کے رفقا اور مصاحبین نے دیکھا کہ ایک تازہ بدن خاک پر رکھا ہوا ہے۔ جیسے کوئی شخص نیند میں ہو۔ اور اس کے ہاتھ میں تین انگوٹھیاں ہیں اور ہر ایک پر ایک نصیحت لکھی ہے:

۱۔ دوست اور دشمن سے خاطر تواضع سے پیش آؤ۔

۲۔ عقل مندوں سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام شروع مت کرو۔

۳ رعایا کی حفاظت کو نہ چھوڑو۔

اس اثناء میں مامون کے ایک مصاحب اور ہم نشین نے کہا عدل کی یہ تاثیر ہے کہ مرنے کے بعد کافر عادل کا بدن قبر میں محفوظ رہتا ہے۔ مگر عادل مسلمان ہو تو کیا تعجب کی بات ہے کہ اس کا بدن قبر میں محفوظ رہنے کے علاوہ آخرت میں بھی دوزخ کی آگ سے محفوظ رہ جائے۔

قرآن ناطق ہے: اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۝ عدل و انصاف تو تقویٰ اور پرہیزگاری ہے اور عدل و انصاف کرنے والوں کو ایک اور خوش خبری یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اللہ تعالے انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور محبوب رکھتا ہے۔ اگر ہم اللہ کی خوشنودی، اس کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے ہر معاملہ میں عدل کو مقدم رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ ہمارے اسلاف اپنے ہر معاملہ میں عدل و انصاف کو مدّ نظر رکھتے تھے۔ اور جب بھی ان کے سامنے کوئی مقدمہ پیش آتا تھا تو عدل و انصاف سے فیصلہ سناتے تھے۔ اور فیصلہ کے وقت بڑا، چھوٹا یا امیر و غریب، اپنا پرایا یا طاقتور و کمزور ایسا کوئی فرق نہیں رہتا تھا۔ اس سلسلہ میں درج ذیل واقعہ قابل ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی معاملہ میں تنازع ہو گیٔ اور یہ مقدمہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ہاں پیش ہوا۔ حضرت زید نے دونوں کو طلب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو حضرت زید نے حضرت عمر کو خلیفہ اور امیر ہونے کی وجہ سے آپ کی تعظیم و تکریم کے لیے جگہ خالی کر دی۔ حضرت عمر نے یہ دیکھ کر فرمایا اس مقدمہ میں تمہاری یہ پہلی ناانصافی ہے۔ اس کے بعد آپ اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے۔ یہ حضرات اسی عدل و انصاف کے باعث اللہ کے محبوب بن گئے۔ قیامت کے دن عادل ہی اللہ کے بہت قریب ہوں گے۔ اور سب سے دور ظلم کرنے والے ہوں گے۔

حدیث شریف میں ہے کہ عادل بادشاہ کے چند لمحے جو عدل و انصاف میں گزر جائیں وہ ساٹھ سالہ عبادت سے بہتر ہیں تو عدل پر اجر و ثواب کی اتنی زیادتی اور کثرت کی وجہ یہی ہے کہ ایک عابد کی عبادت سے عابد کی ذات ہی کو فائدہ ہوگا۔

(بقیہ صـ 138 پر ملاحظہ ہو)



زندگی کی عظیم حقیقت

شاہنواز عرف محمد سلیم تنجاوُر ۔ متعلم جماعت ششم ۔ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ۔ ویلور

زندگی کی عظیم اور سچی حقیقت موت ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا ۔ جو بھی دنیا میں آیا اسے موت کا مزہ چکھنا ہی ہے ۔ ارشادِ خداوندی ہے کل نفس ذائقۃ الموت ۔ ہر نفس کو موت مقرر ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ ہم کسی طرح اس سے بچ نہیں سکتے ۔ خواہ اس کے لیے کیسے ہی حفاظتی تدابیر بھی کی جائیں ۔ قرآن کا ارشاد ہے : این ما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ : جہاں کہیں تم ہوگے موت تم کو آ پکڑے گی اگرچہ تم ہو مضبوط قلعوں میں ۔ اور یہ وہ چیز ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں اسی وقت آ پہنچتی ہے جو اس کا مقررہ وقت ہوتا ہے ۔ نہ اس سے ایک لمحہ قبل آتی ہے اور نہ ایک لمحہ بعد آتی ہے ۔ ارشادِ ربانی ہے : اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون : جب ان کا وعدہ آئے گا تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹیں نہ آگے بڑھیں [یعنی وقتِ مقررہ پر موت آ پہنچتی ہے]

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے موت سے متعلق بہت ساری حدیثیں فرمائی ہیں ان میں سے چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ۔ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے چند خطوط کھینچے یعنی [ایک مربع بنایا ایک خط مربع کے درمیان اور اسے مربع سے باہر نکلا ہوا کھینچا اور فرمایا یہ خط (جو مربع سے باہر نکلا ہوا ہے) انسان کی آرزو ہے اور یہ خط (یعنی مربع) انسان کی موت ہے ۔ پس انسان اسی طرح رہتا ہے کہ اچانک اس کو موت آجاتی ہے (یعنی وہ موت کو دور تر سمجھتا ہے اور موت کا خط قریب آجاتا ہے اور وہ آخر مر جاتا ہے ۔ (بخاری)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس اس حال میں آئے کہ میں اور میری ماں مٹی سے کچھ مرمت یا درستی کر رہے تھے آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا : عبد اللہ کیا کر رہے ہو ؟ میں نے عرض کیا : میں چیز کو درست کر رہا ہوں ۔ آپ نے فرمایا : موت اس سے بھی جلدی آنے والی ہے ۔ یعنی اس گھر کے منہدم ہونے سے بھی زیادہ جلدی آنے والی ہے ۔

۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ آدمی ہے اور یہ اس کی

موت۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنا ہاتھ گدی کے قریب رکھا۔ (یعنی موت اتنی قریب ہے) پھر ہاتھ کو پھیلایا اور (گدی سے دور کئے) فرمایا: اس جگہ انسان کی آرزو ہے۔ (یعنی موت قریب ہے اور انسان کی آرزو دراز۔ (ترمذی)

۴۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے ایک لکڑی زمین میں گاڑی، پھر ایک لکڑی اُس لکڑی کے پہلو میں، اور ایک لکڑی ان سے بہت دُور نصب کی۔ اور پھر فرمایا: تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ لکڑی (یعنی پہلی لکڑی) انسان ہے۔ اور یہ لکڑی (دوسری لکڑی) جو اس کے پہلو میں ہے، موت ہے۔ ابوسعید خدری رضہ کا بیان ہے۔ کہ تیسری لکڑی کی نسبت میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ فرمایا: یہ امید ہے، انسان امیدوں اور آرزوؤں میں گرفتار رہتا ہے کہ موت آرزوؤں کے پورا ہونے سے پہلے آجاتی ہے۔ (شرح السنتہ)

۵۔ موت سے متعلق حضرت غوث پاک علیہ الرحمہ کے عبرت ونصیحت آموز ارشادات ملاحظہ ہوں:

فکن من کفن مغسول ۔۔۔ وصاحب فی السوق مشغول

بہت سے لوگوں کے کفن تیار ہو چکے ہیں مگر کفن پہننے والے ابھی تک بازاروں میں لگے ہوئے ہیں اور موت سے غافل ہیں۔

وکم من قبر محفور ۔۔۔ وصاحبہ بالسرور مغرور

بہت سے لوگوں کی قبریں کھد کر تیار ہو چکی ہیں مگر ان قبروں میں دفن ہونے والے خوشیاں مناتے پھر رہے ہیں۔

وکم من فم ضاحک ۔۔۔ وھو عن قریب ھالک

بہت سے لوگ اس وقت خوشیاں مناتے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہنسنے والے بہت ہی جلد ہلاک ہونے والے ہیں

وکم من منزل عمّل ساؤہ ۔۔۔ وصاحب قد ازف فناؤہ

بہت سے محل اور مکان ابھی ابھی بن کر تیار ہوئے تھے کہ یکایک مکان کے مالک کی موت کا وقت آگیا

وکم من عبد یرجو الثواب ۔۔۔ فیبد ولہ العقاب

بہت سے لوگ ثواب کی اُمید رکھتے ہیں مگر اُن کے ساتھ عذاب یعنی موت آپہنچی ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ لوگ عمل بُرے کرتے اور اُمید اچھی۔

وکم من عبد یرجو الجنان ۔۔۔ فیبد ولہ النیران

بہت سے لوگ امید رکھتے ہیں جنّت کی جگہ، وہ دوزخ جاتے ہیں۔

وکم من عبد یرجو الخطاء ۔۔۔ فیبد ولہ البلاء

بہت سے لوگ انعام کی اُمید رکھتے ہیں مگر وہ سخت بلا میں گرفتار ہوتے ہیں۔

وکم من عبد یرجو الوصل ۔۔۔ فیبد ولہ الفصل

بہت سے لوگ وصال کی اُمید رکھتے ہیں، مگر اُن کو ہمیشہ جُدائی نصیب ہوتی ہے۔

وکم من عبد یرجو الملك　　　　فیبد دلہ

بہت سے لوگ ملک فتح کرنے کی اُمید رکھتے ہیں۔ مگر وہ ہلاک کئے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تغرنکم الحیوٰۃ الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور: تو ہرگز تمہیں اس کے حکم پر دھوکہ نہ دے وہ بڑا فریبی (یعنی اے لوگو! دنیا کے دھوکے میں آکر خدا کی یاد سے غافل نہ ہونا۔ موت کسی کو نہ چھوڑے گی۔ امیر ہو یا فقیر، بادشاہ ہو یا گدا، فاسق ہو یا خداترس۔ علامہ اقبال نے کیا ہی سچ کہا ہے: ؎

موت ہر شاہ وگدا کے خواب کی تعبیر ہے　　　　اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

حاصلِ کلام! موت کی یاد اور اس کی جانب ذہن وقلب کی توجّہ کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان فسق وفجور، ظلم و زیادتی، شر وفساد اور فتنہ وخونریزی سے بچنے لگتا ہے اور نیکی وعبادت، صلہ رحمی، احسان وسلوک کی جانب مائل اور متوجّہ رہتا ہے اور یہی ایک ایسی چیز ہے، جس کا مطالبہ اسلام اپنے　　　　سے کر رہا ہے۔ علّامہ اقبال نے موت کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے: ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی　　　　ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

بقیہ "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" صـ 64 کا بقیہ

وذکر واسمہ ربہ فصلی ٥ (ترجمہ: اور اس نے اپنے ربّ کے نام کو یاد کیا، پس نماز پڑھی۔ یہ تمام اذکار واعمال انسانی زندگی کے لیے روحانی غذا ہے۔ یہ تقربِ الٰہی کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ جس سے بندوں کے درجات بلند ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ نماز کو تمام اذکار کے اندر حد درجہ اہمیت اور فضیلت حاصل ہے۔ اور یہ چیز اس کے افضل اور اہم ہونے کے لیے بہت کافی ہے۔ کہ اس سے حاصل ہونے والی چیز کو نور وبرہان کہا گیا ہے۔ جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں امرِ حق کی نشاندہی کرتی ہے۔ اور انسان کا ہر وہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہے۔ وہ ذکر میں شامل ہے۔ اور اُمتِ محمّدیہ کو ضروری ہے کہ وہ اپنے آقائے دوجہاں صلے اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر عمل کرے اور اللہ تعالیٰ کو ہر گھڑی اور ہر لمحہ یاد کرے تو اُس کی دُنیا بھی سنور جاتی ہے اور آخرت بھی۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین ...

قلب کی اہمیت اور باطنی علاج

ایم۔ اے۔ محمد حنیف ویلوری۔ متعلم دارالعلوم لطیفیہ۔ حضرت مکان۔ ویلور

ے ہو بھی جاتے تھے کبھی ہمارے دماغ و دل مریض تھی مگر موجود قرآں میں شفا ہمارے لیے

انسان کو اللہ تبارک و تعالےٰ نے اشرف المخلوقات کا درجہ بخشا ہے اور اسے اعلیٰ پایہ کی مخلوق قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے ایسی قوتیں بھی عطا کی ہیں کہ وہ ان سے واقف ہو۔

انسان میں قوتوں اور صلاحیتوں کا نہایت حسین امتزاج ہے۔ انسانی بدن نہ صرف یہ کہ دیکھنے میں بے حد خوبصورت ہے بلکہ اس کے اندر جو مختلف نظام ہے وہ بھی حیرت ناک ہے۔ بدن کے تمام اعضا میں قلب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جو دوسرے عضو کو نہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی مقدس ترین کتاب قرآن مجید کا اصل موضوع انسان ہی ہے۔ اس میں انسان کے لیے ہدایت و رہنمائی ہے تاکہ انسان دنیا اور آخرت میں فلاح پالے۔ اس کے لیے "ایمان" بہت ضروری ہے اور ایمان دل میں قائم رہتا ہے۔ اللہ رب العزت کی مقدس باتوں پر عمل کرنے سے انسانی قلوب کو سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ حشر کے دن صرف قلب سلیم ہی فائدہ دے گا۔ (الشعراء: ۸۹) قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے کہ انسان کا دشمن شیطان ہے۔ جو انسان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ اور غلط کام کرنے پر اُسے مجبور کرتا ہے۔ انسانی خواہشات میں اضافہ ہونا بھی سراسر شیطانی عمل ہے یہی خواہشات انسان کو اندھا بنا دیتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ (الحج: ۴۶)

قرآن مجید میں دل کی مختلف کیفیتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ سخت دل۔ ۲۔ زنگ آلود دل۔ ۳۔ گناہ آلود دل۔ ۴۔ ٹیڑھے دل۔
۵۔ نہ سوچنے والے دل۔ ۶۔ بے ایمان دل۔ ۷۔ کانپ اٹھنے والے دل۔ ۸۔ دانشمند دل۔
۹۔ لرز اٹھنے والے دل۔ ۱۰۔ ایمان والے دل۔ ۱۱۔ قلب سلیم۔

اسی لیے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : اَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ لَمُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔ خوب یاد رکھو کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے۔

اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ خوب سن لو کہ وہ لوتھڑا جس کی وجہ سے سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے یا خراب ہوتا ہے وہ انسان کا دل ہے۔

مگر اس لوتھڑے سے وہ گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں ہے اس لیے کہ اگر دل کو چیر کر دیکھو تو اس میں یہ بیماریاں نظر نہیں آئیں گی۔ نہ تکبر نظر آئے گا، نہ حسد نظر آئے گا، نہ بغض نظر آئے گا اور اگر ڈاکٹر کے پاس جاؤ تو وہ دل کی ظاہری بیماریوں کو چیک کر کے بتا دے گا کہ اس کی دھڑکن صحیح ہے یا نہیں ہے، رگیں صحیح کام کر رہی ہیں یا نہیں۔ اس میں خون کی سپلائی صحیح ہو رہی ہے یا نہیں لیکن یہ تمام چیزیں جو تشخیص اور آلات کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہیں یہ صرف دل کے ظاہری عمل کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

اصل جو بیماریاں ہیں وہ پوشیدہ ہیں۔ آنکھوں سے نظر نہیں آتیں۔ دل میں حسد ہے نہیں، بغض ہے یا نہیں، صبر و شکر کی کیفیات ہے یا نہیں؟ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ظاہری امراض کا ڈاکٹر دیکھ کر نہیں بتا سکتا اور کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعہ چیک کر کے بتا دیا جائے کہ اس دل میں یہ باطنی بیماری ہے۔

اس باطنی بیماری کی تشخیص کرنے والے اس کا علاج کرنے والے حضرات صوفیائے کرام ہیں جو علم الخلاق کے ماہر ہوتے ہیں، باطن کی بیماریوں کی تشخیص اور ان کا علاج کرتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کسی صاحب دل بزرگ کے پاس جا کر تشخیص کرائے۔

غرض اسلام میں دل کی کافی اہمیت ہے۔ دل کے ایمان کے حساب پر انسان حشر کے دن جزا و سزا کا حق دار ہوگا۔ انسان کا دل آدمی کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اچھا یا برا عمل سب سے پہلے انسان کے دل ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ دماغ میں پہنچی ہوئی بات کو بھی دل کنٹرول کر سکتا ہے۔ جب تک دل نہ چاہے ہم بات پر کنٹرول نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی بات کو عملی جامہ پہنا سکتے۔

اس طرح دل کی بات بہت ہی زیادہ اثر رکھتی ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال فرماتے ہیں: ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　پَر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

حضرت مکان کے اکابر بزرگانِ کرام کا اصل کام دل کے اندر کی بیماریوں کا علاج تھا۔ وظیفے، ذکر، تسبیح یہ معمولات اصلاحِ قلب کے لیے تھے جو بطور مقویات کے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ باطن کی بیماریاں دور ہوں تکبر دل سے نکلے بغض دل سے نکلے، غیبت دل سے نکلے منافقت دل سے نکلے، دکھاوے کا شوق دل سے نکلے، حبِ جاہ دل سے نکلے، حبِ دنیا دل سے نکلے۔ دل سے ان چیزوں کو صاف کرنا اصل مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو، اللہ تعالیٰ سے امید وابستہ ہو، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو، توکل ہو، استقامت ہو، اخلاص ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے تواضع ہو۔

انسان ان چیزوں کی اصلاح خود نہیں کر سکتا۔ لہٰذا کوئی معالج تلاش کرنا چاہیے۔ اس معالج کو چاہیے پیر کہہ لو، چاہے شیخ کہہ لو، چاہے استاذ کہہ لو۔ جب تک انسان قلب کی اصلاح نہیں کرے گا اس وقت تک اسی طرح بیماریوں میں مبتلا رہے گا اور اس کے اعمال خراب ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر آدمی قلب کی اصلاح کر لے تو اس کے بعد نیکیوں میں اخلاص پیدا ہوگا۔ اور یہی

(بقیہ صفحہ 162 پر ملاحظہ ہو)



سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات حسنہ

حافظ فیاض احمد آمبوری متعلم زمرۂ ثالثہ۔ دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان۔ ویلور

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

ارشادِ خداوندی ہے کہ بلاشبہ آپؐ عظیم اخلاق پر فائز ہیں۔

سردارِ دو عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات حسنہ اس قدر دل کش اور مؤثر و برگزیدہ تھے کہ اس لوگ آپ کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ امہات المومنین سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا حسن سلوک نہایت درجہ نیک تھا۔ آپ کے دل میں غریبوں کی ہمدردی بہت تھی۔ اور یتیموں سے نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ آپ کا لب و لہجہ بے حد دل کش تھا۔ اگر دشمن بھی آتا تو سر تسلیم خم کرتا تھا۔ اور جو لوگ آپ کے جانی دشمن تھے اُن کے ساتھ بھی آپنے بہت نیک برتاؤ فرمایا۔ آپنے کسی کو کوئی رنج نہیں پہنچایا اور کسی کی دل شکنی نہیں فرمائی اور نہ آپ کسی کے لیے تکلیف کا باعث بنے۔ آپ میں عفو و درگزر کا مادہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ایک یہودیہ عورت جس کا نام زینب تھا اس نے حضور کو دھکا دیا۔ آپنے اس سے کوئی تعارض نہ کیا۔ اور معاف فرمادیا۔ اور ہندہ جو ابو سفیان کی بیوی تھی وہ ہر وقت آنحضرتؐ کو ہر وقت تکلیف دیا کرتی تھی اور دل سے یہ چاہتی تھی کہ حضور کی کسی طرح ذلت و رسوائی ہو۔ لیکن جب وہ آپ کے پاس آتی تو آپنے اس سے نہایت مہربانی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ غزوۂ اُحد میں آپکے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور چہرۂ مبارک زخمی ہوا تو لوگوں نے کہا کہ آپ اُن کے لیے بددعا کیجیے۔ تو آپنے فرمایا کہ میں بددعا کرنے کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہوں بلکہ میں رحمۃ للعالمین بن کر آیا ہوں اور ہاتھ اٹھا کر یوں دعا فرمائی: اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون؛ یعنی اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما وہ نہیں جانتے۔

مکہ کے لوگ جنھوں نے آپ کو شہر سے نکالا اور تکلیفیں دی تھیں۔ ہجرت کے آٹھویں سال مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آپکے قابو میں آئے لیکن آپنے نرم لہجے میں فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ وہی کروں گا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم

بھائیوں کے ساتھ کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو کہ دس سال آپ کی خدمت کا شرف حاصل رہا، کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے اف تک نہیں فرمایا اگر کوئی غریب معمولی شخص بھی آپ کو دعوت دیتا تو نہایت خوشی کے ساتھ قبول فرماتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کرتے تھے اور ان کی امداد فرماتے تھے۔ آپ جس سے بھی گفتگو فرماتے، وہ یہی سمجھتا تھا کہ مجھ سے زیادہ عزیز آں حضرت کے نزدیک اور کوئی نہیں ہے۔ آپ بڑوں کی ہمیشہ تعظیم کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی رضاعی ماں (بی بی حلیمہؓ) آئیں تو آپ نے اپنی چادر مبارک آپ کے لیے بچھادی۔ آپ کے در سے کوئی بھی سائل خالی نہیں گیا۔ غریبوں، کمزوروں اور خدمت گاروں کو آپ حقیر نہ سمجھتے تھے۔ اگر آپ کو کوئی ایذا پہنچاتا تو آپ اس کو معاف فرمادیتے تھے۔ اور کوئی ظلم کرتا تو آپ صبر کرتے اور فرماتے تھے کہ اللہ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے جنھیں مجھ سے زیادہ تکلیفیں دی گئیں تھیں۔

ایک دن معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے معاذ! اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہنا، سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، امانت میں کبھی خیانت نہ کرنا، ہمسایہ کے حقوق کی حفاظت کرتے رہنا، یتیم پر مہربانی کرتے رہنا، بات نرمی سے کہنا دوسروں کو کثرت سے سلام کرنا، اچھے کام کرنا، دُنیا کی حرص کم کردینا۔ ایمان کو لازم کرلینا، قرآن کو خوب سمجھنا، آخرت کا خیال رکھنا، قیامت کے حساب سے ڈرتے رہنا۔ اور ہمیشہ عاجزی کرنا پھر فرمایا اے معاذ! تم کو ان سب باتوں کی ممانعت کرتا ہوں۔ کسی دانش مند کو کبھی گالی نہ دینا، امام عادل کی نافرمانی، ملک میں فساد نہ مچانا، جو گناہ مخفی میں ہو تو اس کی توبہ نہ کرنا۔ اور جو گناہ علانیہ ہوجائے تو اس کی توبہ "علانیہ کرنا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!! ...

(بقیہ صفحہ 186 کا) "صاحب حوض کوثر صلی اللہ علیہ وسلم پہ لاکھوں درود وسلام"

درود پڑھنے میں صرف کروں گا۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: اگر تم ایسا کروگے تو تمہاری الجھنیں دُور کردی جائیں گی۔ اور تمہارے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔

ہمیں چاہئے کہ اپنے اوقات میں سے بیشتر حصہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ درود وسلام پڑھنے میں صرف کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک توفیق سے نوازے۔

آمین! بجاہ سید المرسلین۔ ...

طبِ یونانی

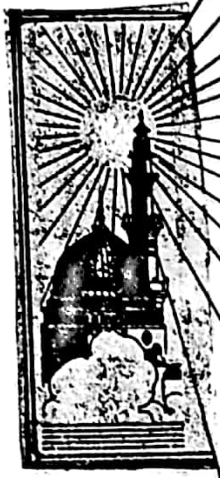
آلو بخارا

بی محمد نعمان باشاہ (B-U-M-S) متعلم انا میڈیکل کالج۔ چینئی۔

طبّی دُنیا کی ایک معروف اور مفید چیز آلو بخارا ہے۔ روزمرّہ زندگی میں مختلف پھلوں کی طرح اس کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آلو بخارا کو عربی میں اِجّاص کہتے ہیں۔ اس کا انگریزی نام (PRUNES) ہے۔ یہ پھل مختلف ملکوں، مثلاً پاکستان افغانستان، ہندوستان اور ایران میں کثرت سے پایا جاتا ہے اس کا اصل مسکن دمشق ہے۔ اس پھل کا تذکرہ عربی کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ چناں چہ ابن بیطار ایک معروف و مشہور مصنف و حکیم گزرا ہے اس نے اپنی کتاب "جامع المفردات" میں بڑی تفصیل کے ساتھ آلو بخارا کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن ھبل نے بھی اپنی کتاب "المختارات" کے دوسرے حصہ میں ذکر کیا ہے۔ اس پھل کی خصوصیات بہت ہیں۔ یہ پھل ترش ہوا کرتا ہے۔ تازہ حالت میں آلو بخارا کا رنگ سرخ ہوتا ہے خشک ہونے پر یہ پھل کالا ہوتا ہے۔ اور اس کا سائز (SIZE) بیر کے برابر ہوا کرتا ہے۔

اور یہ دو قسم کا ہے ایک کوہی جو پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا ہے اور ایک بستانی جو باغوں میں نشو ونما پاتا ہے۔ آلو بخارا خون اور صفرا کو تسکین دیتا ہے اور یہ ملّین بھی ہے جو رفعِ قبض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور آنتوں کے فضلات کو خارج کرتا ہے اور معدہ کی اصلاح کا باعث بھی ہے۔ اس کو بخاروں اور پیاس کی شدت کو دُور کرنے میں اور قئے متلی کو روکنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اطباء نے لکھا ہے کہ آلو بخارا کو منہ میں رکھ کر چُوسنے سے قئے اور متلی کو روکنے میں مدد ملتی ہے۔ اور اس سے پیاس کی شدت دُور ہو جاتی ہے۔ چار پانچ عدد آلو بخارا کو تھوڑی دیر کے لیے پانی میں رکھیں کچھ دیر میں وہ نرم ہو جائیں گے۔ ان کو اچھی طرح مَل کر چھان کر بخار والے کو پلانے سے بخار ختم ہو جاتا ہے۔

جدید تحقیقات کی روشنی میں معلوم ہوا ہے کہ آلو بخارا کے اجزاء میں کیلشیم (CALCIUM) فاسفورس کافی مقدار میں ہے۔ اور اس کے اندر لحمی، شحمی اور معدنی اجزاء بھی کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ آلو بخارا اپنی ذات سے غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے۔ اس کا مزاج سرد و تر ہے۔ •••



صاحبِ حوضِ کوثر صلے اللہ علیہ وسلم پر لاکھوں سلام

مولوی محمد اقبال لطیفی

الحمد للہ الذی ھدٰنا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبیّ بعدہ ہ

ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔

اللہ اور اس کے فرشتے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی نبی صلے اللہ علیہ وسلم پہ درود و سلام بھیجو۔ (سورۂ احزاب : آیت : ۵۶)

عن ابی مسعود الانصاری انہ قال اتانا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ونحن فی مجلس سعد بن عبادۃ فقال لہ بشیر بن سعد امرنا اللہ ان نصلی علیک فکیف نصلی علیک قال فسکت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حتیٰ ظننا انہ لم یسألہ ثم قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قولوا اللّٰھم صلی علی محمد وعلیٰ اٰل محمد کما صلیت علیٰ اٰل ابراھیم وبارک علیٰ محمد کما بارکت علیٰ اٰل ابراھیم فی العٰلمین انک حمیدٌ مجید والسلام کما قد علمتھم۔ (رواہ الترمذی)

ابی مسعود الانصاری رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے کہ فرمایا : انھوں نے کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ۔ اس حال میں کہ ہم سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہٗ کی مجلس میں تھے ۔ آپ سے بشیر بن سعد رضی اللہ عنہٗ نے پوچھا کہ اللہ تعالےٰ نے ہم کو آپ پہ درود بھیجنے کا حکم فرمایا ہے (تو ہم آپ پر) کس طرح درود بھیجیں ۔ (ابی مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم (یہ سن کر) چپ رہے گویا آپ سے سوال کیا ہی نہیں گیا (پھر کچھ دیر بعد) آپ نے فرمایا : (مجھ پہ اس طرح) درود بھیجو اللّٰھم صلی علی محمد الخ یعنی الٰہی رحمت بھیج محمدؐ پہ اور محمدؐ کی آل پہ جیسا کہ تو نے رحمت بھیجی آل ابراھیم پہ اور برکت کر محمدؐ پہ اور محمدؐ کی آل پہ جیسا کہ تو نے برکت دی آل ابراھیم پہ ۔ دنیا والوں میں سے بے شک تو ستودہ اور بزرگ ہے اور سلام اس طرح بھیجو کہ جیسا کہ تم کو سکھایا گیا ہے ۔

کلمۂ طیّب لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ (جوکہ ایمان کی اصل ہے، جب سے اسلام متعارف ہوا اور رہتی دنیا تک بلکہ اس کے بعد بھی یہی کلمہ نجات دلانے والا ہے۔) جیسے اس کا پہلا جزء اللہ کی طرف رجوع ہونے پر مجبور کرتا ہے، ویسے ہی اس کا دوسرا جز نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع ہونے کی ہدایت دیتا ہے۔

ہر کس و ناکس کے دل میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ہونا ضروری ہے۔ اپنے ماں باپ، جان و مال بیوی بچے، دوست احباب سب سے زیادہ محبت آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ طیبہ سے ہونا چاہیے۔ قرآن و حدیث ہمیں یہی حکم دیتے ہیں۔

نہ صرف وہی لوگ جو آپ کی زندگی میں موجود رہے بلکہ آپ کے پردہ ہونے کے بعد بھی ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ آپ صلعم سے محبت کرے۔ یہ نہ سمجھیں کہ ایسے آدمی سے کیسے محبت کیا جا سکتا ہے، جو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہے بلکہ آپس میں محبت کرنے والے دو شخص جب کہ وہ جدا جدا رہتے ہیں تو خط و کتابت کے ذریعہ اور جب روبرو ملنے کا موقعہ موقعہ پاتے ہیں تو اپنی پرانی یادوں کو تازہ کر کے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح سرکارِ دوجہاں صلے اللہ علیہ وسلم پہ جان قربان کرنے والوں کی نشانی ہے کہ جب کبھی کبھی آپ کا خیال دل میں آئے درود و سلام پڑھتے رہتے ہیں اور یہ آپ صلعم کی روحِ مبارک سے لگاؤ پیدا کرنے میں اکسیر کا کام دیتا ہے۔ پھر یہ ایک عبادت ہے۔

درود بھیجنے کا راز جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پہ آپ کے صحابہؓ بے حد و بے حساب اپنی جان سے بھی زیادہ محبت رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کو ہمیشہ یہی خواہش اور تمنا رہتی تھی کہ آپ کو ہمہ وقت دیکھتے رہیں، آپ سے بات چیت کرتے رہیں اور آپ کی معیت میں ہمیشہ رہیں مگر اس سے آپ کے آرام اور اہل و عیال کی ملاقات میں خلل ہوتا تھا لیکن آپ اپنے صحابہؓ کو روکنے سے جھجکتے تھے اس حالت کو دیکھ کر اللہ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی:

یا ایھا الذین امنوا لاتدخلوا بیوت النبی الا ان یؤذن لکم الی طعام غیر ناظرین انٰہ ولکن اذادعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستأنسین لحدیثٍ ان ذالکم کان یؤذی النبی فیستحی منکم واللہ لا یستحی من الحق ۝

مسلمانو! نبی کے گھروں میں بغیر ان کی اجازت کے داخل نہ ہوا کرو۔ اور اگر کھانے کی دعوت ہو تو کھانا پکنے سے پیشتر آ کر پکنے کے انتظار میں بیٹھے نہ رہو اور جب کھانا کھا چکو تو فوراً رخصت ہو جاؤ۔ اطمینان سے باتیں کرنے میں لگ جاؤ۔ اس کے خلاف کرنا نبی کو ایذا دینے کے مترادف ہوگا۔ وہ شرم سے کچھ نہیں کہتے اللہ تم سے حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔

(الاحزاب : آیت : ۵۳)

پھر اللہ نے اس کی تلافی کے لیے یعنی صحابہؓ کو آپ کے گھر میں زیادہ دیر رہنے سے منع کرنے کے بعد ان کی تسلّی کے لیے درود و سلام کو ایجاد کیا۔ اس کے ذریعہ نبی کے ساتھ روحانی تعلق کا نظام بتایا۔ اگر کوئی آپ ؐ پر درود و سلام بھیجے

رہے تو اس کا تعلق آپ سے گہرا ہو جاتا ہے اور وہ آپ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رہنے کو محسوس کرتا ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ کے صحابہؓ آپ پر خوب درود و سلام پڑھنا شروع کر دے جس کی وجہ سے آپ سے دور رہ کر بھی ان کو آپ ﷺ کی معیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس طرح سے آپ ﷺ کی ذاتی کاموں میں بھی خلل ہونے سے بچالیا گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں اس کے ذریعہ آپ ﷺ کے بعد آنے والوں کو بھی آپ ﷺ سے تعلق کا ایک بہترین راستہ کھل گیا۔

درود وسلام تعلق مع الرسول کا ذریعہ ہے عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامن احد یسلم علی الارد اللہ علیّ روحی حتی اُردّ علیہ السلام۔ (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ جب کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالے مجھے میری روح کو لوٹاتا ہے (پھر) میں اس سلام کرنے والے کا جواب دیتا ہوں۔

یہ حدیث اس بات کی صراحت ہے کہ آپ ﷺ پر سلام بھیجنا گویا آپ ﷺ سے روحانی تعلق کا ایک ذریعہ ہے۔

کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جس میں خدا کی عبادت دنیا کے کسی نہ کسی جگہ نہ ہو رہی ہو۔ ویسے ہی کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جس میں حضور ﷺ پر درود و سلام نہ بھیجا جا رہا ہو۔

کیوں کہ سورج کی گردش کے ذریعہ اوقاتِ نماز مقرر ہونے کی بناء پر اس لمحہ میں یہاں اذان ہو رہی تو دوسرے لمحہ میں دوسری جگہ اذان دی جا رہی ہے۔ اسی طرح پورے زمانہ میں زمین کے کسی نہ کسی خطہ میں اذان ہوتی ہی رہتی ہے۔ پھر پنجوقتہ نمازیں بھی ہو رہی ہیں، پھر نماز کی ہر دو رکعت پر التحیات کے ذریعہ السلام علیک یا ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پڑھ رہے ہیں۔ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ نوافل پڑھنے والے بے حساب اشخاص کی زبانوں سے بھی درود و سلام جاری ہے۔

غلامانِ مصطفےٰ دنیا کے ہر چپہ چپہ سے دیوانہ وار السلام علیک یا رسول اللہ، السلام علیک یا حبیب اللہ، السلام علیک یا رحمۃ للعٰلمین یا شفیع المذنبین کی صدا بلند کرتے ہی رہتے ہیں مسجد نبوی جس میں پنج وقتہ نماز با جماعت کے علاوہ کے اوقات میں جان نثارانِ مصطفےٰ روضۂ اطہر پر حاضر ہو کر آپ ﷺ پر سلام بھیجنے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی سعادت مندی ہے کہ آپ ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے صدیوں سال بعد بھی حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے ذریعہ آپ سے گفتگو کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کو قبر میں پہچاننا قال ﷺ مامن شیئ کنت لم ارہ الاوقد رأیتہ فی مقامی ھذا حتی الجنۃ والنار ولقد اوحی الیّ انکم تفتنون فی القبور [مثل اوقریبا] من فتنۃ الدجال [لا ادری ایتھما قالت اسماء] یؤتی احدکم فقال لہ ماعلمک بھذا الرجل فاما المؤمن

(او قال الموقن لا ادری ایهما قالت اسماء) فیقول محمد رسول اللہ جاءنا بالبینات والهدی فاجبنا و امنا واتبعنا فیقال له نم صالحا فقد علمنا ان کنت لموقنا واما المنافق (او المرتاب لا ادری ایهما قالت اسماء) فیقول لا ادری سمعت الناس یقولون شیئاً فقلته   (رواہ البخاری)

حضرت اسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے امام بخاریؒ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے قریب آنے والا دجال کی آزمائش کی طرح تم اپنی قبروں میں آزمائے جاؤ گے۔ اس وقت اس شخص کے بارے میں پوچھا جائے گا تب مضبوط ایمان والا جو ہوگا کہے گا کہ یہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، یہ اللہ کے رسول ہیں اور یہ وہ ہیں جو ہمارے لیے ہدایت اور معجزے لے کر آئے اور ہم نے اُن کی دعوت پر لبیک کہا اور ان کی اتباع کی۔ اس کے بعد اس سے کہا جائے گا کہ ہم جانتے ہی تھے کہ تو ایک سچا مؤمن ہے۔ لہذا اب تو اطمینان سے سو جا۔

اس طرح منافق سے جب سوال کیا جائے گا تو وہ کانپتے ہوئے کہے گا میں ان کو نہیں جانتا مگر لوگ ان کے بارے میں کچھ کہتے تھے میں بھی ان ہی کی طرح کہتا تھا۔

ان سب باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیدا ہونے والا ہر شخص کو مرنا ضرور ہے۔ مرنے کے بعد قبر ہی سے اس کے سوال وجواب شروع ہوجاتے ہیں۔ اس وقت آپؐ کو دکھا کر آپؐ کے بارے میں پوچھا جائے گا اس وقت وہی صحیح جواب دے گا۔

سلام کرنے والے کا آپؐ کا جواب دینا، قبر میں آپؐ کا تشریف لانا، آپؐ کے اور ہمارے درمیان کے تعلق پر دلالت کرتے ہیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کی محبت میں ہمیشہ غرق رہتے ہیں۔

حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے کہ "قلت یارسول اللہ انی اکثر الصلوٰۃ علیك فکم اجعل لك من صلواتی فقال ما شئت قلت الربع قال ما شئت فان زدت فهو خیر لك قلت النصف قال ما شئت فان زدت فهو خیر لك قلت فالثلثین قال ما شئت فان زدت فهو خیر لك قلت اجعل لك صلوٰتی کلها قال اذا تکفی همك ویکفر لك ذنبك ۔

پوچھا انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہ یارسول اللہ صلعم میں آپؐ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجنا چاہتا ہوں، لہذا آپؐ بتائیں کہ میں اپنے اوقات میں سے آپؐ پر درود بھیجنے کے لیے کتنا وقت مقرر کروں؟ آپؐ نے فرمایا جتنا تم چاہو! میں نے کہا: میں (دن کا) چوتھائی حصّہ مقرر کروں تو آپؐ نے کہا: تمہاری مرضی ہے مگر اس سے زیادہ تمہارے لیے بھلائی ہے۔ پھر میں نے پوچھا: کیا میں آدھا حصّہ دن کا مقرر کروں تو آپؐ نے فرمایا: وہ بھی تمہاری مرضی ہے مگر اس سے زیادہ تمہارے لیے خیر ہے۔ پھر میں نے کہا کہ میں اپنے وقت کا دو تہائی حصّہ اس کے لیے مقرر کروں تو آپؐ نے فرمایا وہ بھی تم جتنا چاہو۔ پھر بھی اس سے زیادہ تمہارے لیے بہتر ہے تو میں نے کہا: یارسول اللہ! میں اپنے پورے اوقات کو آپ پر

(بقیہ صہ 181 پر)

○ محبة الله عز وجل في اتباع محمد الرسول صلى الله عليه وسلم

عمر اسحاق المليباري پيناد كيرله

نحن أناس لانعيش على هذه الأرض ولا نقيم ولانخلد فيها أبدا تموق في يوم من ألايام لأن الله يقول كل نفس ذائقة الموت من نوى أن يعيش هنا لايقدر عليه لأن العالم مخلوق له وهو فانٍ في يوم القيامة ومن لم يمت وطال حياته فلا يتجاوز عن آخر اليوم. فالحاصل لاقوام ولاخلد ولاثبوت في الدنيا لشيئ من الأشياء ولاخلق من المخلوقات. ثم نعيش في الآخرة خالدين فتكون مقاصدنا عيش الاخرة وفي ذلك اليوم فريق في الجنة وفريق في السعير۔

فأما الذين يدخلون الجنة من يحبهم الله ورسوله. كيف يحب الله عبادهٗ وكيف الله يحب عباده وهما يقول الرحمٰن في آية قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم إلخ وهذه الآية تدل على أن اتباع رسول الله صلى الله عليه وسلم إحباب العبد الهه وأحباب الاله عبده فمعنى الاية من يريد إحباب الله فليتبع ملة النبي صلى الله عليه وسلم ومن اتبع ملته يحببه الله ويغفر له فمحبة الله من الايمان لم تحصل الا بمحبة النبيؐ (صلى) إنما محبة النبي فرض عين وواجب على كل مسلم. يحب الوالدان أبنائهم وسائر أقاربهم لأنهم يحبون منهم فهم بعض منهم وكذالك نستحق أن نحب النبي صلى الله عليه وسلم لأن الله يقول لقد جائكم رسول من انفسكم عزيز عليه ماعنتم حريص عليكم بالمؤمنين رؤوف رحيم۔ وهذه الآية تدل على أن محمد رسول الله جاء من جنسكم ومن نسبكم هو عربي وقرشي وما عنتم شديد عليه وشاق لكونه بعضا منكم فهو يخاف عليكم الوقوع في العذاب هو حريص على ايمانكم وبالمؤمنين رؤوف رحيم وإذا كان هذا صفة النبي فكيف يمكن أن لا

وقال ايضاً النبي أولى بالمؤمنين من انفسهم أحق بهم في كل شيئ من أمور الدين والدنيا وهذه الآية تدل أيضاً أن محبة النبي أولى بالمؤمنين لأنهٗ أرفا بهم وأعطف عليهم وأنفع لهم كقوله رؤوف رحيم۔

وطبيباً يحبه مريض لأجل إشفاء مرضه حتى يودى حق طبيبه وكذلك نودى حق

نبينا لأنه أحق بنا في كل شيئ من أمور الدين والدنيا فمحبة النبي أولى بالمؤمنين. فعديم المحبة علامة عديم الإيمان قال، رسول الله دليلا عليه لايؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من والده وولده والناس أجمعين. فينبغي علينا أن يكون أحب إلينا من جميع الناس فمعنى عديم الأيمان الكفر كيف يكون هو كفرا بضد المحبة بغض البغض الغضب مع الظلم إذا قال هو اعديم المحبة ثم يكون فيه بغض ومن كان لا يحب النبي يكون يبغضه اي يغبضه مع ظلم هذا كفر تام فمعنى عديم الإيمان الكفر.

ومعنى آخرى لايؤمن أي كاملا لكن قال للزجر فمحبة النبي تتمة الإيمان ووجدان حلاوة الإيمان. وقال أيضاً ثلث من كنا فيه وجد بهنا حلاوة الإيمان من كان الله ورسوله أحب إليه مما سواهما ومن أحب أحدا لايحبه إلا لله ومن يكره أن يعود في الكفر بعد أنقذ الله منه كما يكره ان يلقى في النار والذين آمنوا أشد الله هذه تشبت التفاوت في الحب وفي الحديث أنه جاء أعرابي إلى النبي فقال يا رسول الله متى الساعة قال ما أعددت لها فقال ما أعددت لها كثير صلوة و لا صيام إلا أني احب الله ورسوله. فقال له رسول الله المرأ مع من أحب وأصل المحبة الميل إلى مايوافق المحب ثم الميل قد يكون ما يستلذه الإنسان ويستحسنه كحسن الصورة والصوت والطعام ونحرها وقد يستلذه بعقله للمعاني الباطنة كمحبة الصالحين والعلماء واهل الفضل مطلقا وقد يكون لإحسانه إليه ودفع المضار والمكاره عنه وهذه المعاني كلها موجودة في النبي لما جمع من جمال الظاهر والباطن وكمال خلال الجلال وأنواع الفضائل وإحسانه إلى جميع المسلمين بهدايته إياهم إلى صراط مستقيم ودوام النعيم والابعاد من الجحيم كيف يحب رسول الله؟ أجاب لذلك رسول الله في حديث من أحب سنتي فقد أحبني ومن أحبني كان معي في الجنة فمحبة النبي محبة سنته واتباعه فمن لم يتبع سنته نفهم عنه انه لايحبه فمن لم يحبه لايكون مؤمنا كاملا. من المحبة زيادة الصلوة عليه وقرأة قصيدة البرأة الدار وسائر موالده لقوله تعالى إن الله وملئكة يصلون على النبي يا أيها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليما. إن الله لم ينقل في كتابه عن عبادة يفعلها إلا الصلوة فلذلك زيدوا الصلوة عليه يوما فيوما لزيادة محبة وحصول ثواب لنا. بل لا لحصول ثواب له لأن الله يحسن ويصلي عليه إن لم نكن نصلي: قال صلى الله عليه وسلم دليلا عليه من صلى علي صلوة صلى الله عليه عشرا.

وكذالك تعلم اللغة العربية وتعليمها وكتابتها وتكلمها من المحبة لأنه إتباعه في لغته كما إتباعه في أفعاله وعلى ذالك لغة القرآن. بل كل حرف يخرج من فم رسول الله وهذه البركة لم تحصل من غير لغة إلا لغة العربية. نحن لانهتم بها وعلم من مامر محبة النبي واجبة على

المؤمنين وكذالك طاعته واجبة لقوله تعالى واطيعوا الله وأطيعوا الرسول ان كنتم مؤمنين وكذالك يجب توقيره وتعظيمه لقوله عزوجل: انا ارسلناك شاهدًا ومبشرا ونذيرا: لتؤمنوا بالله ورسوله وتعزروه وتوقره وتسبحوه بكرة وأصيلا ظهر أن توقيره صلى الله عليه وسلم واجب ودعائه كدعاء بعضنا منهى ورفع الصوت فى حضرته فوق صوته منهى- بل محبط للعمل قال الصادى فى حاشية الجلالين لأن فى الرفع والجهر استخفافا بجنابه فيؤدى إلى الكفر المحبط و ذالك إذا ان ضم له قصد الإهانة وعدم المبالات

حبّ النّبى

ابراهيم ارماد

حُبّ النّبى على الانسان مفترض — وحب اصحابه نور ببرهان
من كان يعلم ان الله خالقه — لايرمينّ ابابكر ببهتان
ولا ابا حفصى ن الفاروق صاحبه — ولا الخليفة عثمان بن عفّان
ولا عليّا ابا السبطين نعم فتي — اوصى به الله فى سرّ واعلان
ركن الشريعة بحر العلم منتخب — والبيت لايستو الا باركان
شاعة مناقبهم فى الناس كلهم — ما بين علم واحكام تتبيان
لايستطيع العدى منه محاربة — ولو اتوه بابطال و شجعان
ومن احبّهم قد نال منزلة — عند الاله وجازاه باحسان
فهم صحابة خير الخلق خصّهم — ربّ العباد بجنّات ورضوان

عليهم من سلام الله اطيبه

ما ناحت الورق فى اوراق اغصان

مناجات



ڈاکٹر سیّد وحید اشرف کچھوچھوی۔ سابق صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو، دانشگاہ مدراس

اے خدا بندۂ عاجز ہے ترا ترے حضور
پیش کرتا ہے ترے سامنے یہ اپنے قصور

کیا کہوں میں کہ نہیں کچھ بھی ہے تجھ سے مستور
ہاں مگر یہ بھی یقیں ہے کہ تو ہے ربِّ غفور

کچھ نہیں پاس مرے اپنے گناہوں کے سوا
آس باندھے ہوئے شرمندہ نگاہوں کے سوا

کیا گنائے کوئی کیا کیا کیے تو نے احساں
تو نے اسلام دیا تو نے دیا ہے ایماں

پھر ہدایت کے لیے دے دیا نورِ قرآں
کتنا احساں یہ ہے ہو سکتا نہیں اس کا بیاں

قدر ہم نے نہ کی لیکن ترے احسانوں کی
سرکشی کی کوئی حد ہی نہیں نادانوں کی

ضعف بندے کا بھی کیا ہو کہ تجھ پہ ہے عیاں
ضعف اور جہل کا تقاضہ ہے کیا خود ہی بیاں

ضعفِ بندہ ہے تری شانِ کریمی کا نشاں
یہ بھی تسلیم، کرم تو نے کیا بے پایاں

دے دیا ہم کو رسول ایسا شفاعت کے لیے
اک رؤف اور رحیم آ گیا امّت کے لیے

مل گیا ہم کو یہاں سایۂ دامانِ رسول ﷺ
ہم کو اللہ نے بتلائی ہے خود شانِ رسول ﷺ

ہیں گنہ گاروں کے ملجا، یہ ہے فرمانِ رسول ﷺ
ہم گنہ گاروں کی جاں کیوں نہ ہو قربانِ رسول ﷺ

غرق ہوں عجز کے احساس میں اب کیا میں کہوں
بس یہ کہ عشقِ نبی میں ہی جیوں اور مروں

ساتھ نادانی کے اک نقص فراموشی بھی ہے
اور کچھ وجہِ خطا تیری خطا پوشی بھی ہے

یہاں دنیا کی عجب حسن فروشی بھی ہے
وعدۂ حور وہاں ہے، یہاں مے نوشی بھی ہے

علت اک اور ہے بیماری نسیاں بھی ہے
اس سے ہے خیر کا کچھ کام تو عصیاں بھی ہے

اس کو معلوم ہے انساں کی ہے علت نسیاں — اس کو معلوم ہے انساں ہے دشمنِ شیطاں
اس کو معلوم ہے یہ دُنیا ہے دامِ عصیاں — پائے یہ بندۂ ناچیز کہاں، کیسے اماں!

جوش میں آگیا پھر رب کا مرے بحرِ کرم
اس پہ ہو کیوں نہ کرم جس کو کیا خیرِ اُمم

اس نے ہر دور میں اُمت میں بنائے سالار — جن کے دل عشقِ نبی ؐ سے تھے ہمیشہ بیدار
رات دن حبِّ الٰہی سے تھے ایسے سرشار — اُن کی سرشاری سے آجاتی تھی دنیا میں بہار

اُن میں تھا غوث کوئی، قطب کوئی ابرار
اُن میں ابدال تھے، اوتاد بھی تھے اور اخیار

نام سب اُن کے گِنا دینا بہت مشکل ہے — جان سکتا ہے وہی کو جو صاحب دل ہے
کیا مقام ان کو ملا اور کہاں منزل ہے — وہم میں آ نہیں سکتا انھیں جو حاصل ہے

ہوئے اللہ کے وہ، ہو گیا اُن کا اللہ
کیا کہیں اور کہ ہے عقل بہت ہی کوتاہ

اے خدا واسطہ ہے شیخ محی الدین کا — واسطہ ہند کے سلطان معین الدین کا
واسطہ قطب دیں اور شیخ فرید الدین کا — واسطہ دیتا ہوں میں شیخ نظام الدین کا

ہم کو شیطاں سے، عصیاں سے بچالے مولیٰ
ہر بلا، آفت و طوفاں سے بچالے مولیٰ

اے خدا کر دے کرم اب شہِ جیلاں کے لیے — رحم اُمت پہ ہو اب خواجۂ عثماں کے لیے
ہو نوازش تری اب ہند کے سلطاں کے لیے — دے دے اب عزّ و شرف اشرف سمناں کے لیے

مشکلیں دُور ہوں اور رحم کا ہو ہم پہ نزول
ہو قبول اپنی دُعا بہرِ رسول، آلِ رسول

○ سیّد البشر

حضرت مولانا الحاج
سیّد شاہ محمد عمر آمر کلیمی چشتی القادری
مدراس۔

مریضِ توام کن دوا یا محمّد ۔۔۔ بجز تو نہ دارم شفا یا محمّدؐ
پناہِ دو عالم توئی عاجزاں را ۔۔۔ کرم کن برائے خدا یا محمّدؐ
ندارم سکوں در دلم ہیچگونہ ۔۔۔ سکونِ دل و جانِ ما یا محمّدؐ
زباں خشک گشتہ دل از سینہ رفتہ ۔۔۔ ندارم بجز یک صدا یا محمّدؐ
گدائے پریشاں بہ درگاہ ذیشاں ۔۔۔ بخواند ترا تا کجا یا محمّدؐ
گنہ کردہ بے حد پریشاں گشتم ۔۔۔ توئی عاصیاں را دوا یا محمّدؐ
بہ سویم نظر کن خدا را کرم ۔۔۔ وگرنہ بمیرد گدا یا محمّدؐ
چہ گویم تُرا کیستی در حقیقت ۔۔۔ ثنائے تو گوید خدا یا محمّدؐ
بگفتی کہ کُنتُ نَبِیًّا ز اول ۔۔۔ توئی ابتدا انتہا یا محمّدؐ
توئی نورِ ایماں توئی جانِ جاناں ۔۔۔ تو قرآنِ ما دینِ ما یا محمّدؐ
خدا جلوہ کردہ بشانِ تو شاہا ۔۔۔ توئی آیتِ اِنَّمَا یا محمّدؐ
ہمہ خلق جوید رضائے الٰہی ۔۔۔ رضائے تو جوید خدا یا محمّدؐ

زفیضانِ نوریؒ بگو آمرا تو!
شب و روز صَلِّ عَلٰی یا محمّدؐ

پیشکش: اے۔آر۔ مبشّر احمد آمری و اے۔آر۔ اقبال احمد آمری۔ ویلور

نعتِ شریف

مولانا ڈاکٹر حکیم سید افسر پاشاہ افسرؔ صبغۃ اللہی۔ شفاء ڈسپینسری۔ نڈوپیٹ۔ گرپاتم

بادشاہ نبوت رسولِ خدا — آپ شاہِ ہدیٰ سرورِ انبیاءؑ
آپ شمس الضحیٰ آپ بدر الدجیٰ — آپ خیر الوریٰ سرورِ انبیاءؑ
رہبرِ حق نما صاحبِ حق رسا — آپ کے زیرِ پا سدرۃ المنتہیٰ
اول الانبیاء آخر الانبیاءؑ — مجتبیٰ مصطفیٰ سرورِ انبیاءؑ
ساری مخلوق میں تم جدا ہی جدا — آپ کی ذات ہے ماوراء ماوراء
ظلِّ ربّ العلیٰ شاہدِ کبریا — اے شفیع الوریٰ سرورِ انبیاءؑ
اے امام الامم آپ فضلِ اتم — جودِ ابرِ کرم سرورِ ذی حشم
شاہِ فخرِ عرب شاہِ فخرِ عجم — احمدؐ مصطفیٰ سرورِ انبیاءؑ
اے بلیغ اللساں اے فصیح الزماں — وجہِ کون و مکاں ہادیٔ انس و جاں
آپ کا نور ہے اِس جہاں اُس جہاں — اے شہِ دوسرا سرورِ انبیاءؑ
عالم الاوّلین عالم الآخرین! — ملجأ العارفینؐ شافع المذنبینؐ
رحمتہ العالمین سید المرسلینؐ — مرحبا مرحبا سرورِ انبیاءؑ
افسرؔ ذی خطا کی ہے یہ التجا — کیجئے پھر عطا جو رہے اب سدا
اک نگاہِ کرم شاہِ ارض و سما — اے حبیبؐ خدا سرورِ انبیاءؑ



نعتِ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم

سید سراج الدین منیرؔ۔ حیدرآباد

تھا یہی منشا ازل سے خالقِ ادوار کا
آپؐ کے پردے میں اپنی شان کے اظہار کا

کلمۂ طیب میں شامل نام ہے سرکار کا
دیکھئے کیا مرتبہ ہے احمدِ مختار کا

کس نے کھولا قفلِ ابجد عالمِ اسرار کا
کس کے دم سے دم ہے قائم ثابت و سیار کا

حق سے واصل سب میں شامل عبد و رب میں رابطہ
مرحبا صد مرحبا رتبہ شہِ ابرار کا

شوق سے جبرئیل کو بھیجا بلانے کے لیے
منتظر تھا عرش پر ربُّ العُلیٰ سرکار کا

گر نہ ہوتے آپ تو رخ موڑ سکتے تھے بھلا
تین سو تیرہ مجاہد لشکرِ جرار کا

اے شہِ ہر دوسرا نظرِ کرم فرما دیجے
کوئی بھی پرساں نہیں اُمت کے حالِ زار کا

منکرِ شانِ رسالت منکرِ شانِ خدا
سوچ لو کیا ہے نتیجہ جراتِ انکار کا

نامۂ اعمال میں جو کچھ ہے سب مٹ جائے گا
بے ادب یہ فیصلہ ہے قاہر و جبار کا

ہمسری کا کیا کرے گا کوئی دعویٰ اے منیرؔ
مثل کیا سایہ نہ تھا اس مظہرِ انوار کا

پیش کش: سید علی احمد قادری۔ کلیمؔ: حیدرآباد

نذرِ عقیدت

بحضور فیض گنجور حضرت سید شاہ عبدالقادر المعروف بہ قادر ولی شاہ حمید الدین گنج سوائی ناگوری۔ رحمۃ اللہ علیہ

السلام اے حضرت قادر ولی!
السلام اے ہند کے نادر ولی

السلام اے خاصِ یزداں السلام
السلام اے شاہِ شاہاں السلام
السلام اے بحرِ فیضاں السلام
السلام اے ابرِ احساں السلام

السلام اے حضرت قادر ولی!
السلام اے ہند کے نادر ولی!

آپ صاحب زادۂ حسنینؓ ہیں
خاتم المرسلؐ کے نورِ عین ہیں
حضرتِ حیدرؓ کے دل کے چین ہیں
بزمِ غوثیت کے زیب زین ہیں۔

السلام اے حضرت قادر ولی!
السلام اے ہند کے نادر ولی!

کیا بیاں ہو ہم سے عفت آپؒ کی
تھی لڑکپن سے کرامت آپؒ کی
ایک زمانہ پہ ہے شفقت آپؒ کی
اے جزاک اللہ محبت آپ کی

السلام اے حضرت قادر ولی!
السلام اے ہند کے نادر ولی!

سب پہ روشن ہیں ادائیں آپؒ کی
مستجابِ حق دعائیں آپؒ کی
کتنی دل کش ہیں ادائیں آپؒ کی
کیوں نہ لیں ہم بھی بلائیں آپؒ کی

السلام اے حضرت قادر ولی!
السلام اے ہند کے نادر ولی!

عرض ہے اے راحتِ جانِ رسولؐ
بہرِ حیدرؓ بہرِ حسنینِ بتولؓ
ہو سلامِ ذائقؔ عاصی قبول
ہو ہمیں دارین میں فرحت حصول

السلام اے حضرت قادر ولی!
السلام اے ہند کے نادر ولی!

★★★★

پیشکش: آمنہ بی۔ نیو ٹون۔ وانمباڑی

منظوم خراجِ عقیدت

برموقعہ سالانہ تقریبِ فاتحہ خوانی شیخ المشائخ اعلیٰحضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری رحمۃ اللہ علیہ

بتاریخ 17؍ اگست 2002ء

علیم صبا نویدی

رب کعبہ کی عنایت ہر طرف
نورِ عرفاں، نورِ رحمت ہر طرف
ذرہ ذرہ گل فشاں و پُر بہار
سب کے سر پر رحمتِ حق تاج دار
منبعِ نورِ ہدیٰ حضرت مکاں
ہے کئی اقطاب کا دارالاماں
جن سے تھیں روحانی کرنیں سربلند
جن کا شیوہ، شیوۂ گوہر پسند
حضرت باقرؒ انھیں میں ایک تھے!
درمیانِ مردمانِ نیک تھے!
وہ سراپا علم و عرفاں کا چراغ
وہ اُبھرتی آرزو کا سبز باغ
وہ چمن اندر چمن کلیوں کا نور
اُن کے سر پر رحمتِ ربِّ غفور
وہ جمالِ گلشنِ صد آرزو
اُن کے دم سے تھی بساطِ رنگ و بو

پاسبانِ مکتبِ حضرت مکاں
نوجواں نسلوں کے خوں میں اک جہاں
وہ سراپا نکتہ رس، نکتہ شناس
وہ سراپا نیک نامی کی اساس
خوش کلامی، سادگی اُن کا شعار
تھا سلوک ان کا یقیناً یادگار
جن سے ذرّوں کو ملی روشن چمک
جن سے پھیلے کتنے مانندِ فلک
زخم ہائے دل دکھائیں بھی کیسے
نوحہ خواں نوحہ سنائیں بھی کیسے
حضرت باقرؒ سا اب کوئی کہاں
ڈھونڈ آئے ہیں نویدیؔ دو جہاں
اے شہنشاہِ اممؐ شاہِ ھدیٰ
ہر شریکِ بزم کی ہے یہ دعا
سایۂ رحمت ہو اُن پہ آپؐ کا
حضرت باقرؒ ہوں جنت میں سدا

إنّ اللہ لطیفٌ خبیرٌ

علمی، دینی، اصلاحی اور معلوماتی

ماہنامہ اللطیف ویلور



دارالعلوم لطیفیہ کا دیدہ زیب منظر

دارالعلوم لطیفیہ مکانِ حضرت قطب ویلور